ماہنامہ

زندگی

83-84

رامپور



سالانہ چندہ غیر ممالک سے بذریعہ ہوائی جہاز -/150 بذریعہ بحری جہاز -/60	ماہنامہ **زندگی** رامپور (مدیر سید احمد قادری)	سالانہ چندہ ہندوستان سے -/30 ششماہی ہندوستان سے -/15 قیمت فی پرچہ -/3

شمارہ - ۱	رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ مطابق جولائی ۱۹۸۳ء	جلد: ۷۱

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہو سکا۔

منیجر زندگی رامپور۔ یوپی

مالک۔ دعوت ٹرسٹ۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶

مقام اشاعت دفتر ماہنامہ زندگی رامپور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

جب کسی فرد یا قوم کے ذہن میں دوسرے کسی فرد یا قوم کے خلاف مختلف قسم کے زہر بھر جاتے ہیں تو وہ قوم دوسری قوم کے لئے کالا ناگ بن جاتی ہے۔ ہندوستان میں امت مسلمہ کو کچھ اسی طرح کی صورت حال کا سامنا ہے۔ میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ ہندوستان کی ایک ریاست میں بچوں کے لئے جو نصاب کی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بعض کتابوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی "ہجرت" کے لئے "فرار" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ اس کو بدلا جائے۔ حکومت نے لفظ "فرار" کو "نقل مکان" کے لفظ سے بدل دیا حالانکہ یہ لفظ بھی مناسب نہیں لیکن وشوہندو پریشد کے ایک لیڈر کو یہ تبدیلی بھی گوارا نہیں ہوئی اور اس نے کہا کہ حکومت مسلمانوں کی خوشامد کر رہی ہے۔ حکومت تاریخی حقیقت کو بدل نہیں سکتی گویا ان لیڈر صاحب کے نزدیک تاریخ نے مکہ سے مدینہ چلے جانے کو فرار ہی قرار دیا ہے۔ لیڈر صاحب کا یہ بیان پڑھ کر ذہن کو ایک جھٹکا لگا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس مسموم ذہن پر ترس بھی آیا۔ ممکن ہے کہ ان لیڈر صاحب نے مستشرقین کی کتابوں میں مسلمانوں کی تاریخ پڑھی ہو۔

مسموم ذہن کا تریاق غصے اور نفرت میں نہیں بلکہ حلم اور جذبہ اخوت میں ہے۔ اس کا تریاق قرآن ہے۔ جو ہدی للناس اور شفاء لما فی الصدور ہے۔ اس میں دلوں کے تمام امراض اور سینوں کے تمام اسقام کا علاج ہے۔ دلوں میں جب زنگ لگ جاتے ہیں تو آدمی تمام انسانی صفات سے عاری ہو کر حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے جس طرح پاگل قابل رحم اور مستحق علاج ہوتے ہیں اسی طرح وہ قوم جس کا ذہن مسموم ہو جاتا ہے قابل رحم اور مستحق علاج ہوتی ہے اس کا علاج داعیانہ جوش اور دل آویز کردار میں ہے۔ قرآن کا نسخہ شفا اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کے اجزا کی دل نشیں تشریح کی جائے اور خود اپنے پاک و صاف ذہن کا اپنے اخلاق و کردار کے آئینے میں مظاہرہ کیا جائے۔ باقی بر صفحہ ۵

عیادت

(سید احمد قادری)

عیادت کے مسئلے پر کوئی مفصل، جامع مقالہ مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ چند احادیث پیش کر کے تمام مسلمانوں کو بالعموم اور رفقائے جماعت اسلامی ہند کو بالخصوص اس نیک عمل کی طرف متوجہ کیا جائے۔ عیادت نہ صرف یہ کہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر حق ہے، بلکہ یہ باہمی الفت و اخوت اور معاشرے میں ہمدردی و مواسات کے بقاء و ارتقاء کا بھی ایک اہم ذریعہ ہے۔

عیادت کی شرعی اہمیت

عن ابی ہریرۃ رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خمس تجب للمسلم علی اخیہ رد السلام وتشمیت العاطس واجابۃ الدعوۃ وعیادۃ المریض واتباع الجنائز[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پانچ حقوق ایک مسلم کے اس کے بھائی مسلم پر واجب ہیں۔ سلام کا جواب دینا، چھینکنے والے کو دعا دینا، دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنا، مریض کی عیادت کرنا، جنازے کے پیچھے چلنا

مسلم شریف میں اسی مفہوم کی ایک روایت اور ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان کا حق مسلمان پر چھ ہے۔ دریافت کیا گیا۔ یا رسول اللہ! وہ حقوق کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا جب تم اس سے ملو تو اس کو سلام کرو، اور جب وہ تمہیں دعوت دے تو قبول کرو اور جب وہ تم سے نصیحت کا خواہاں ہو تو اس کو اس کی خیر خواہی کی بات بتاؤ۔ اور جب اس کو چھینک آئے اور الحمد للہ کہے تو تم

[1] مسلم ج ۲۔ کتاب السلام

یرحمک اللہ کہو اور جب بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرو اور جب وفات پا جائے تو اس کے جنازے کے پیچھے چلو۔[1]

یہ حدیث امام بخاریؒ نے بھی روایت کی ہے۔ اس متفق علیہ حدیث میں "تجب للمسلم" اور "حق المسلم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ احادیث نبوی میں یہ الفاظ مؤکد امور کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس حدیث میں چھ حقوق کا ذکر ہے۔ پہلی حدیث میں جواب سلام کا ذکر ہے، کوئی مسلمان جب سلام کرے تو اس کا جواب دینا واجب ہے

دوسری روایت میں یہ ہے کہ جب تم کسی مسلمان سے ملو تو سلام کرو یعنی السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہو۔ سلام کا جواب دینا تو واجب ہے اور خود سلام کرنا مسنون و مستحب ہے۔ چھ حقوق میں سے دوسرا حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان دعوت دے تو اس کو قبول کرو۔ دوسری احادیث میں دعوت ولیمہ کا ذکر ہے۔ دعوت ولیمہ قبول کرنا واجب ہے۔ تیسرا حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان نصیحت کا خواہاں ہو یعنی یہ چاہے کہ اس کو اس کی خیر خواہی کی باتیں بتائی جائیں تو جو کچھ علم ہو اس کے مطابق اس کو فلاح دارین کی کچھ باتیں بتانا واجب ہے۔ چوتھا حق یہ ہے کہ چھینکنے والا جب الحمدللہ کہے تو اس کو یرحمک اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) کہنا مندوب و مستحب ہے، اور اگر وہ الحمدللہ نہ کہے تو یرحمک اللہ کی دعا بھی نہ دی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب چھینک آئے تو الحمدللہ کہنا چاہئے نزلے اور زکام کی وجہ سے جو چھینکیں آتی ہیں اس کا یہ حکم نہیں ہے۔ پانچواں حق یہ ہے کہ جب کوئی مسلمان بیمار پڑے تو اس کی عیادت کی جائے۔ عیادت کے معنی مریض کی زیارت یعنی اس سے ملاقات کرنا ہے۔ عیادت میں مریض کی دیکھ بھال اور اس کی خدمت بھی داخل ہے۔ اگر پڑوس میں کوئی ایسا مریض ہے جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے تو ایسی حالت میں اس مریض کی عیادت اس شخص پر واجب ہے جو اس کی دیکھ بھال کر سکتا ہو اور چھٹا حق یہ ہے کہ کوئی مسلمان وفات پا جائے تو اس کے جنازے اور دفن میں شرکت کی جائے ان حقوق کے مفصل فقہی احکام کی تفصیل مقصود نہیں ہے بلکہ ان حقوق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک حدیث میں عیادت کا حکم بصیغۂ امر بھی موجود ہے:۔

عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اطعموا الجائع وعودوا المریض وفکوا العانی[2]

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھوکے کو کھلاؤ، مریض کی عیادت کرو اور قیدی کو رہائی دلاؤ"۔

---

[1] مسلم ج ۲، کتاب السلام۔ [2] مشکوٰۃ، کتاب الجنائز بحوالہ بخاری

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو سات چیزوں کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع فرمایا۔ جن سات چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان میں پہلی چیز مریض کی عیادت ہے[1]۔ حضرت براء کی حدیث امام بخاریؒ نے بھی روایت کی ہے۔

قیامت میں عیادت کی پرسش

عیادت ان حقوق میں ہے۔ قیامت میں جس کی باز پرس کی صراحت کی گئی ہے۔

عربی	ترجمہ
عن ابی هريرة رضؓ قال: قال	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ
رسول الله صلى الله عليه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت
وسلم ان الله عزّ وجلّ	کے دن اللہ عزوجل کسی بندے سے کہے گا۔
يقول يوم القيٰمة يا بن	اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تونے میری عیادت
اٰدم مرضت فلم تعدني	نہیں کی وہ کہے گا، میں آپ کی کیسے عیادت
قال يا ربّ كيف اعودك	کرتا آپ تو رب العٰلمین ہیں (یعنی آپ کو
وانت رب العالمين؟ قال	بیماری سے کیا واسطہ) اللہ تعالیٰ فرمائے گا
اما علمت ان عبدي فلانا	کیا تجھے علم نہیں ہوا کہ میرا فلاں بندہ بیمار
مرض فلم تعده اما علمت	ہوا تو تونے اس کی عیادت نہیں کی۔ کیا تجھے
انك لو عدته لوجدتني	معلوم نہ تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو
عنده[2]	تو مجھے اس کے پاتا

اس کے بعد بھوکے کو کھلانے اور پیاسے کو پلانے کے بارے میں باری تعالیٰ کے دو سوال اور مذکور ہیں۔ اس حدیث سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ عیادت بھی ان حقوق میں ہے جن کے بارے میں قیامت کے دن جواب دہی کرنی پڑے گی۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عیادت کرکے مریض کو خوش کرنا اللہ رب العٰلمین کو خوش کرنا ہے لوجدتني عنده (تو یقیناً تو مجھے اس کے پاس پاتا) حدیث نبوی کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ عیادت کی اس سے بڑی کوئی دوسری فضیلت نہیں ہوسکتی۔ اسی ٹکڑے کی وجہ سے شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ عیادت کا ثواب

---

[1] مسلم شریف ج ۲۔ کتاب اللباس والزینۃ

[2] الترغیب والترہیب بحوالہ مسلم

بھوکے کو کھانا کھلانے اور پیاسے کو پانی پلانے سے بھی زیادہ ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ نفلی عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ عیادت کی شرعی اہمیت ان احادیث سے بالکل واضح ہے۔

عیادت کا عموم بہ لحاظ مریض

عیادت کے لیے اشخاص کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے، درجہ میں چھوٹے یا بڑے مسلم یا غیر مسلم سب کی عیادت کی جانی چاہیے۔ آسانی کے ساتھ جس مریض کے پاس پہنچ کر اس کی مزاج پرسی کی جاسکتی ہو، کرنی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی عیادت کی ہے۔ ایسے تمام واقعات کو یہاں جمع کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف دو ایک واقعہ پیش کر دینا کافی ہے۔

(۱) عن جابرؓ قال کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یعودنی لیس براکب بغل ولا برذون[1]	حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت فرمایا کرتے تھے بایں حال کہ آپ خچر پر سوار ہوتے تھے اور نہ گھوڑے پر

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ حضورؐ نے متعدد بار حضرت جابر کی عیادت فرمائی تھی اور دوسری یہ کہ پیدل چل کر عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

عن سعد بن مالک قال عادنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وانا مریض[2]	حضرت سعد بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری عیادت کی بایں حال کہ میں بیمار تھا

حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی عیادت کا واقعہ ایک طویل حدیث میں منقول ہے۔ یہ اس کا ایک ٹکڑا ہے

عورتوں کی عیادت

عن ام العلاء قالت عادنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وانا مریضۃ فقال ابشری یا ام العلاء	ام علاءؓ نے کہا کہ میں مریض تھی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میری عیادت فرمائی اور فرمایا اے ام علاء تم کو بشارت ہو اس لیے کہ

[1] ابوداؤد، کتاب الجنائز

[2] ترمذی شریف، ابواب الجنائز

فان مرض المسلم یذھب اللہ خطایاہ کما تذھب النار خبث الذھب والفضۃ [1]

مسلمان کے مرض سے اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں کو اس طرح دور فرما دیتا ہے جس طرح آگ، سونا چاندی کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔

اس حدیث سے عورتوں کی عیادت کا ثبوت ملا اور یہ معلوم ہوا کہ مریض کو ایسی باتیں کہنی چاہییں جو اس کے لیے تسکین بخش ہوں۔

نوجوان کی عیادت

عن انس ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم دخل علی شاب وھو بالموت فقال کیف تجدک قال واللہ یا رسول اللہ انی ارجو اللہ و انی اخاف ذنوبی فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یجتمعان فی قلب عبد فی مثل ھذا الموطن الا اعطاہ اللہ ما یرجوا منہ مما یخاف [2]

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے پاس گئے اور وہ مرض الموت میں تھے۔ آپ نے فرمایا تم اپنے آپ کو کس حال میں پاتے ہو۔ اس نے کہا، خدا کی قسم یا رسول اللہ میں اللہ سے اس کی رحمت و مغفرت کی امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا یہ دونوں چیزیں اس طرح کے موقع پر کسی بندے کے دل میں جمع نہیں ہوتیں الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کی امید پوری کرتا اور جس چیز سے وہ خائف ہو جو اس سے اس کو محفوظ رکھتا ہے۔

نابالغ خادم کی عیادت جو یہودی تھا

عن انس قال کان غلام یہودی یخدم النبی صلے اللہ علیہ وسلم فمرض فاتاہ النبی صلے اللہ علیہ وسلم یعودہ فقعد عند راسہ

حضرت انسؓ نے کہا ایک یہودی لڑکا نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا۔ وہ بیمار ہو گیا نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ اس کے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجنائز۔　[2] ترمذی، ابواب الجنائز

فقال له اسلم فنظر الى ابيه وهو عنده فقال اطع ابا القاسمؐ فاسلم فخرج النبی صلے اللہ علیہ وسلم وھو یقول: "الحمد للہ الذی انقذہ من النار"[1]

سمجھ کے پاس بیٹھے اور اس سے فرمایا اسلام قبول کرلو۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ابوالقاسمؐ کی اطاعت کرو۔ پس وہ مسلمان ہوگیا آپؐ وہاں سے یہ کہتے ہوئے باہر آئے۔ اس اللہ کا شکر جس نے اس کو دوزخ سے نجات دی

نابالغ لڑکے اور غیر مسلم کی عیادت کا ثبوت اس حدیث میں ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ کا اسلام قبول کرنا صحیح ہے۔ احادیث میں ہے کہ حضورؐ ایک بوڑھے اعرابی کے پاس بھی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تھے۔

عیادت کا عموم بلحاظ مرض

عیادت کے لیے کسی سخت مرض کی خصوصیت بھی نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جب کوئی شخص صاحب فراش ہوجائے تب اس کی عیادت کی جائے بلکہ معمولی مرض میں بھی عیادت کرنی چاہیے۔

عن زید بن ارقمؓ قال عادنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من وجع کان بعینی[2]

حضرت زید بن ارقمؓ نے کہا کہ میری آنکھ کی ایک تکلیف میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے میری عیادت فرمائی۔

عیادت کی فضیلت

جیسا کہ اوپر گذرا عیادت کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ رب العلمین اس سے خوش ہوتا ہے یہ اللہ کے نزدیک ایسا اچھا اور قابل قدر عمل ہے کہ اس کے لیے وضو کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

عن انسؓ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من توضا فاحسن الوضوء وعاد اخاہ المسلم محتسبا بوعد من جہنم

حضرت انسؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اچھی طرح وضو کیا اور اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کی حصول ثواب کی نیت سے تو وہ جہنم سے ستر سال کی مسافت (باقی ص ۹)

---

[1] مشکوۃ کتاب الجنائز بحوالہ بخاری

[2] ابوداؤد باب فی العیادۃ من الرمد

تدبرِ قرآن پر ایک نظر

(۳)

(مولانا جلیل احسن ندوی)

مولانا اصلاحی نے واذ قتلتم ـــــ تعقلون ٥ (بقرہ آیت ۷۲، ۷۳) کا ترجمہ یہ کیا ہے:۔

"اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا۔ پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے۔ حالانکہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے رہے ہو۔ تو ہم نے کہا اس کو اس کے ایک جز سے مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

(تدبر اول صـ۱۹۶)

اور تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"قرآن مجید کے اشارات سے واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی شخص قتل ہو گیا تھا جس کے قاتلوں کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ (تدبر اول صـ۲۰۲)

سراغ کیوں نہیں ملتا تھا اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ سب لوگ قاتل یا قاتلوں کی پردہ پوشی کر رہے تھے تاکہ خدا کا قانون قصاص نافذ نہ ہو سکے۔ صاحب تدبر نے عام مفسرین کی طرح بعضھا کی ضمیر گائے کی طرف لوٹائی ہے اور اس کی تفسیر میں وہ فرماتے ہیں:۔

"اس کو اس کے بعض سے مارو" عام طور پر اہل تاویل نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ مقتول

کو گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا چھواؤ جس سے وہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتادے گا۔ اگرچہ یہ مطلب لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی مقتول پر قربان کی ہوئی گائے کا خون چھڑک کر اور آس پاس والوں سے قسم لی گئی۔ (تدبر اول ص۲۰۵)

اس پر عرض کرنا ہے کہ جس تاویل کی طرف ان کا ذہن بار بار جا رہا ہے وہ قرآن کے الفاظ سے بالکل میل نہیں کھاتی۔ آیت کا ہر جملہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ مولانا نے تورات کی ایک محرف عبارت قسامہ سے متعلق ص۲۰۲ پر درج کی ہے اسے جو شخص بھی پڑھے گا اور پھر قرآنی الفاظ سے مقابلہ کرے گا تو دونوں میں بیّن فرق محسوس کرے گا۔ پھر دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ وَاِذْ سے کلام نحوی لحاظ سے بالکل منفصل اور علیحدہ ہو جاتا ہے اس لیے وَاِذْ قَتَلْتُمْ کے بعد آنے والی کوئی ضمیر وَاِذْ سے پہلے کے کسی اسم کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔ یہ بات متقدمین اہل تفسیر میں سے کسی کو نہیں کھٹکی صرف مولانا فراہی رحمۃ اللہ نے یہ سوال اٹھایا ہے اور یہ سوال ہے خاصا اہم۔ میں نے بلتشیر جا بجا وادی میں تلاش کیا کہ مولانا فراہی کے خلاف کوئی ایک نظیر مل جائے مگر مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے مولانا اصلاحی اور متقدمین علما تفسیر کی یہ بات کہ ھا کی ضمیر کا مرجع بقرہ (گائے) ہے سمجھ میں نہیں آئی۔ مولانا اصلاحی کی خدمت میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ کن وجوہ سے اپنے شیخ کی رائے انھوں نے قبول نہیں کی۔ یہاں پر ایک تاویل عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ اضربوہ کی ضمیر مفعولی کا مرجع مشتبہ قاتل کو قرار دیا جائے جو قتلتم میں موجود ہی ہے اور ببعضھا میں ھا کا مرجع نفساً کو بنایا جائے اور کذالک سے کما احیینا ھذہ النفس المقتولۃ محذوف مانا جائے مطلب یہ کہ جب قاتل کا سراغ نہیں لگ رہا ہے تمام لوگ قاتل کو چھپا رہے تھے تو خدا نے نبی وقت کے ذریعے حکم دیا کہ جس شخص پر شبہہ قتل ہے اس کو مقتول شخص کی لاش سے کسی حصہ سے چھواؤ، ٹچ کراؤ (ضرب کے اصل معنے چپکانے کے ہیں۔ جب ایسا کیا گیا تو مقتول نے زندہ ہو کر بتایا کہ یہی میرا قاتل ہے اور اس طرح خدا کی اسکیم پوری ہوئی اور اسرائیلیوں کی چھپانے کی پالیسی ناکام ہو گئی اور قاتل سے تورات کے قانون کے مطابق قصاص لیا گیا۔ کذالک والے جملے کا مطلب یہ ہے کہ

جس طرح مقتول شخص کو اللہ نے زندہ کیا اور حقیقت حال کو واضح کیا اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرے گا اور اپنی قدرت کی نشانیاں تم کو دکھائے گا۔ یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو، سوچو اور خدا کی شریعت پر راستبازی کے ساتھ عمل کرو تاکہ تم خدا کے غضب کا نشانہ نہ بنو۔ ہماری یہ تاویل متقدمین کی تفسیر سے قریب ہے اور اس میں وہ سوال نہیں اٹھتا جو استاذ امام فراہی نے اٹھایا ہے۔ مولانا اصلاحی نے ان دونوں آیتوں اور اس کے جملوں کی جو تشریح فرمائی ہے اسے جو لوگ دیکھنا چاہیں وہ تدبر اول کے صفحات ۲۰۴ تا ۲۰۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔ بلکہ گائے کے ذبح سے متعلق آیتوں کی تفسیر بھی صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۴ بھی دیکھیں

مولانا اصلاحی صاحب بقرہ آیت ۷۶، (واذا لقوا ـــــ افلا تعقلون) کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں :۔

> اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں کیا تم سمجھتے نہیں (تدبر اول صـ۱۹۷)

اور اس کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں :۔

> اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں یعنی دین وایمان کے اجارہ دار تنہا مسلمان ہی نہیں ہیں۔ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اس قول سے ان کا مطلب۔ جیسا کہ آیات ۸، ۹ کی تفسیر کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں۔ محض مسلمانوں کو دھوکا دینا ہوتا تھا وہ اس قول کے ظاہر الفاظ سے مسلمانوں کو فریب دیتے تھے تاکہ مسلمان ان کے اوپر اعتماد کرنے لگیں خود اپنے ذہن میں وہ اس کا مطلب یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے نبیوں اور اپنے صحیفوں پر تو ایمان رکھتے ہی ہیں۔ ایمان اور کس چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان لوگوں کے اس قسم کے پُر فریب جملوں کے دام میں آکر ان سے کچھ اچھی امیدیں نہ لگا بیٹھیں۔ اس لیے کہ ان کی خلوت اور جلوت کی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ سامنے تو یہ امنّا کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب یہ اپنی خاص مجلسوں

بیں ہوتے ہیں تو وہاں آپس میں ایک دوسرے کا بڑی شدت سے محاسبہ کرتے ہیں۔ اگر اظہار رواداری کے جوش میں تمہارے سامنے ان میں کسی کی زبان سے غلطی سے کوئی ایسی بات نکل جاتی ہے جو اسلام کے حق میں ہوتی ہے تو یہ اپنی مجلسوں میں اس پر سختی سے گرفت کرتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کے سامنے نبی آخر الزماں اور اسلام سے متعلق وہ باتیں کھولتے ہو جو خدا نے اپنے صحیفوں کے ذریعے صرف تم پر کھولی ہیں اور اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ تمہارے انہی بیانات کو مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت اور حجت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔　　(تدبر اول ص ۲۰۸ و ۲۰۹)

اتنے طویل اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک یہود کا وہ گروہ مراد ہے جو ہے تو نیں یا ہر کا اور حسد اور خبث نفس اور اسلام دشمنی میں دوسرے یہودیوں سے کسی طرح کم نہیں ہے لیکن مسلمانو سے رواداری برتتا ہے اور بظاہر بہت مسلمانوں کو اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے دعوکہ باز حاسد خبیث النفس اور اسلام دشمن لوگ مسلمانوں کو نبی آخر الزماں اور اسلام سے متعلق ایسی باتیں کیوں بتانے لگے جن میں وہ خود پھنس جاتے؟ پھر مولانا کے آخری جملوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے اللہ والے، خشیت خداوندی سے ان کے دل معمور اور روز جزا کے محاسبے سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔ انہیں اس بات کی بڑی فکر ہے کہ روز جزا میں ان کے خلاف کوئی حجت اور شہادت پیش نہ ہو۔ کیا یہود مولانا کے نزدیک ایسے ہی اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔

ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہاں یہود کے اس گروہ کا حال بیان ہوا ہے جو ازراہ شرارت اور بہ طور سازش یہودی لیڈروں کے بھیجے گئے ہیں اور کلمہ پڑھ کر اسلامی جماعت میں شامل ہوئے ہیں بالفاظ دیگر اس کے یہودی منافقین مراد ہیں۔ عام مدنی منافقین جو اوس و خزرج سے آئے تھے زیر بحث نہیں ہیں۔ یہ لوگ دو عملی کیا کرتے تھے۔ یہ مسلمانوں کو اپنے پکے مومن ہونے کا یقین دلانے پر مجبور رہتے، اور اپنے خلوص ایمان کی شہادت کے طور پر نبی آخر الزماں اور قرآن سے متعلق توراتی صحیفوں کی پیشین گوئیوں کو مسلمانوں سے بیان کرتے اور مسلمان ان پیشین گوئیوں کا حوالہ دے کر یہودی علماء کو زچ کرتے، تو یہ اپنے ان بھیجے گئے یہودی منافقین سے کہتے یہ کیا غضب کرتے ہو، کس کام کے لیے ہم نے تمہیں بھیجا ہے اور تم کیا کر رہے ہو۔ تم اپنے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کو جو صرف تمہیں معلوم ہیں مسلمانوں کو

بتلاتے ہو اور ان کا حوالہ دے کر ہم سے نبی اور قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہودی علماء یہاں آخرت کے محاسبے سے ڈرنے اور ڈرانے کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس دنیا میں جس پریشان کن صورت حال سے دوچار ہیں اس کا ذکر کر رہے ہیں۔ حضرت تھانویؒ نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

"وہ (دوسرے یہودی) ان سے کہتے ہیں کہ تم یہ کیا غضب کرتے ہو مسلمانوں کو خود تبلاتے ہیں وہ باتیں بتلاتے ہیں جو اُن کے مفید مذہب اللہ تعالیٰ نے تو ریت میں تم پر منکشف کر دی ہیں مگر ہم بمصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ دیکھو یہ مضمون اللہ کے پاس سے تمہاری کتاب میں آیا ہے۔ کیا تم اتنی موٹی بات نہیں سمجھتے۔ (بیان القرآن حصہ اول صفحہ ۲۸ مطبوعہ شرکت المطبع تھانہ بھون)

ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے اور صاحب تدبر نے بقرہ کے دوسرے رکوع کی جو تفسیر کی ہے اور اس پر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کو دوبارہ پڑھ لیجیے تو مناسب ہوگا۔

صاحب تدبر نے یہود کے ایک فاسد عقیدے کا ذکر کیا ہے جو بقرہ آیت ۸۰ میں بیان ہوا ہے پہلے اس کا ترجمہ انہی کے الفاظ میں پڑھیے:

اور وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی یہ ان جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال بیان ہوئی ہے جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ یہود اپنے لیے کسی صورت میں ابدی عذاب دوزخ کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جنت دوزخ کو اعمال کا نتیجہ اور اعمال پر مبنی سمجھنے کے بجائے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ خدا کی برگزیدہ امت ہیں۔ اس وجہ سے خواہ ان کے اعمال کچھ ہوں اول تو وہ دوزخ میں بھیجے ہی نہیں جائیں گے اور بھیجے گئے بھی تو معمولی طور پر کچھ سزا بھگت کر جنت کو واپس کر دیے جائیں گے۔

(تدبر اول صفحہ ۲۱۱)

اس ترجمہ و تفسیر پر گذارش یہ ہے کہ یہود کا عقیدہ سورۂ مائدہ آیت ۱۸ میں بدیں الفاظ نقل ہوا ہے۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ (اور یہود و نصاریٰ

کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں) بتلائیے کوئی شخص اپنے بیٹوں کو چند سکنڈ کے لیے بھی دوزخ میں ڈالنا پسند کرے گا؟ کیا کوئی شخص اپنے محبین اور محبوبوں کو چند لمحوں کے لیے بھی آگ میں ڈالنا گوارا کرے گا؟ اور کیا سورۂ بقرہ آیت ۹۴ میں ان کا یہ عقیدہ نہیں بیان ہوا ہے کہ آخرت کا گھر اللہ کے نزدیک دوسروں کے مقابل میں ہمارے ہی لیے مخصوص ہے؟ اور کیا بقرہ آیت ۱۱۱ میں خدا نے ان کا یہ عقیدہ نہیں نقل کیا ہے کہ جنت میں نہیں جائیں گے مگر یہودی یا نصرانی؟ اور کیا سورۂ اعراف آیت ۱۶۹ میں سیُغفرُ لنا نہیں آیا ہے یعنی یقیناً ہماری بخشش ہو جائے گی۔ ہم دوزخ سے بچا لیے جائیں گے۔ یہ بات بلا قید و شرط پوری عمومیت کے ساتھ بیان ہو رہی ہے اور آج کسی بھی یہودی کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دوزخ میں جائے گا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی ؒ جو یہود کی تاریخ کے سب سے بڑے عالم گذرے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے مشہور قول نقل کیا ہے۔ یادری راڈویل نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیے میں اکابر یہود کے حوالے سے لکھا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

> بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتش دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے۔ "آتش دوزخ گنہگاران قوم یہود کو چھونے کی بھی نہیں اس لیے کہ وہ جہنم پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے (جلد ۵ ص ۵۸۳) اور یہود کے بڑے مقدس نوشتہ تالمود۔ . . . . میں یوں آیا ہے: قیامت کے دن ابراہیم در دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے۔ ... جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی۔ (ص ۲۰۵)

حاصل کلام یہ کہ آج بھی یہود کا یہی عقیدہ ہے جو تالمود میں بیان ہوا ہے اور قرآن کے بیان سے پوری مطابقت رکھتا ہے جن کے حوالے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں اور اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِلّا متصلہ ہے یا منقطعہ۔ ہمارے نزدیک یہ اِلّا منقطعہ ہے جس کا ترجمہ "البتہ" اور "لیکن" سے کیا جاتا ہے۔ ایسے اِلّا کے بعد آنے والا اسم لفظاً منصوب ہوتا ہے اور محلاً مرفوع ہوتا ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے اور خبر کبھی لفظاً یہاں مذکور ہوتی ہے اور عام طور پر محذوف ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ تین میں مذکور ہے اور

سورۂ عصر میں حذف ہے۔ یہاں بھی حذف ہے عبارت عربی میں یوں بنا لیجئے۔ ولکن ایا ما معدودۃ نعذب فی الدنیا بالمصائب والآلام مکفرۃ عنّا۔ مطلب یہ کہ البتہ گناہوں کی پاداش میں یہیں دنیا ہی میں مصائب و آلام میں مبتلا ہوں گے۔ یہ مصائب و آلام ہمارے گناہوں کے لیے کفارہ بنیں گے اور پھر دُھل دھلا کر سیدھے جنت میں جا بسیں گے۔ آج یہود کا یہی عقیدہ ہے جو تالمود پر مبنی ہے۔ آج کے یہود تورات سے زیادہ تالمود کو مانتے ہیں۔

یہاں قرآن کے طلبہ کو یہ بات بتانی مناسب ہے کہ قرآن میں اِلّا منقطعہ ہی عام طور پر آیا ہے شاید ایک آدھ جگہ متصلہ کے لیے بحث کی گنجائش ہو۔

مولانا اصلاحی صاحب بقرہ آیت ۸۸ (وقالوا ــــ فقلیلاً ما یؤمنون ٥ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:۔

> اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل تو بند ہیں، بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے اُن پر لعنت کردی ہے تو، شاذ و نادر ہی وہ ایمان لائیں گے۔ (تدبر ص۲۱۵)

سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے ان پر لعنت کردی ہے جس کا پہلا نتیجہ ہدایت سے محرومی ہے تو شاذ و نادر وہ کیسے ایمان لائیں گے۔ مولانا ہر جگہ اسی رنگ کا ترجمہ قلیلاً مّا کا کرتے ہیں۔ یہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ قلیل بمعنے نفی ہے اور ما نفی میں تاکید کے لیے آیا ہے اور یہ مفعول مطلق ہے یعنی یؤمنون ایمانًا قلیلاً مّا یعنی یہ بالکل ایمان نہیں لائیں گے (اطمینان کے لیے کشاف اور راغب دیکھیے) دوسرا ترجمہ یہ ہے پس وہ بہت تھوڑا ایمان لائیں گے اور "تھوڑا" ایمان معتبر نہیں۔ دونوں صورتوں میں قلیلاً مفعول مطلق محذوف کی صفت بنتا ہے۔

ایڈیٹر کا پتہ

مضامین سے متعلق خطوط اور مضامین نیز اخبارات و رسائل ذیل کے پتہ پر بھیجیے۔

ایڈیٹر "زندگی" رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو پی)

اسلام کے تصوّرِ مساوات کی بنیادیں
اور اس کے امتیازات

(۳)

(جناب سلطان احمد اصلاحی)

انسانی زندگی میں تقسیمِ طبقات کی حکمت

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خالقِ کائنات نے انسان کی تخلیق اور اس سے متعلق جملہ امور میں اس سے مثالی وحدت و اشتراک کا معاملہ کیا ہے تو پھر انسانی زندگی میں ہمیں یہ منظر دیکھنے کو کیوں ملتا ہے کہ یہاں بے شمار قوموں اور نسلوں اور مختلف قبیلوں اور برادریوں کا جال بچھا ہوا ہے اور صورت یہ ہے کہ ہر قوم اپنا الگ سلسلہ نسب اور ہر نسل اپنا جدا امتیاز رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ ہر نسل کا رنگ الگ ہے۔ ہر قوم کی زبان مختلف ہے۔ ہر ایک کی غذا مختلف ہے۔ کھانے پینے کا انداز مختلف ہے۔ ہر قوم کا لباس الگ ہے اور رہن سہن کا معیار مختلف ہے اور آگے بھی بات مختلف قبیلوں اور برادریوں تک وسیع ہے۔ جبکہ انسانی تخلیق کے اس وحدت و اشتراک کو کامیاب بنانے اور اسے خوبی سے موثر بنانے کے لیے زیادہ مناسب بات یہ ہوتی کہ پوری انسانی آبادی ایک خاندان ہوتی۔ مختلف قوموں اور نسلوں کا جھگڑا ہوتا نہ قبیلے اور ذات برادری کی کوئی لڑائی ہوتی بلکہ انسانیت ہی سب کا ہوتا۔ ہر ایک کا رنگ، زبان، غذا، لباس اور طرزِ بود و باش سب یکساں ہوتا۔ جبکہ حال یہ ہے کہ روئے زمین کا ایک ایک چپہ ہمارے انسانی طبقات سے بھرا ہوا ہے اور ہر جگہ اور ہر سطح پر ہمیں ان گنت قوموں اور قبیلوں، برادریوں اور خاندانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مذکورہ بالا آیتِ کریمہ اس سوال کا بہت مختصر اور جامع جواب عطا کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی نسل کو مختلف قوم

اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی پہچان کرسکے۔ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم سے افضل یا کوئی نسل دوسری نسل سے فائق تر ہے جس کے نتیجہ میں کوئی قوم اپنے آباء و اجداد کا حوالہ دے کر دوسروں پر فخر جتلائے یا اپنے خاندانی تفوق کی بنا پر دوسروں کو اپنے سے حقیر سمجھے۔ علامہ زمخشری اس کی تفسیر یوں بیان کرتے ہیں:۔

والمعنی ان الحکمۃ التی من اجلھا رتبکم علی شعوب وقبائل ھی ان یعرف بعضکم نسب بعض فلا یعتزی الی غیر اباءہ لا ان تتفاخروا بالاباء والاجداد وتدعوا التفاوت والتفاضل فی الانساب[1]	مطلب یہ کہ اللہ نے جس حکمت کے تئیں تم کو کنبوں اور قبیلوں میں بانٹا ہے وہ یہ کہ تم میں کا بعض بعض کے خاندان کی پہچان کرسکے اور اپنے باپ دادوں کے علاوہ دوسروں کی طرف اپنا انتساب نہ کرے۔ یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے آباء و اجداد کے حوالے سے آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتاؤ اور خاندان اور نسب کی بنیاد پر ایک دوسرے پر فرق و امتیاز کا دعوے کرو اور ایک دوسرے سے اپنے کو اونچا بتاؤ

عام طور پر لوگ اس تعارف اور پہچان کے مقصد کا تذکرہ سرسری طور پر کرکے گذر جاتے ہیں اور اس میں جو گہری حکمتیں پوشیدہ ہیں عام طور پر وہ نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ ہم تعارف کے اس مقصد پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے اور سماجی زندگی کے ان مختلف گوشوں کی نشان دہی کریں گے جن سے بہ آسانی عہدہ برآ ہونے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ قوموں قبیلوں اور خاندان کے اختلاف کی صورت پیدا ہو تاکہ انسان ایک دوسرے کی پہچان کرسکے۔ اس سلسلے میں سماجی زندگی کے کچھ دائرے تو وہ ہیں جن کا تعلق پوری نوع انسانیت سے ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق خاص طور پر مسلمان امت سے ہے جس نے اپنی گردن میں خدا کی بندگی کا قلادہ ڈال کر اپنے کو ایک خاص طرز زندگی کا پابند بنالیا ہوتا ہے۔ پہلے ہم

[1] الکشاف، جلد ۲۔ سورہ الحجرات۔ تفسیر آیت مذکور

ان دائروں کا تذکرہ کریں گے جن کا تعلق پوری نوع انسانیت سے ہے۔

سماجی ربط ضبط کے پہلو سے

بظاہر یہ بات بڑی خوش آئند معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کے تمام انسان ایک نسل اور ایک خاندان سے تعلق رکھتے اور سب کے سب ایک قوم اور ایک برادری کے افراد ہوتے یہی نہیں بلکہ سب کا رنگ یکساں ہوتا۔ زبان ایک سی ہوتی سب کی شکل و صورت ایک سی ہوتی اور گفتگو کا انداز یکساں ہوتا۔ سب کا رہن سہن ایک سا ہوتا اور سب کے عادات و اطوار ایک سے ہوتے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر طرف:-

تاکس نہ گوید بعد از یں من دیگرم تو دیگری

کا منظر ہوتا۔ بظاہر یہ بات بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ چیز انسانوں کے لیے باعث رحمت نہیں بلکہ باعث زحمت ہوتی۔ اس لیے کہ اس کا مطلب ہوتا کہ سماج کے اندر دو آدمیوں کے مابین تعلقات کے استوار کرنے کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی۔ انسان ایک شخص سے ربط قائم کرنا چاہتا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ وہ اس "ایک شخص" کی شناخت کیونکر کرسکے جب کہ وہ جس طرف نگاہ اٹھاکر دیکھتا ہے تو سب کا رنگ ایک سا ہے سب کی شکل و صورت ایک سی ہے۔ سب کا انداز گفتگو ایک سا ہے اور سب کی چال ڈھال ایک سی ہے، سب سے بڑی بات یہ کہ سب کا خاندان ایک ہے اور سب ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور سب ایک ہی قوم اور ایک ہی برادری کے افراد ہیں۔ یقیناً یہ ایک ایسی صورت ہوتی کہ اگر انسان چراغ لیکر بھی تلاش کرتا تو اسے اپنے مطلوبہ شخص کا پتہ لگانا ممکن نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اس وقت تو صورت یہ ہوتی کہ وہ جس طرف بھی نگاہ اٹھاکر دیکھتا وہاں کا منظر یہ ہوتا۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

نتیجہ ہوتا کہ ہر آدمی اپنی جگہ سکڑ کے رہ جاتا اور پورے سماج میں ہر طرف "کسے را با کسے کارے نباشد" کی فضا چھائی رہتی۔

تمدن کی ترقی کے پہلو سے

اسی بات کو آپ پھیلا دیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسانی زندگی میں رنگ و نسل اور قوموں اور قبیلوں کے اختلاف سے حاصل ہونے والا باہمی تعارف اور پہچان تمدن کی ترقی کا سب سے پہلا زینہ ہے

یہی وہ سب سے قوی ترین عامل ہے جس کے ذریعے تہذیب کی گاڑی آگے بڑھتی اور ترقی کے مراحل طے کرتی ہے۔ انسانی تمدن کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ لوگوں کا آپس میں اجتماع ہو اور لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کسی مقام پر بود و باش اختیار کریں۔ انسانوں کے اسی اجتماع کی بدولت محلے اور بستیاں وجود میں آتی ہیں۔ جو بعد میں ترقی کر کے بڑے بڑے شہروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر یہی وہ جگہیں ہوتی ہیں جہاں تہذیب کا بیج برگ و بار لاتا ہے اور آہستہ آہستہ ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا۔ انسانوں کے اس اجتماع کو جو چیز استقلال عطا کرتی ہے اور انہیں آگے بڑھتے رہنے کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے وہ قوم قبیلے اور رنگ و نسل کے اختلاف سے حاصل ہونے والے تعارف اور پہچان کی ہی قوت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ انسانوں کے اس اجتماع کا مطلب ہوگا کہ لوگوں کا آپس میں لین دین ہو اور کاروبار کی صورتیں عمل میں آئیں۔ کچھ انسان دوسرے انسانوں کی خدمات حاصل کریں اور ان کے درمیان خدمت اور معاوضے کے رشتے استوار ہوں۔ کارخانے اور صنعت گاہیں قائم ہوں اور ان کے درمیان خدمت اور معاوضے کے رشتے استوار ہوں۔ تعلیمی ادارے وجود میں آئیں اور ان میں استاذ و طالب علم کے تشخصات قائم ہوں۔ حکومت کے مختلف شعبے قائم ہوں اور حکومت اور عوام کے تعلقات کی ایک متعین صورت وجود میں آئے۔ آپ خود بخود اندازہ کر سکتے ہیں کہ تمدن کے یہ مختلف گوشے اسی صورت میں باقی رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں جبکہ سماج کے ہر فرد کا الگ تشخص قائم ہو اور ہر آدمی سے اس کی مستقل بالذات حیثیت میں معاملہ کیا جا سکے۔ ورنہ ذرا آپ ایک ایسے بازار کا تصور کیجیے جس میں ہر طرف ایک ہی قسم کے افراد کا مجمع نظر آتا ہو، سب کی شکل و صورت ایک سی ہو، سب کا رنگ ایک سا ہو، گفتگو کا انداز یکساں ہو اور سب کی چال ڈھال ایک سی ہو۔ اور پھر خاص بات یہ کہ سب کا تعلق ایک ہی قوم اور ایک ہی خاندان اور قبیلے سے ہو۔ اب فرض کیجیے کہ ایک شخص کسی دوکان دار سے کوئی سامان ادھار خریدنا چاہتا ہے یا ایک آدمی کسی سرمایہ دار سے کوئی بڑا طویل المیعاد قرض لینا چاہتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی دوکان دار یا کوئی سرمایہ دار کس اطمینان پر اس شخص کو وہ سامان یا وہ سرمایہ فراہم کر سکے گا۔ یہ معاملہ تو اسی وقت ممکن ہوتا جبکہ اس دوکان دار کو اس ادھار لینے والے شخص کا علیحدہ تشخص حاصل ہوتا یا وہ شخص جو بڑا قرض چاہ رہا ہے، سرمایہ دینے والے کو اس کی الگ سے پہچان ممکن ہوتی جبکہ یہاں صورت یہ ہے کہ لینے اور دینے کا کوئی تصور ہی

ہی ممکن نہیں ہے۔ یہاں تو انسان کے لیے یہی فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اس سے سامان لے رہا ہے یا سرمایہ طلب کر رہا ہے وہ اس کا اپنا پڑوسی ہے یا ہزار میل دور سے سفر کر کے آیا ہے۔

پھر اسی قاعدہ کلیہ کو تمدن کے دوسرے اداروں پر منطبق کیجیے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ رنگ، نسل اور قوموں اور قبیلوں کے اختلاف سے حاصل ہونے والا یہ تعارف اللہ کی کتنی بڑی نعمت اور اس کی کتنی عظیم رحمت ہے۔ مثال کے طور پر کسی تعلیمی ادارے کو لے لیجیے جس کے اندر ہزاروں طلبہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں سیکڑوں کی تعداد میں اساتذہ ہیں اور اتنے ہی افراد ہیں جن کا تعلق غیر تدریسی عملے سے ہے اب اگر اس ادارے میں ہر شخص کا مستقل بالذات تشخص قائم نہ ہو تو یہ پتہ چلانا ہی مشکل ہے کہ کون طالب علم کلاس میں حاضر کون غیر حاضر ہے۔ کون پاس ہوا، کون فیل۔ استاد کون لوگ ہیں اور کس کا تعلق غیر تدریسی عملے سے ہے۔ اس لیے کہ اس ادارے کے ہر شخص کا خاندان ایک ہے۔ ہر شخص کی صورت ایک سی ہے، ہر شخص کا رنگ ایک سا ہے۔ سب کا قد یکساں۔ سب کی چال ڈھال ایک سی ہے اور گفتگو کا انداز یکساں ہے۔ کوئی تمیز نہیں کہ یہ یک رنگی اس ادارے کے لیے بلائے جان ہوگی۔ بلکہ صحیح بات تو یہ کہ اگر ادارہ کو صبح کھلوا جائے گا تو شام ہوتے ہوتے اسے بند کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اسی پر آپ کارخانے دفتر اور حکومت کے مختلف شعبوں کو قیاس کر سکتے ہیں

مظالم کے دفعیہ کے پہلو سے

آج جو لوگ ذات پات، رنگ و نسل اور زبان و علاقائیات وغیرہ کے اختلاف کو ہوا دے کر انسان اور انسان کے درمیان نفرت و عداوت کا بیج بوتے اور مختلف انسانی طبقات کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر فساد فی الارض کا موجب بنے ہوئے ہیں اور جو اس طرح زبان حال سے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ "انسانی زندگی میں اصل فساد کی جڑ یہی ذات اور رنگوں نسلوں کا اختلاف ہے" انہیں خالق کائنات سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ ظاہری طور پر انسانوں کے اشکال والوان میں یک رنگی پیدا کرنے کے ساتھ ان کی نفسی کیفیات اور ان کے باطنی خیالات کو یکسر تبدیل کر دے۔ جس کے نتیجے میں ان کے اندر فرشتوں کی خصوصیات پیدا ہو جائیں اور شر اور ارتکاب جرم کا مادہ ہی سرے سے فوت ہو جائے۔ ورنہ اگر انسانوں کی ظاہری اشکال ایک سی ہو جائیں اور ان کے اندر خارجی طور پر "من و تو" کا کوئی اختلاف باقی نہ رہے تو بھی یہ صورت مسئلے کا مکمل حل فراہم نہیں کرتی ہے۔ اس لیے کہ انسان کی جو طبیعت ہے اور اس کے جو

ناقابل تبدیل طبعی میلانات ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کے اندر خیر و شر دونوں کا مادہ ودیعت ہے وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بھلائی بھی کرتا ہے اور برائی کا بھی ارتکاب کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ بسا اوقات اپنے ہی مادہ شر کے غلبہ سے بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا اور دوسرے انسانوں کو اپنے جور و ستم اور ظلم و تعدی کا نشانہ بنا لیتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج تک روئے زمین پر کسی ایسے انسانی سماج کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا جو جرائم سے یکسر پاک ہو اور جہاں کسی انسان نے دوسرے انسان کو ظلم و زیادتی کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ بلکہ جب بھی کسی مقام پر انسانوں کا اجتماع ہوا ہے اور لوگوں نے کسی جگہ مل کر بود و باش اختیار کی ہے، یہ دونوں ہی باتیں پائی گئی ہیں کہ انسان نے جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور دوسروں کو اپنی طرف سے ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعی صورت حال کا مداوا کیونکر ممکن ہے۔ فطرت کی تبدیلی انسان کے بس میں نہیں۔ اور یہ بات زبان پر بھی نہیں لائی جا سکتی کہ جرائم کا ارتکاب یونہی ہوتا رہا ہے اور لوگ بلا روک ٹوک دوسروں پر ظلم و ستم ڈھاتے رہیں۔ بس اس صورت کا علاج اس کے سوا دوسرا نہیں کہ جرائم کے ارتکاب پر لوگوں کو سزا دی جائے اور ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اسے کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ ظاہر بات ہے یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جبکہ سماج کے اندر ہر شخص کا انفرادی تشخص قائم ہو اور ہر ہر فرد کی الگ سے پہچان ممکن ہو سکے۔ یہ انفرادی تشخص اور افراد کا علیحدہ تعارف اور الگ الگ پہچان قوموں قبیلوں اور رنگ و نسل کے اختلافات سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ورنہ اگر خدانخواستہ انسانی آبادی کا یہ نقشہ بن جائے کہ تمام انسانوں کی شکل و صورت ایک سی ہے، سب کا رنگ ایک ہے اور سب کی بولی ایک سی ہے۔ سب کا خاندان ایک ہے اور سب کے سب ایک نسل اور ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں تو اس صورت میں کسی مجرم اور کسی ظالم کا پتہ کیونکر لگایا جا سکتا ہے۔ آدمی اپنے قریب ترین ماحول میں کسی مجرم اور کسی ظالم کا پتہ نہیں لگا سکے گا چہ جائیکہ وہ کسی دور دراز کے آدمی کا پتہ لگا سکے۔ نتیجہ ہوگا کہ ہر طرف جرائم پیشہ لوگ اور سماج دشمن عناصر دندناتے پھریں گے لیکن حال یہ ہوگا کہ ہر شخص دوسرے کا منہ تک رہا ہوگا کہ آخر وہ کسی کے خلاف بات کیونکر لکھے جبکہ اسے اس کا پتہ ہی نہیں کہ وہ اس کا اپنا پڑوسی ہے یا کسی دور دراز مقام کا رہنے والا ہے جس سے اس کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی ہے۔[1]

---

[1] اور اگر بالفرض جرم میں ماخوذ کسی شخص کا پتہ لگانے میں کامیابی ہو بھی جاتی تو خاندان اور برادری کا نظام مفقود ہونے کے سبب اس کے نتائج کا سارا بوجھ تنہا اسے اٹھانا پڑتا جس سے اسکی کمر بالکل ٹوٹ کر رہ جاتی۔ خاص طور پر دیت کی صورت میں اسلام نے اس کا بوجھ جو عاقلہ یعنی اہل خاندان (یا ہم جماعت و ہم پیشہ افراد) پر رکھا ہے تو اس کی بھی معنویت ہے۔ ظاہر ہے اگر اولیں [illegible] خاندان اور برادری نہ ہو تو یہ چیز ممکن نہیں ہو سکتی ہے

سماجی زندگی کے یہ وہ دائرے ہیں جن کا تعلق پوری انسانی برادری سے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن کا تعلق خاص طور پر مسلمان معاشرے سے ہے یعنی اسلام کی نام لیوا اس امت سے جس نے خدا و رسول ؐ کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال کر اپنے کو ایک مخصوص طرزِ زندگی کا پابند بنا لیا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی چیز خاندانی نظام کے استحکام سے متعلق ہے۔

خاندانی نظام کا استحکام

اسلام نے انسانی معاشرے کا جو نقشہ پیش کیا ہے۔ اس میں خاندان کے نظام کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی انسانی سماج کے لیے خاندان کے اس نظام کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے کہ اس کی اصلاح پر پورے سماج کی اصلاح کا انحصار ہے اور اگر یہ فاسد ہو جائے تو پورے معاشرے کا فساد یقینی ہے۔ اس لیے کہ درحقیقت معاشرہ خاندانوں کے مجموعے ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اگر خاندان کے اس مجموعے کی ہر اکائی اپنی اپنی جگہ پر علمی، فکری، اخلاقی معاشی ہر لحاظ سے مضبوط پوزیشن حاصل کرے اور ان تمام میدانوں میں اپنے کو اعلیٰ مقام پر فائز کرے تو اس کا مطلب ہوگا کہ ان اکائیوں سے تشکیل پانے والا وسیع تر دائرہ ـــــ یعنی معاشرہ ـــــ خود بخود مضبوطی و استحکام کا پیکر ہوگا اور اسے بجا طور پر ایک مثالی معاشرے کا نام دیا جاسکے گا۔ معاشرے کی تشکیل میں خاندان کے اس ادارے کی کلیدی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے صرف اس حقیقت کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے کہ آج جن اقوام نے خاندانی ادارے کے اس نظام کو درہم برہم کردیا ہے وہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدانوں میں اپنی بے پناہ ترقی اور وسائل زیست کی بے انتہا فراوانی کے باوجود اپنی زندگی میں سکون و اطمینان کی دولت سے محروم ہیں۔ بلکہ صحیح لفظوں میں یہ چیز انہیں تباہی کے دہانے کی طرف ڈھکیلتی جارہی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قوموں اور قبیلوں کا علیحدہ علیحدہ تشخص قائم نہ ہو تو خاندان کا یہ ادارہ کیوں کر وجود میں آئے گا۔ خاندان کی اس علیحدہ تنظیم کی صورت ہی میں افراد خاندان کے درمیان تعلقات میں گہرائی پیدا ہو سکے گی۔ اور پھر اسی کی بدولت لوگ ایک دوسرے کے مسائل کو قریب سے سمجھیں گے اور پھر ان سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہوسکیں گے۔

صلہ رحمی انسانی زندگی میں خاندان کے اس ادارے سے حاصل ہونے والا اہم ترین فیض اعزہ و

اقرباء کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے جائز مفادات کا تحفظ واستحکام ہے۔ اصطلاح شریعت میں جس کا نام صلہ رحمی ہے اور اپنے ماننے والوں کو اسلام نے انتہائی غیر معمولی طور پر اس کی تاکید کی ہے کہ اپنے رشتے ناطے کے لوگوں کا خیال رکھے۔ ان کی معاشی کفالت کا سامان کرے۔ ان کے اوپر اپنا مال خرچ کرے، ان کی مدد کرے اور ان کے کام آئے۔ غرضیکہ ہر طرح سے ان رشتوں کو جوڑے اور ان کو توڑنے سے پرہیز کرے۔ اسلام کی نظر میں اس صلہ رحمی کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ قرآن اللہ کے حق کی ادائیگی کے بعد سب سے پہلے اسی رشتے کے حق کی ادائیگی کی تاکید کرتا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ	اور ڈرو اللہ سے جس کا تم آپس میں
بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	واسطہ دیتے ہو۔ اور رشتوں کا خیال رکھو
عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا	بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔

اور اسے اپنے سمجھدار بندوں کے دائمی اوصاف میں شمار کرتا ہے۔

والذین یصلون ما امر	وہ جو جوڑتے ہیں اس چیز (یعنی رشتے)
اللہ بہ ان یوصل ویخشون	کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور
رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ	اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب
الْحِسَابِ (رعد - ۲۱)	کا اندیشہ رکھتے ہیں۔

نیز جس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اسم 'رحمٰن' کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور اسے جوڑنے والے کو اپنے سے جوڑنے کی خوش خبری دی ہے اور اسے توڑنے والے کو اپنے سے توڑ دینے کی وعید سنائی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الرحم شجنة من الرحمٰن	رحم (یعنی رشتہ) (اللہ کے اسم مبارک)
فقال من وصلك وصلته	رحمٰن کا ایک ٹکڑا ہے تو اللہ نے فرمایا کہ
ومن قطعك قطعته [1]	جو تجھے جوڑے گا میں اسے اپنے سے جوڑے
	رکھوں گا اور جو تجھے کاٹے گا تو میں اس سے
	اپنا رشتہ کاٹ لوں گا۔

[1] بخاری جلد ۲۔ کتاب الادب۔ باب من وصل وصلہ اللہ

جس کی وضاحت ایک دوسری حدیث قدسی میں اس طرح کی گئی ہے :۔

انا اللہ وانا الرحمٰن خلقت الرحم وشققت لہا من اسمی فمن وصلہا وصلتہ ومن قطعہا بتتہ[۱]

میں اللہ ہوں اور میں رحمٰن ہوں میں نے رحم (یعنی رشتہ) کو پیدا کیا اور اپنے نام سے چیر کے اس کے لیے نام نکالا تو جو کوئی اسے جوڑے گا میں اسے اپنے سے جوڑے رکھوں گا اور جو کوئی اسے کاٹے گا میں اس سے اپنا رشتہ توڑ لوں گا۔

ظاہر بات ہے صلہ رحمی کا یہ فرض آدمی اسی وقت ادا کر سکتا ہے جبکہ سماج کے اندر قوموں قبیلوں اور برادریوں کی الگ الگ اکائی قائم ہوا ور ان اکائیوں سے وابستہ افراد سماج کے اندر اپنا علیحدہ علیحدہ تشخص رکھتے ہوں یہی بات جو حدیث نبوی میں اس طرح کہی گئی ہے :۔

تعلموا من انسابکم ما تصلون بہ ارحامکم[۲]

اپنے سلسلہائے نسب کا علم حاصل کرو تاکہ تم اپنے رشتے کے حقوق ادا کر سکو۔

وراثت

پھر رشتہ داروں کے اسی دائرے سے ایک دوسرا مسئلہ بھی وابستہ ہے جس کو اسلام کے معاشرتی نظام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جو سماجی اور معاشی سطح پر اپنے بہت ہی گہرے اور دور رس اثرات رکھتا ہے۔ ہماری مراد وراثت کے نظام سے ہے وراثت کے اس نظام کی خدا اور رسول کی نظر میں کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ قرآن جو اصول وکلیات کی کتاب ہے اور جس نے مسائل کی جزئیات سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ اس نے نظام وراثت کو پوری تفصیل سے بیان کیا ہے اور ہر حقدار کے حق کو متعین کر کے بتا دیا ہے اور اپنے بیان کردہ ان حصص کو "نصیباً مفروضاً" "فریضۃ من اللہ" اور "وصیۃ من اللہ"[۳] سے یاد کیا

---

[۱] ترمذی جلد ۲ ۔ ابواب البر والصلۃ۔ باب ما جاء فی قطیعۃ الرحم

[۲] ترمذی جلد ۲ ۔ ابواب البر والصلۃ ۔ باب ما جاء فی تعلم النسب ۔ مسند احمد ۲/۳۷۴ ۔ الادب المفرد مع فضل اللہ الصمد ۱/۱۵۴

[۳] سورۃ النساء آیات ۷، ۱۱ اور ۱۲

ہے۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تقسیم وراثت کے علم کو آپؐ نے نصف علم سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی تعلیم کی خصوصی تاکید کی ہے۔
حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

تعلموا الفرائض وعلموها فانه نصف العلم وهو ينسىٰ وهو اول شیئ ينزع من امتی [له]	وراثت کا علم سیکھو اور اسے لوگوں کو سکھاؤ۔ اس لیے کہ وہ کل علم کا آدھا ہے اور وہ بھلا دیا جائے گا اور وہ پہلی چیز ہوگی جو میری امت کے سینوں سے کھینچ لی جائے گی۔

وراثت کے اس پورے نظام کی بنیاد رشتے اور نسب پر ہے۔ جو لوگ مورث سے رشتے میں جتنے قریب ہیں وراثت کے اندر ان کا حق اتنا ہی بڑھا ہوا ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ ان رشتوں کی پہچان اسی طور ممکن ہے کہ انسانی آبادی میں قوموں قبیلوں اور برادریوں کی صورت میں مختلف اکائیوں کا نظام قائم ہو۔ اور لوگ ایک غیر فطری عالمی وحدت کے بجائے چھوٹی چھوٹی فطری تقسیموں میں منقسم ہوں

حلال وحرام رشتوں کی پہچان

رشتہ وقرابت کے اسی دائرے سے متعلق ایک اہم چیز حلال اور حرام رشتوں کی پہچان ہے۔ موجودہ خدا بیزار تہذیب ایک حیوانی تہذیب ہے۔ جو انسانی زندگی میں حلال وحرام کے امتیازات سے بالکل ناآشنا ہے لیکن اسلام کی نام لیوا امت کے لیے یہ چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسلام نے زندگی کے دوسرے تمام دائروں میں حلال وحرام کی لکیر امتیاز کھینچنے کے ساتھ رشتے ناطے کے دائرے میں بھی حلال وحرام کا امتیاز قائم کیا ہے۔ اس نے بالکل ظاہر اور فطری عوامل کی بنا پر ان رشتوں کی ایک تفصیل بیان کی ہے جن سے کسی انسان کا مصاہرت (ورشادی بیاہ) کا تعلق قائم کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ رشتے ماں بہن پھوپی اور خالہ بھانجی جیسے قریبی اور گہرے رشتے ہیں جن سے آدمی کی ایسی فطری اور وجدانی محبت ہوتی ہے کہ فطرت انسانی ان سے رشتہ مصاہرت کا تصور کرتے ہوئے بھی ابا محسوس کرتی ہے اور عقل مطالبہ کرتی ہے کہ مصاہرت کی ناگزیر انسانی ضرورت کو ان دائروں سے باہر رہ کر ہی پورا کیا جانا چاہیے۔ رشتوں کے اس دائرے کا مطلب ہی یہ ہے کہ یہ قوموں قبیلوں اور برادریوں کے علیحدہ تشخص سے قائم

له ابن ماجہ۔ ابواب الفرائض۔ باب الحث علی تعلیم الفرائض۔ ترمذی جلد ۲۔ ابواب الفرائض۔ باب ماجاء فی تعلیم

ہوگا اور اسی بنیاد پر شریعت کے قائم کردہ اس حرام سے اجتناب کیا جاسکے گا۔

خاندان اور نسب کی حفاظت

جس طرح اسلام نے اپنے معاشرتی نظام میں حلال و حرام رشتوں کی تمیز قائم کی ہے اسی طرح اس نے اپنے ماننے والوں کے سلسلے میں لازم قرار دیا ہے کہ ہر شخص اپنے نسب کی حفاظت کرے اور اپنے کو غلط طریقہ سے کسی دوسرے خاندان یا دوسرے باپ کی طرف منسوب نہ کرے۔ اسلام کی نظر میں یہ چیز خدا کے ٹھیرائے ہوئے پیمانے کی تبدیلی ہے اور بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے قرآن تاکید کرتا ہے:۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ	لے پالکوں کو پکارو ان کے باپوں
اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا	کے نام سے، یہی زیادہ قرین انصاف ہے
اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ	اللہ کے نزدیک۔ پھر اگر تم نہ جانتے ہوان
مَوَالِیْكُمْ وَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ	کے باپوں کو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں
فِیْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا	اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جو تم غلطی سے
تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ	کہو لیکن وہ جسے تم دل کے ارادے سے
غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ٥ (احزاب۔ ۵)	کہو اور اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں نسب کی یہ تبدیلی کتنا بڑا گناہ ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ایسا کرنے والے پر آپؐ نے جنت کو حرام بتلایا ہے اور اسے اللہ کی دائمی لعنت کا مستحق گردانا ہے۔ حضرت سعید بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ وَ	جو کوئی اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی
هُوَ یَعْلَمُ اَنَّهٗ غَیْرُ اَبِیْهِ فَالْجَنَّةُ	طرف اپنا انتساب کرے دریں حالیکہ
عَلَیْهِ حَرَامٌ۔ [1]	اسے پتہ ہو کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو
	جنت اس کے اوپر حرام ہے۔

اسی طرح حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ

[1] ابوداؤد ج ۲۔ کتاب الادب۔ باب الرجل ینتمی الی غیر موالیہ۔ مسلم ج ۱ کتاب الایمان باب بیان حال من رغب عن ابیہ وھو یعلم۔

من ادعیٰ الیٰ غیر ابیه	جو کوئی اپنے باپ کے علاوہ کسی اور
او انتمیٰ الیٰ غیر موالیه	کی طرف اپنے کو منسوب کرے یا جن کی
فعلیه لعنة الله	موالات اور سرپرستی میں وہ ہے ان کو
المتتابعة الیٰ یوم	چھوڑ کر کسی اور سے اپنا رشتہ ظاہر
القیامة له	کرے تو اس پر اللہ کی پھٹکار ہے جو
	قیامت تک اس پر پڑتی رہے گی۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے لیے اپنے خاندان اور نسب کی حفاظت اسی طور پر ممکن ہے کہ سماج کے اندر قوموں، قبیلوں اور برادریوں اور خاندانوں کی منفرد اکائیاں قائم ہوں اور سماج کا ہر فرد اپنے کو ان اکائیوں سے وابستہ کیے ہوئے ہو۔ منصوعی اور غیر فطری عالمی وحدت میں جبکہ پوری انسانی آبادی ایک خاندان ہو یہی نہیں بلکہ سب ہم رنگ وہم آواز بھی ہوں تو اس صورت میں تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ چیز چل بھی جائے تو دور تک اسے نبھایا نہیں جا سکتا ہے۔

انبیاء و علماء سے ربط

پھر رشتہ و قرابت کے ان مادی تعلقات سے علاوہ معنوی رشتے کا بھی ایک تعلق ہے جو ایک مسلمان کے لیے بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ بلکہ صحیح معنوں میں اسی رشتے کی وابستگی سے امت مسلمہ کی دنیا و آخرت کی فلاح وابستہ ہے۔ ہماری مراد حضرات انبیاء علیہم السلام کی ذواتہائے گرامی سے ربط و تعلق سے ہے سلسلۂ نبوت کی یہی سنہری کڑیاں ہیں جن کے توسط سے انسان کا خدا سے ربط قائم ہوتا ہے۔ پھر انہی حضرات انبیاء علیہم السلام کی پاک زندگیاں ہیں جنھیں دیکھ کر زندگی میں استحضار اور بیداری کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ پھر سلسلۂ نبوت کی یہ سنہری کڑیاں اسی طرح تاریخ انسانی میں توحید و خدا پرستی کی علمبردار دوسری شخصیتیں ان سے مسلمان امت کے تعلق نوعیت پھر بھی ایک عمومی حیثیت کی حامل ہے لیکن اس سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ سے تو اس امت کا خصوصی تعلق ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک نبی عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا سوال ہے تو آپؐ سے محبت اور آپؐ سے خصوصی تعلق تو ایک مسلمان کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ بلکہ دراصل یہی چیز دینی زندگی کا جان ہے کہ جب تک آپؐ

لہ ابوداؤد حوالہ سابق

کی ذات گرامی انسان کے لیے دنیا جہان سے زیادہ محبوب نہ ہو جائے وہ صحیح معنوں میں ایمان کی دولت سے محروم رہتا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں:۔

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین[1]

تم میں کا کوئی شخص سچے معنوں میں مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس کے ماں باپ سے، اس کی اولاد سے یہاں تک کہ تمام لوگوں سے

اسی کے ساتھ آپ نے تمام لوگوں سے صحابہ کرام سے بھی محبت کا مطالبہ کیا ہے اور ان کی اس محبت کو اپنی محبت کی علامت قرار دیا ہے۔

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم[2]

اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے سلسلے میں۔ میرے بعد انہیں ملامت کا نشانہ نہ بناؤ۔ جو کوئی ان سے محبت کرے گا تو میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرے گا اور جو کوئی ان سے بغض رکھے گا تو مجھ سے بغض کے باعث ان سے بغض رکھے گا

اور اس دائرے میں بھی انصار رضی اللہ عنہم کی نسبت سے آپؐ نے اس کی خصوصیت کے ساتھ تاکید کی ہے۔ ان کی محبت کو آپؐ نے ایمان کی علامت اور ان سے بغض و عداوت کو نفاق کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔

آیۃ الایمان حب الانصار و

ایمان کی علامت ہے انصارؓ سے محبت

---

[1] بخاری، جلد ۱۔ کتاب الایمان۔ باب حب الرسول صلے اللہ علیہ وسلم من الایمان۔ مسلم، جلد ۱۔ کتاب الایمان۔ باب وجوب محبۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

[2] ترمذی، جلد ۲۔ ابواب المناقب۔ باب من سب اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم۔

آیۃ النفاق بغض الانصار[1]	رکھنا اور نفاق کی علامت ہے انصار سے بغض رکھنا

اس کے علاوہ فی الجملہ اس امت کی صلاح و خیریت اور ہر دور میں اس کے ایک طبقے کے حق پر قائم رہنے کی جو بشارت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کے اندر دی ہے کہ :۔

لن یزال امر ھذہ الامۃ	اس امت کا معاملہ برابر درست رہے گا
مستقیما حتی تقوم الساعۃ	یہاں تک قیامت برپا ہو جائے یا یہ کہ
او حتی یاتی امر اللہ عز و	(راوی کا شک ہے) اللہ عز وجل کا فیصلہ
جل[2]	(دساکے خاتمے کا) آجائے۔

اور :۔

لن تزال طائفۃ من امتی	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر
ظاھرین علی الحق لا یضرھم	ثابت قدم رہے گا۔ ان کو کچھ نقصان
من خذلھم حتی یاتی امر	نہ پہنچا سکیں گے وہ جو انہیں چھوڑیں گے
اللہ وھم علی ذالک[3]	یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ (قیامت) آجائے گا اور وہ اسی حال پر قائم رہیں گے

اور اس کے نتیجے میں اس امت کا اپنے علماء و صلحاء سے جو خصوصی ربط رہا ہے اور جس طرح وہ ہر دور میں ان کی زندگیوں اور ان کے مجاہدانہ کارناموں سے ولولہ و امنگ حاصل کرتی رہی ہے تو آخر یہ باتیں اسی لیے تو ممکن ہیں کہ امت ان بزرگ ہستیوں کا انفرادی تعارف اور مستقل تشخص رکھتی ہے اور یہ چیز قوموں قبیلوں اور برادریوں وغیرہ کے اختلافات سے حاصل ہونے والے تعارف کی بدولت ہی تو

---

[1] بخاری جلد ۱۔ کتاب المناقب۔ باب حب الانصار۔ مسلم جلد ۱۔ کتاب الایمان۔ باب الدلیل علی ان حب الانصار و علی رضی اللہ عنہم من الایمان و علاماتہ من علامات النفاق

[2] بخاری جلد ۲۔ کتاب الاعتصام، باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق۔ مسلم۔ کتاب العلم باب من یرد اللہ خیرا یفقہ فی الدین

[3] مسلم جلد ۲۔ کتاب الامارۃ باب قولہ صلے اللہ علیہ وسلم۔ لا تزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرھم من خالفھم۔

ممکن ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو انسانی تاریخ غیر متعارف اشخاص کا ایک صحرائے ناپید اکنار ہوتی جہاں ہر شخص کسی کی تلاش میں ہوتا لیکن کوئی کسی کا پتہ لگانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔[1]

اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں رنگ و نسل، ذات برادری اور قوموں اور قبیلوں وغیرہ کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے اور انسانی تمدن کی کتنی عظیم مصلحتیں اس سے وابستہ ہیں۔

۱؎ حافظ ابن حجرؒ نے علامہ ابن حزمؒ کے حوالے سے دین میں "علم الانساب" کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے نہایت ہی مختلف دائروں کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح الباری ۶/۳۳۸، ۳۳۹۔ اس کے علاوہ مفسرین کرام میں [illegible] علامہ آلوسی اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیروں میں آیت مذکورہ کی تفسیر میں اس سلسلے کے بعض پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ دیکھی جائے۔

۲؎ حاشیہ السعدی علی الجلالین ۴/۹۷، روح المعانی ۲۶/۱۶۲، اور ۳ بیان القرآن جلد ۱۱ تفسیر سورہ حجرات

آں حضرتؐ کی رسالت کا انکار بھی آپؐ کی صداقت کا ثبوت

(ڈاکٹر محمد ذکی، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

توراۃ میں خداوند کے اس فرمان :-

(اے موسیٰ!) میں ان کے لیے (یعنی بنی اسرائیل کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی ان سے کہے گا۔ (استثناء، ب، ۱۸)

اور قرآن حکیم کی اس آیت

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (المزمل، ۷۳/۱۵) "تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان خواہ کسی بھی پہلو سے ہو، مشابہت اتنی واضح ہونی چاہیے کہ اس کے لیے کسی مزید ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہ ہو۔ دیکھنے والا ایک ہی نظر میں کہہ اٹھے کہ واقعی دونوں کی سیرت میں کھلی مشابہت ہے لہذا یہ دیکھنے کے لیے کہ توراۃ کی بیان کردہ یہ نشانی یا صفت آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر پائی جاتی ہے یا نہیں دونوں کی سیرت کا مطالعہ کرلینا کافی ہوگا۔ جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا تعلق ہے تو توراۃ کے علاوہ قرآن حکیم میں ان کے مفصل حالات موجود ہیں اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے لیے بھی قرآن حکیم ہی بنیادی ماخذ ہے۔

توراۃ کی طرح قرآن اقدس میں حضرت موسیٰ کی سرگذشت مرتب شکل میں ایک جگہ بیان نہیں کی گئی

بلکہ موقع اور محل کی مناسبت سے اس کے مختلف اجزا متعدد مکی اور مدنی سورتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ مندرجہ بالا سورہ جس میں اس مشابہت کا اعلان ہے۔ مکی دور کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور اس کے کچھ ہی وقت بعد سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی ہے جس میں حضرت موسےؑ کے قصہ کی ابتدا اس واقعے کی گئی ہے کہ وہ کس طرح رسول بنا کر فرعون کی طرف بھیجے گئے۔ اس کو نقل کرنے سے پہلے اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت موسےؑ کا تعلق بنی اسرائیل سے ہے۔ یہ مصر میں پیدا ہوئے۔ وہیں پلے بڑھے اور جوان ہوئے۔ ایک دن اُن کے ہاتھ سے ایک مصری کی موت واقع ہو گئی۔ حکومت کو اس کا علم ہو گیا۔ ان کے قتل کے مشورے ہونے لگے لیکن ایک بہی خواہ نے انہیں اطلاع کر دی۔ یہ مصر کو چھوڑ کر مدین پہنچے۔ وہاں ایک بزرگ کے گھر میں ٹھکانہ مل گیا۔ انہی کی ایک صاحبزادی سے ان کا نکاح ہو گیا۔ آٹھ دس سال وہاں قیام کرنے کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوئے۔ دورانِ سفر کوہِ طور کی طرف سے گذر ہوا جاڑے کی رات تھی، وہاں جو کچھ انھوں نے دیکھا اور جو معاملہ ان کے ساتھ پیش آیا اسی سے اس قصہ کی ابتدا ہوتی ہے ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت موسےؑ کس طرح رسول بنائے گئے۔

سورۂ طٰہٰ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد ہے:۔

"اور (اے پیغمبر!) موسےٰ کی حکایت تو نے سنی؟ جب اس نے (دور سے) آگ دیکھی تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا۔ ٹھہرو، مجھے آگ دکھائی دی ہے۔ میں جاتا ہوں ممکن ہے تمہارے لیے ایک انگارہ لے آؤں یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی راہ دکھلانے والا ہی مل جائے۔"

پھر جب وہاں پہنچا، تو اس وقت پکارا گیا (ایک آواز اٹھی کہ) "اے موسےٰ! میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اتار دے۔ تو طوےٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔ اور دیکھ! میں نے تجھے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے، اسے کان لگا کر سُن۔ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی بندگی کر اور میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کر بلاشبہہ (مقررہ) وقت آنے والا ہے۔ میں اسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں۔ تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی آزمائش ہو جائے، اور) جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو۔ اس کے مطابق بدلہ پائے۔

(طٰہٰ، ۲۰: ۹-۱۵)

دوسری سورتوں میں پھر اور تفصیل بھی ہے۔ حضرت موسےؑ نے اپنے گھر والوں سے کہا:۔
"میں ابھی یا تو وہاں سے کوئی خبر لے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں تاکہ تم لوگ گرم ہو سکو
وہاں پہنچا تو ندا آئی کہ "مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے ماحول میں ہے۔
پاک ہے اللہ سب جہان والوں کا پروردگار۔ اے موسےؑ! یہ میں ہوں اللہ، زبردست
اور دانا۔" (النمل ۲۷ / ۹)

"وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا
کہ "اے موسےؑ! میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان والوں کا مالک۔" القصص ۲۸ / ۳۰ [1]

کیا حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح رسول بنائے گئے۔

حضرت موسےؑ کی سیرت کی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بھی ہم نے پہلے کی سورتوں کی روشنی میں مرتب کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ یہ بات سامنے آجائے کہ ہجرت سے پہلے آپ کی اور حضرت موسےؑ کی سیرت کے درمیان مشابہت کے کون کون سے پہلو اس وقت تک لوگوں کے سامنے آچکے تھے اور انہیں ابھی کن کن چیزوں کے وقوع کا انتظام تھا اب ملاحظہ ہوں اس مشابہت کے چند پہلو۔

(۱) دونوں کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم اور آپس میں برادرانہ نسبت

توراۃ کے بیان کے مطابق حضرت موسےؑ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت اسحٰقؑ سے مل جاتا ہے جو حضرت ابراہیم کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (بمعنے عبداللہ) تھا اس لئے ان کی نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہے۔

ادھر قرآنی تصریحات، احادیث اور عربوں کی قدیم روایات شاہد ہیں کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بھی مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت اسمٰعیلؑ سے مل جاتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے بڑے صاحبزادے ہیں اور جن کی اولاد بنی اسمٰعیل کہلاتی ہے۔ اس طرح حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے۔

---

[1] قرآن کی آیات کا اردو ترجمہ سورہ "مومنون" تک مولانا آزاد کے "ترجمان القرآن" اور بقیہ سورتوں کا ترجمہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے "تفہیم القرآن" سے لیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمہ کو ترجیح دی گئی ہے۔

(۲) دونوں کو منصبِ رسالت رات کی تاریکی میں ملا۔

جیسا کہ اوپر نقل کیا گیا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ یہ معاملہ رات کے وقت پیش آیا تھا جبکہ غروبِ آفتاب کی وجہ سے تاریکی پھیل چکی تھی لیکن ظلم و فساد کی وجہ سے بھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سرزمین مصر تو فرعون کے مظالم اور فساد سے معمور تھی ہی دنیا کے اور خطوں کا بھی یہی حال تھا۔ ہر جگہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی پرستش ہو رہی تھی لیکن خالق کائنات کی عبادت سے دنیا خالی تھی۔ صرف بنی اسرائیل توحید کے قائل تھے لیکن ان کے عقائد بھی دورِ غلامی میں مسخ ہو چکے تھے۔

ٹھیک یہی معاملہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی تھا۔ آپ کو بھی شب کی تاریکی میں منصبِ رسالت سے نوازا گیا لیکن باطنی اعتبار سے بھی عالم گیر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سوائے چند اہل کتاب کے دنیا توحید کے تصور سے ناآشنا ہو چکی تھی۔ اور ٹھیک اسی موڑ پر آ گئی تھی جس پر حضرت موسیٰؑ کی بعثت کے وقت تھی جس کا نقشہ قرآن کی اس آیت میں کھینچا گیا ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (الروم) — خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔

(۳) دونوں مقدس ہستیاں ہدایت کی متلاشی تھیں

ظاہری اعتبار سے تو حضرت موسیٰؑ راستہ سے بھٹک ہی گئے تھے اور طور پر جانے کا ایک مقصد ان کے سامنے یہ بھی تھا۔

أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ٥ (طٰہٰ) (ممکن ہے) الاؤ پر کوئی راہ دکھانے والا ہی مل جائے۔

لیکن باطنی اعتبار سے بھی وہ راہ سے بھٹکے ہوئے تھے جس کا انھوں نے فرعون کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ اس مصری کا قتل مجھ سے ہو گیا تھا جبکہ میں بھٹکا ہوا تھا۔

فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ (شعراء ۲۶/۲) — کیا تو تھا میں نے وہ کام اور میں اس وقت ضلالت میں تھا۔

یعنی جو راہ ان کے لیے مقدر اور ان کی شان کے شایاں تھی اس سے ہٹے ہوئے تھے اور جب رسول بنائے گئے تو ہدایت یافتہ ہو گئے۔

بالکل یہی بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی فرمائی گئی ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ ۹۳) اور پایا تجھے بھٹکتا پھر راہ سجھائی

یعنی رسالت سے پہلے آپ بھی اس راستے پر نہیں تھے جو آپ کے لیے مقدر اور مناسب تھا اور جب حضرت موسےؑ کی طرح رسالت سے نوازے گئے۔ تو راہ یافتہ ہو گئے۔

(۴) دونوں کے ساتھ اہل وعیال تھے مگر وادی میں تنہا گئے

قرآن کے بیان کے مطابق اس موقع پر ان کے اہل وعیال ساتھ ہی تھے لیکن جب طور کے دامن میں جانے لگے تو انھیں پیچھے چھوڑ کر تنہا وادی میں پہنچے تھے۔ اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی مکہ سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ روانہ ہوئے تھے[1] لیکن جب جبل نور[2] کے قریب پہنچے تو انہیں پیچھے چھوڑ کر تنہا وادی (غار حرا) میں تشریف لے گئے۔

(۵) دونوں کو رسالت پہاڑ کے دامن میں ملی

حضرت موسےؑ راستہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ انہیں امید کی کرن کوہ طور پر نظر آئی اور وہیں رسول بنائے گئے۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی صحیح راستے کے متلاشی تھے اور آپ کو بھی امید کی کرن جبل نور پر نظر آرہی تھی جس کے دامن (غار حراء) میں آپ بھی منصب رسالت پر فائز کیے گئے وہاں جبل طور تھا اور یہاں جبل نور۔

(۶) مشاہدہ "نار" و "نور"

حضرت موسےؑ نے طور پر بلا شبہہ ایک آگ دیکھی تھی لیکن یہ دنیوی آگ نہیں تھی اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ وہ عین اللہ تعالےٰ کی ذات اقدس بھی نہیں تھی کیونکہ آگ محدود تھی' اللہ کی ذات حدود سے ماوراء ہے۔ وہ آگ اس وقت سے پہلے تھی نہ بعد میں رہی۔ اللہ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ پھر کیا یہ اس کی تجلی تھی؟ شاید نہیں۔ کیونکہ جب اللہ تعالےٰ نے تجلّی فرمائی تو پہاڑ کا وہ حصّہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اور حضرت موسےؑ بے ہوش ہو گئے تھے (ملاحظہ ہو الاعراف ۷/۱۴۳) اس سے معلوم ہوا کہ انسان بے حجاب تجلی کی بھی تاب نہیں لاسکتا۔ پھر یہ آگ کیسی تھی؟ اس پر ایک حدیث سے روشنی پڑتی ہے جس میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں

---

[1] طبری نے تصریح کی ہے کہ اس بار آپ کے گھر والے ساتھ تھے

[2] مکہ سے کچھ دور ایک ٹیلہ کا نام ہے۔

حجابہ النار لو کشفھا لاحرقت سبحات وجھہ کل شیئ ادرکہ بصرہ[1]

(یعنی اس کے اور مخلوق کے درمیان) نار کا حجاب ہے۔ اگر وہ یہ حجاب اٹھا دے تو اس کی ذات کے انوار جہاں تک نظر جائے سب کو پھونک ڈالیں

دوسری روایت میں "نار" کی جگہ "نور" کا لفظ ہے۔ یہ دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں جب نور میں شدت ہوتی ہے تو نار سے تعبیر کردیا جاتا ہے (آفتاب نور کا مصدر ہوتا ہے، اور اسے نار سے بھی تعبیر کردیا جاتا ہے) اسی طرح ذات اقدس کے حجابات کو کبھی نور اور کبھی نار سے تعبیر کردیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ یہ سنکر وہ کانپ اٹھے اور بولے :-

یا محمد! میرے اور اس کے درمیان تو نور کے ستر پردے ہیں۔ اگر میں کسی ایک کے نزدیک بھی پہنچ جاؤں تو جل جاؤں[2]

مختصر یہ کہ حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ درحقیقت "نور جلال تھا یا حجاب ناری"[3]۔ اور اسی نوعیت کا مشاہدہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا تھا جس کا ذکر ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے اپنے پروردگار کو دیکھا تھا؟ آپ نے فرمایا :-

نورانی اراہ - وہ نور تھا میں اسے نظر جما کر بھلا کیسے دیکھ پاتا۔

اور دوسری روایت میں ہے :- رایت نوراً - یعنی میں نے اپنے رب کو نہیں بلکہ بس ایک نور دیکھا۔

خلاصہ یہ کہ نہ تو حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہ آپ نے، بس اسی حجاب کا نظارہ کیا جو "نور" اور "نار" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۷) "مشاہدہ" درخت" اور "سدرۃ المنتہیٰ"

حضرت موسیٰؑ نے ایک درخت دیکھا تھا لیکن یہ بھی دنیا کے عام درختوں کی طرح کا کوئی درخت نہیں

---

[1] احمد، مسلم، ابن ماجہ (مولانا بدر عالم، ترجمان السنہ ج ۱، ص ۲۹۴)

[2] معارج (ترجمان السنہ ج ۱، ۲۹۶)

[3] مزید تشریح کے لیے دیکھیے مولانا مودودی تفہیم القرآن - ج ۵ - ص ۲۰۴

تھا، بلکہ ایک عجیب و غریب، غیبی اور بابرکت درخت تھا، جس کے ذریعے سے وہ کلام الٰہی سن رہے تھے
اسی طرح حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک درخت کا مشاہدہ فرمایا جسے قرآن نے "سدرۃ المنتہیٰ"
کا نام دیا ہے۔ یہ عجیب و غریب درخت نہ صرف یہ کہ دنیوی درخت نہیں بلکہ اس کائنات سے بھی ماوراء ہے
اس کی تفصیل یہ ہے کہ معراج کی شب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی انعامات سے نوازنے کے
لیے پروردگار عالم نے انتہائی بلندیوں پر بلایا جہاں آپؐ نے حضرت جبرئیلؑ کو دوسری بار ان کی اصل
شکل میں بھی دیکھا۔ اسی سلسلے میں ارشاد ہے :۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰىۙ	اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہیٰ کے
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى	پاس اس کو دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ
عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰىؕ اِذْ	ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ
يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰىۙ	کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چوندھیائی، نہ حد سے
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (النجم ۵۳ ۱۳-۱۷)	متجاوز ہوئی۔

"سدرہ" کے معنے ہیں بیری کا درخت لیکن اس سے مراد اس دنیا کا بیری کا درخت نہیں۔ "منتہیٰ" کہتے
ہیں انتہائی سرحد کو۔ یعنی علم اور فہم و ادراک کی آخری سرحد جس کے آگے کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں۔
پس "سدرۃ المنتہیٰ" کا مطلب یہ ہوا کہ ایک عجیب و غریب بیری کا درخت جو اس کائنات سے ماوراء
ہے۔ آسمانوں سے بھی اوپر جہاں جنت الماویٰ ہے۔ اسی کے قریب آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس
کا مشاہدہ فرمایا۔ اس درخت کی کیفیت، حسن و خوبی اور شان و شوکت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا
جا سکتا کیونکہ یہ فہم و ادراک سے ماوراء ہے اسی لیے بس یہ فرما دیا کہ "اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو
کچھ کہ چھا رہا تھا۔" اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں فرمایا کہ آپ نے اس ماورائی منظر کا پورے
وقار اور توجہ کے ساتھ مشاہدہ فرمایا[1]

(۸) بابرکت ماحول

جس جگہ حضرت موسےؑ سے کلام فرمایا گیا اس کے بارے میں ارشاد ہے :۔

نُوْدِيَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ	ندا آئی کہ مبارک ہے وہ جو اس آگ میں ہے

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فوائد مولانا عثمانی اور تفہیم القرآن آیت سے متعلق تشریحی نوٹ

وَمَنْ حَوْلَهَا (النمل ۲۷/۸) اور جو اس کے ماحول میں ہے

دوسری جگہ اس کے حق میں فرمایا:۔ "البقعة المباركة" مبارک خطہ۔ (القصص ۲۸/۳۰)

یعنی آگ میں اور اس کے ماحول میں جو کچھ تھا بابرکت تھا بلکہ پورا خطہ ہی برکتوں سے معمور تھا۔

برکت کہتے ہیں اس خیر و خوبی اور بھلائی کو جس کا صدور اور ظہور اللہ کی طرف سے ہو۔ (لغات القرآن) ٹھیک یہی لفظ اس مقام کے بارے میں بھی فرمائے گئے ہیں جہاں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خصوصی فیض نازل فرمانے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ وہ جگہ اور اس کا ماحول بھی برکتوں سے معمور تھا۔ اسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ	پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے
لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی	بندے (یعنی پیغمبر اسلام) کو راتوں رات
الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ	مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ اس کے اطراف
بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ (بنی اسرائیل ۱/۱۷)	کو ہم نے بڑی ہی برکت دی، سیر کرائی۔

(۹) وادی مقدس اور بیت المقدس

جس جگہ حضرت موسیٰ ہم کلام ہوئے، اس کو قرآن نے "وَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی" (طٰہٰ) طویٰ کی مقدس وادی کے نام سے موسوم کیا ہے اور معراج کی شب میں خصوصی انعامات جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فرمائے گئے وہ بھی "بیت المقدس" کے نام سے موسوم ہے۔ دونوں جگہوں کے لیے "مقدس" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

(۱۰) پہلا خطاب۔ رَبُّكَ

اور جب کلام کی ابتدا ہوئی تو اپنی ذات اقدس کا تعارف بھی ایک انداز میں کرایا۔ حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:۔ اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ (طٰہٰ) میں ہوں تیرا رب۔

اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وحی کی ابتدا اسی طرح ہوئی یعنی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ (العلق) پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ۔

(۱۱) آداب حضوری۔ برہنہ پا

خطاب کے وقت حضرت موسیٰ سے فرمایا گیا۔ "فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ" (اپنی جوتی اتار دے) ۱۲

ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت ان کی جوتیوں میں کوئی نجاست لگی ہوئی تھی یا پھر اس جگہ جوتیاں پہننا خلاف ادب تھا۔ اس سلسلے میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ تھا کہ نماز کی حالت میں ـــــ جو کہ حضوری کا مقام ہے ـ اگر جوتیوں میں نجاست لگی ہو تو اتار دینا ضروری ہے' ورنہ پہنکر نماز پڑھی جا سکتی ہے ۔ پھر بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ آپ کے ساتھ بھی پیش آگیا جبکہ آپ کو بھی حکم ہوا کہ اپنی جوتیاں اتار دیں ۔

حضرت ابوسعید خدری رضؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے کہ دفعتاً آپ نے تعلین مبارک اتار کر اپنی بائیں جانب رکھ لیے ۔ یہ دیکھنا تھا کہ صحابہؓ کرام نے بھی اپنے اپنے چپل اتار ڈالے ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز پوری فرما چکے تو ان سے پوچھا تم لوگوں نے اپنے چپل کیوں اتار لیے ۔ انھوں نے عرض کیا ۔ ہم نے آپ کو چپل اتارتے دیکھا تو ہم نے بھی اتار ڈالے ۔ آپ نے فرمایا میرے پاس تو جبرئیل علیہ السلام آئے تھے انھوں نے مجھ سے کہا کہ (آپ کے) چپلوں میں کچھ گندگی لگی ہوئی ہے ۔ تم جب مسجد میں آیا کرو تو پہلے اپنے چپل دیکھ لیا کرو ۔ اگر ان میں کوئی گندگی نظر آئے تو اس کو صاف کر کے پھر ان سے نماز پڑھ لیا کرو

۱۲) منصب رسالت پر تقرر

حضرت موسےٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا تھا ۔ اَنَا اخْتَرْتُكَ (طٰہٰ) میں نے تجھے (رسالت کے لیے) چُن لیا ہے ۔ یعنی رسولوں میں شامل فرما لیا جس کے بارے میں موسےٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا ۔ "جَعَلَنِیْ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (الشعراء ۲۶/۲۱) ـــــ یہی بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمائی گئی ۔ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (یٰس ۳۶/۳) تم یقیناً رسولوں میں سے ہو ۔

اور غار حرا میں بھی فرشتہ نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اللہ نے آپ کو اپنا رسول بنا لیا ہے ۔ (طبری)

۱۳) وحی کو بغور سننے کی تاکید

اس بشارت کے بعد حضرت موسےٰ سے فرمایا تھا "فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ٥ (طٰہٰ) سُن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ اسی نوعیت کی تاکید حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو وحی کی گئی تھی ۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ٥ (القیامۃ ۷۵/۱۸) جب ہم اسے (یعنی آیات قرآنی کو فرشتہ کے ذریعہ سے) پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہو

"فَاسْتَمِعْ" اور "فَاتَّبِعْ" کا مفہوم ایک ہی ہے۔

(۱۴) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تعلیم

پھر جس طرح حضرت موسےؑ کو دین کا بنیادی اصول بتایا گیا یعنی:۔ اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (طٰہٰ) میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی بندگی کر) اسی طرح آپ سے بھی فرمایا۔ اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ (طٰہٰ) فَاعْبُدِ اللّٰہَ (الزمر ۲/۲۹) وہی اللہ ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف وہی۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو۔

(۱۵) نماز کی تاکید

حضرت موسیٰؑ کو تاکید فرمائی گئی۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ٥ (طٰہٰ) اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر) اور آپ کو بھی اس کی تاکید فرمائی گئی۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ .... ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ ٥ (ھود ۱۱/۱۴) اور نماز قائم کرو..... یہ نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پذیر ہیں۔ اور پانچ وقت کی نماز تو سب ہی جانتے ہیں کہ معراج کی شب میں فرض کی گئی

(۱۶) آخرت پر ایمان

پھر جس طرح حضرت موسیٰؑ کو یوم آخرت پر ایمان کی تلقین فرمائی گئی اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی فرمائی گئی۔ حضرت موسےؑ سے فرمایا۔

اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی ٥ (طٰہٰ)	قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے

اسی طرح آپ سے فرمایا۔

اِنَّ السَّاعَۃَ لَاٰتِیَۃٌ لَّا رَیْبَ فِیْھَا (المومن ۵۹/۲۴)	یقیناً قیامت کی گھڑی آنے والی ہے اس کے آنے میں کوئی شک نہیں
اِلَیْہِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَۃِ (حٰم السجدۃ ۴۷)	اس ساعت کا علم اللہ ہی کی طرف راجع ہوتا ہے
لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ (الجاثیہ ۲۲/۲۵)	تاکہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔

(۷) اسمار الحسنٰی

اللہ تعالیٰ نے اپنے چند اسمار الحسنٰے بھی بیان فرمائے۔ حضرت موسےؑ کو ان اسمار کا تعارف فرمایا
سُبْحٰنَ اللّٰہِ ۔ رب العالمین ۔ العزیز الحکیم

ان اسمار کی تعلیم حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی دی گئی: جہاں معراج کا ذکر ہے وہیں ارشاد ہے
سبحٰنَ الَّذِیٓ اَسْرٰی بعبدہٖ ۔۔۔ (بنی اسرائیل) سورۂ فاتحہ اور بہت سی دوسری سورتوں میں ہے
رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ اسی طرح دیگر سورتوں کے علاوہ سورہ الزمر ۱/۳۹ میں ارشاد ہے۔ تنزیلُ
الکتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیزِ الحکیم

(۸) ثابت قدمی کی تاکید

حضرت موسےؑ سے فرمایا گیا تھا:۔

ولا یَصُدَّنَّکَ عَنْھَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِھَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ فَتَرْدٰی (طٰہٰ)	پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا۔

اسی طرح آپ سے بھی فرمایا:۔

ولا یصُدُّنَّکَ عن اٰیٰتِ اللّٰہِ بعدَ اِذ اُنزلت الیک (القصص ۲۸)	اور ایسا کبھی نہ ہونے پائے کہ اللہ کی آیات جب تم پر نازل ہوں تو کفار تمہیں باز رکھیں
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ (الکہف ۱۸/۲۸)	جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا (یعنی ہمارے ٹھہرائے ہوئے قانون نتائج کے مطابق جس کا دل غافل ہو گیا) اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے پڑ گیا تو ایسے آدمی کی باتوں پر کان نہ دھر

(۹) رسالت کے ثبوت میں دونوں کو آیات (نشانیاں) دی گئیں

حضرت موسےؑ کو رسالت کے ثبوت کے طور پر دو نشانیاں (آیات) دی گئیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:۔

اور (ندائے غیبی نے پوچھا) اے موسےٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟" عرض کیا "میری لاٹھی ہے۔ چلنے میں اس کا سہارا لیتا ہوں۔ اس سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں" حکم ہوا "اے موسےٰ! اسے ڈال دے۔ موسےٰ نے ڈال دیا۔ دیکھا کیا دیکھتا ہے، ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے (طٰہٰ)
جونہی کہ موسےٰ نے دیکھا لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو پیٹھ پھیر کر بھاگا اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (ارشاد ہوا) اے موسےٰ! ڈرو نہیں۔ میرے حضور رسول ڈرا نہیں کرتے۔ الّا یہ کہ کسی نے قصور کیا ہو، پھر اگر برائی کے بعد اس نے بھلائی سے (اپنے فعل کو) بدل لیا تو میں معاف کرنے والا مہربان ہوں۔ (النمل $\frac{27}{10-11}$)
موسیٰ، پلٹ آ! اور خوف نہ کر، تو بالکل محفوظ ہے۔ (القصص $\frac{28}{31}$)
حکم ہوا، اسے پکڑ لے۔ خوف نہ کھا۔ ہم اسے پھر اس کی اصلی حالت پر کیے دیتے ہیں (طٰہٰ)
اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھ، اور پھر نکال، بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو چمکتا ہوا نکلے گا یہ (تیسری) دوسری نشانی ہوئی (اور یہ دونوں نشانیاں) اس لیے (دی گئی ہیں) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ (طٰہٰ)
اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے نبوت کے لیے ابتدا میں پانچ آیتیں اور بعد میں پورے قرآن میں ہزاروں آیتیں مرحمت فرمائی گئیں۔ وہ پانچ آیتیں یہ ہیں۔
پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔ (العلق)
(ان آیات پر تفصیلی بحث اس وقت ہوگی جب مخالفین اعتراضات کریں گے۔ جب ہی ان کی نوعیت اور منشا بہت سے پہلو واضح ہو سکیں گے۔)

(۲۰) **آیات کبریٰ کا مشاہدہ** ۔ ابھی آپ کی نظر سے گذرا کہ حضرت موسیٰؑ سے فرمایا گیا:۔
لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ٥ (طٰہٰ) کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں اور بعد میں یقیناً دکھائی گئیں اور موسےٰ علیہ السلام نے دیکھیں۔

ٹھیک یہی معاملہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ معراج کے سلسلے میں فرمایا۔

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا ۝ (بنی اسرائیل ۱/۱۷) کہ اپنی نشانیاں اسے دکھائیں

اور اس مبارک سفر کے خاتمہ پر فرمایا :۔

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝ (النجم ۵۳/۱۸) بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

(۲۱) بعثت اس کے بعد حضرت موسےٰ علیہ السلام سے فرمایا :۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (طٰہٰ) یعنی اے موسےٰ !) تو فرعون (یعنی بادشاہ مصر) کی طرف جا۔ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔

یہ وہی بات ہے جس کی طرف سورۂ المزمل میں اشارہ فرمایا گیا تھا۔ یعنی حضرت موسےٰ کو اُن کے وطن کے لوگوں بالخصوص سرکش فرماں روا کی طرف بھیجا گیا اسی طرح حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت آپ کے ہم وطنوں اور قوم کے لوگوں کی طرف بھی تھی اور تمام انسانوں کی طرف بھی جن میں ہر دور کے فراعنہ بھی شامل ہیں، جو سرکشی میں فرعون سے کم نہیں تھے۔ آپ سے ارشاد ہوا۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ (المدثر ۷۴/۲) اٹھو اور خبردار کرو۔

نیز فرمایا :۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ (الاعراف ۷/۱۵۸) اے پیغمبر ! (تم لوگوں سے) کہو" اے افرادِ نسل انسانی ! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔

یہاں تک آپ نے مشابہت ملاحظہ فرمائی کہ دونوں کو ایک ہی انداز سے رسول بنا کر بھیجا گیا یہ مشابہت یہیں تک محدود نہیں بلکہ بے شمار گوشوں پر محیط ہے۔ مزید چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۲۲) شرح صدر

جب موسےٰ علیہ السلام کے سپرد پیغام پہنچانے کا کام ہوا تو انہیں احساس ہوا کہ کتنی بھاری ذمہ داری اُن پر آ گئی ہے اور اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ چنانچہ اپنے دل کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے درخواست پیش کی۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِىْ صَدْرِىْ (طٰہٰ) عرض کیا۔ اے پروردگار ! میرا سینہ کھول دے۔ کیونکہ رَبِّ اِنِّىْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ اے میرے رب مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں

وَيَضِيقُ صَدْرِي (الشعراء ۲۶ / ۱۲،۱۳) گے ۔میرا سینہ گھٹتا ہے

حضرت موسیٰ کو ڈر تھا کہ فرعون اور اس کے درباری اُن کی بات نہیں مانیں گے اور ان کے متوقع ردعمل سے اپنے دل میں ایک قسم کی گھٹن اور تنگی محسوس کر رہے تھے ۔چنانچہ ان کی درخواست قبول ہوگئی فرمایا۔

قَدْ أُوتِيتَ سُؤْلَكَ يَا مُوسَىٰ ۝ (طٰہٰ) دیا گیا جو کچھ تو نے مانگا اے موسیٰ

یعنی ان کا سینہ کھول دیا گیا

یہی کیفیت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی بھی تھی ۔اسی کی طرف اشارہ ہے :۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ۝ (الحجر ۱۵ / ۹۷) ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے

چنانچہ آپ کو تسلی دی گئی اور آپ کا سینہ بھی (موسیٰ علیہ السلام کی طرح) کھول دیا گیا۔

وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ (النحل ۱۶ / ۱۲۷) اور نہ ان کی چال بازیوں پر تنگ دل ہوں

سے فرمایا ۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ (الم نشرح ۹۴ / ۱) (اے نبی) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے نہیں کھول دیا

۲۲) کام میں آسانی

حضرت موسیٰ ؑ نے ایک درخواست یہ بھی پیش کی تھی ۔ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي (طٰہٰ) اور میرا کام میرے لیے آسان کردے ۔اُن کی یہ دعا قبول ہوئی جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو آسانیاں فراہم کردی جائینگی

اور یہی بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی فرمائی گئی ۔ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرَىٰ (الاعلیٰ ۸۷ / ۸) ۔ اور ہم سہولت دے جائیں گے تجھ کو آسانی تک ۔

اور یہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی

إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا — حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے

۲۱) قادرالکلامی اور فصاحت

موسیٰ علیہ السلام کی ایک اور درخواست

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ میری زبان کی گرہ کھول دے (کہ خطاب و

يَفْقَهُوا قَوْلِي (طٰہٰ) کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے اور میری بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔

کیونکہ:۔

وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي اور میری زبان نہیں چلتی

اسباب خواہ کچھ بھی ہوں حضرت موسےؑ یہ محسوس کر رہے تھے کہ جو کام ان کے سپرد ہوا ہے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس طلاقت لسانی اور خطابت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر نہیں اس لیے یہ دعا کی۔

جہاں تک اللہ کے پیغام کو سمجھ کر اور محفوظ کرکے لوگوں کے سامنے حسن و خوبی کے ساتھ بیان کر دینے کا تعلق ہے تو حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں یہ اطمینان دلایا گیا۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۚ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۚ (القیامۃ ۷۵ / ۱۷-۱۹)

اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے۔ لہذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے

اور جہاں تک تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا تعلق ہے تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"مجھے جوامع کلم اور فواتح کلم دیے گئے ہیں[1]

یعنی دریا کو کوزہ میں بند کر دینے کی صلاحیت نیز آپ نے فرمایا کہ میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے (جو فصاحت و بلاغت میں مشہور تھا)[2]

(۲۷) مدد کے لیے بھائی — ہارون و حضرت علی

حضرت موسےؑ نے یہ درخواست بھی کی تھی:۔

وَاجْعَل لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي ۚ هَارُونَ أَخِي ۚ اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي ۚ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي

اور میرے گھر والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اس کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے۔ وہ میرے

---

[1] بیہقی، شعب الایمان۔ (ترجمان السنۃ، حدیث ۱۹۱)

[2] طبقات ابن سعد (مولانا شبلی، سیرۃ النبی۔ ج ۱-۲-۱۷۔ ص ۱۷)

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (طٰهٰ)

کام میں میرا شریک ہو۔ ہم (دونوں مل کر) تیری پاکی اور برائی کا بکثرت اعلان کریں تیری یادیں زیادہ سے زیادہ کرتے رہیں

انھوں نے حضرت ہارونؑ کی تعریف میں یہ بھی عرض کیا۔

وَاَخِيْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُّصَدِّقُنِيْ (القصص ۲۸/۳۴)

اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے۔

فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ (الشعراء ۲۶/۱۳) سو پیغام دے ہارون کو

ذمہ داری کا یہ بوجھ اس طرح ہلکا ہو گیا۔ یہی ہوا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا فرمایا

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح ۹۴/۲-۳)

اور تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔

سبھی بہت سے مومنین پیدا کر دیں کہ آپ کا بوجھ ہلکا ہو گیا اور ہارونؑ کی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ آپ کے بھائی بھی اپنے ساتھ کر دیا۔ جو سب سے پہلے آپ پر ایمان لائے۔ جب لوگوں نے تکذیب کی تو انھوں نے تائید کی۔ قدم قدم پر آپ کے شریک کار رہے نیز حضرت علیؓ کی شجاعت کے ساتھ ساتھ فصاحت تو تمام دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اور اب خود آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے حضرت علیؓ سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسےٰؑ سے تھی اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا ہے[1]۔ اس لیے تم نبی نہیں ہوا اور نہ ہو سکتے ہو۔

(۲۶) حفاظت کا وعدہ اور غلبہ کی بشارت

حضرت موسےٰ کے سامنے ایک اور مسئلہ بھی تھا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں انھیں مصر میں قتل نہ کر دیا جائے کیونکہ ان کے ہاتھوں ایک مصری کی موت واقع ہو چکی تھی۔ انھوں نے عرض کیا:۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ اور مجھ پر ان کے ہاں ایک جرم کا الزام بھی ہے

[1] بخاری و مسلم۔ (ترجمان السنۃ ج ۲، ۴۰۲)

رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ (القصص ۲۸/۳۳)

میرے آقا! میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔

ارشاد ہوا۔ کَلَّا ۚ (الشعراء ۲۶/۱۵) ہرگز نہیں۔

نیز یقین دلایا:۔

"ہم تیرے بھائی کے ذریعے سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سطوت بخشیں گے کہ وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہوگا۔ (القصص ۲۸/۳۵)

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی قتل کا الزام تو نہیں تھا کہ آپ کے مخالفین اس بنا پر آپ کو قتل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن اس میں یہ اشارہ ضرور ہے کہ اگر کسی نے آپ کو قتل کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت بھی اسی طرح فرمائے گا جس طرح حضرت موسےٰؑ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا گیا تھا اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔

بہر حال آپ سے وعدہ فرمایا گیا کہ آپ کے مخالفین ہی بالآخر ناکام ہوں گے اور کامیابی آپ ہی کے قدم چومے گی۔

پس (اے نبیؐ!) تم اس کلام کے جھٹلانے والوں کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ ہم ایسے طریقہ سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ (القلم ۶۸/۴۴)

اس مشابہت سے نتائج

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا تعلق دونوں رسولوں کی سیرت کے اس پہلو سے ہے کہ کس طرح منصب رسالت پر فائز کیے گئے اس میں مشابہت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔

اگرچہ ان میں سے بیشتر امور کا تعلق اس کلام سے ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان ہوا ہے پھر بھی کسی دوسرے انسان نے آج تک ان امور میں نہ مشابہت کا دعوے کیا ہے نہ کر سکتا ہے۔

اس کے علاوہ دیگر بے شمار باتوں میں ایسی مشابہت بھی ہے جو اس وقت دیکھی جا سکتی تھی اور آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً ہارون علیہ السلام کی طرح آپ کے بھائی حضرت علیؓ کا رول، البتہ آپ کو مخاطبین

کو اس وقت یہ دیکھنا تھا کہ کیا آپ بھی اپنے مخالفین پر اسی طرح غالب آتے ہیں جس طرح موسیٰ علیہ السلام غالب آئے تھے لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ ان کے سامنے آگیا تھا وہ یہ کہ:۔

آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان مشابہت کے بعد آپ کے مخاطبین کے سامنے دو ہی راستے تھے ۔

(۱) یا تو آپ کی رسالت کو تسلیم کرلیں ۔ آپ پر ایمان لے آئیں اور آپ کی پیروی اختیار کرلیں ۔

(۲) یا آپ کی تکذیب کریں ۔ آپ پر ایمان نہ لائیں اور آپ کی بات نہ مانیں ۔

پہلا راستہ اختیار کرنے میں آپ کی تصدیق کرتے اور فرعون کے انجام بد سے بچ جاتے ۔ اور اگر تکذیب کا راستہ اختیار کرتے تو بھی آپ کے دعوے کی تصدیق ہو رہی تھی کیونکہ اس صورت میں شعوری اور لاشعوری طور پر انھیں فرعون اور اس کے ہم نواؤں کی پیروی اختیار کرنا پڑ رہی تھی اور مخالفین فرعون و آل فرعون کا رول ادا کرکے مشابہت کو اور واضح کر رہے تھے یعنی دونوں ہی صورتوں میں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق ہی ہو رہی تھی ۔

یہ ہے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا "اعجاز" (معجزہ) کہ آپ پر ایمان لاکر بھی مخاطبین آپ کی تصدیق کر رہے تھے اور انکار کرنے والے بھی آپ کی رسالت کو ثابت کر رہے تھے ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ابوجہل جیسے سرداران قریش نے فرعون کا رول ادا کرکے بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے رسالت و مشابہت کو سچ ثابت کردیا ۔

ضروری اعلان

پہلے بھی اعلان کیا جاچکا ہے کہ انتظامی امور سے متعلق تمام خطوط اور ارسال زر دھلی کے پتہ پر کیا جائے لیکن ابھی زندگی کی ایجنسیاں اور خریدار پوری طرح اس پر عمل نہیں کر رہے ہیں ۔ اس طرح ان کے خطوط کے جواب میں بہت تاخیر ہوگی ۔ ذیل کا پتہ یاد رکھیے ۔

منیجر زندگی ۲۵۱۵ سوئی والان نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

(بقیہ صفحہ ۸)

مسیرۃ سبعین خریفا — کے برابر دور کر دیا جائے گا۔ میں نے کہا
قلت یا ابا حمزۃ ما الخریف؟ — اے ابو حمزہ خریف کے کیا معنے؟ انھوں
قال العام [1] — نے کہا۔ اس کے معنے "سال" کے ہیں۔

"ستر سال کی مسافت" کا ذکر یہ بتلانے کیلئے ہے کہ وہ دوزخ سے بہت دور کر دیا جائے گا۔

عن علی قال ما من رجل یعود مریضا ممسیا الا خرج معه سبعون الف ملك یستغفرون له حتی یصبح وکان له خریف فی الجنة ومن اتاه مصبحا خرج معه سبعون الف ملك یستغفرون له حتی یمسی وکان له خریف فی الجنة [2]

حضرت علی سے روایت ہے انھوں نے کہا جو شخص کسی مریض کی عیادت شام کو کرتا ہے اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے اس کیلئے استغفار کرتے ہوئے نکلتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جائے اور اس کو جنت میں ایک نیا باغ ملے گا اور جو شخص کسی مریض کے پاس صبح کو آتا ہے اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے اس کیلئے استغفار کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ شام ہو جائے اور اس کو جنت میں ایک نیا باغ ملے گا۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من عاد مریضا ناداه منادٍ من السماء طبت وطاب ممشاك وتبوءت من الجنة منزلا [3]

ابو ہریرہ رضؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو کسی مریض کی عیادت کرتا ہے اس کو آسمان سے ایک پکارنے والا پکارتا ہے تم اچھے اور تمہاری چال اچھی اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک خاص محل بنا لیا۔

عن ثوبان رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم قال: — ثوبان نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ مسلمان

[1] ایضاً باب فضل العبادۃ علی وضوء [2] ایضاً [3] الترغیب والترہیب بحوالہ ترمذی وابن حبان وابن ماجہ

ان المسلم اذا عاد اخاہ المسلم لم یزل فی خرفۃ الجنۃ حتی یرجع قیل یارسول اللہ وماخرفۃ الجنۃ قال جناھا لہ

اپنے کسی مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے تو وہ جنت کے پھل چنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ واپس آجائے۔ دریافت کیا گیا "خرفۃ الجنۃ" کیا ہے؟ آپ نے فرمایا "جنت کے پھل"

مریض کے لیے دُعا

نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ کوئی شخص عیادت کو جائے تو مریض کے لیے دعا کرے۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال من عاد مریضا لم یحضر اجلہ فقال عندہ سبع مرات: اسال اللہ العظیم رب العرش العظیم ان یشفیک الا عافاہ اللہ من ذالک المرض [2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی ایسے مریض کی عیادت کی جس کی موت کا وقت نہیں آیا ہے، پھر اس نے سات بار یہ دعا کی۔ "میں اللہ سے جو عظیم اور عرش عظیم کا رب ہے، دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہیں شفا دے" تو اللہ اس کو اس مرض سے شفا دے گا۔

دعا کی جو شرطیں اور آداب ہیں ان کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

عن ابن عمرو قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا جاء الرجل یعود مریضا فلیقل: اللھم اشف عبدک ینکأ لک عدوا او یمشی لک الی جنازۃ [3]

عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی مریض کی عیادت کے لیے آئے تو اس کو کہنا چاہیے اے اللہ اپنے بندے کو شفا دے۔ یہ تیرے کسی دشمن کو قتل کرے گا یا تیری خوشنودی کے لیے کسی جنازے میں شریک ہوگا

---

[1] ایضاً بحوالہ مسلم و احمد و ترمذی

[2] ایضاً بحوالہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان و حاکم۔ [3] ابوداؤد۔ کتاب الجنائز

اس حدیث میں مریض کے آئندہ ہونے والے کسی عمل صالح کا حوالہ دے کر دعا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس طرح کی احادیث متعدد ہیں۔ ان سب کو جمع کرنا مقصود نہیں۔

مریض سے دل خوش کن باتیں

مریض کے سامنے ایسی باتیں کرنی چاہییں جن سے اس کا دل خوش ہو۔

ابو سعید رفعہ اذا دخلتم علیٰ مریض فنفسوا لہ فی اجلہ فان ذالک یطیب نفسہ[1]	حضرت ابو سعید خدری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم کسی مریض کے پاس جاؤ تو موت کے بارے میں اس کی فکر کو دور کرو۔ اس لیے کہ یہ بات اس کے دل کو خوش کرے گی۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مریض سے کہا جائے آپ فکر نہ کریں ان شاء اللہ آپ اچھے ہو جائیں گے۔ آپ زندہ رہیں گے تعلیم یہ دی گئی کہ مریض کے سامنے اس کے دل کو خوش کرنے والی باتیں کی جائیں۔ ایسی باتیں نہ کی جائیں جو اس کے دل کو تکلیف پہنچانے والی ہوں یا اس کے فکر و اندیشہ میں اضافہ کرنے والی ہوں۔ مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ عیادت کرنے والے شاید بے شعوری کی حالت میں اس تعلیم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں کسی کی عیادت کے لیے جاؤں اور اس سے کہوں کہ میرے فلاں عزیز اسی مرض میں مر گئے آپ خود غور کریں کہ اس بات سے مریض کا دل خوش ہوگا یا اس کے فکر و اندیشہ میں اضافہ؟

مریض کو خوش کرنے کی ایک عملی تدبیر یہ بھی بتائی گئی ہے:۔

ابو امامۃ رفعہ تمام عیادۃ المریض ان یضع احدکم یدہ علیٰ جبہتہ او قال علیٰ یدہ فسالہ کیف ھو؟[2]	ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ عیادت مریض کی تکمیل یہ ہے کہ تم میں کا کوئی شخص اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر یا یہ فرمایا کہ اس کے ہاتھ پر رکھے اور پوچھے کہ مزاج کیسا ہے؟

اس عمل سے مریض سمجھتا ہے کہ عیادت کرنے والا شخص اس کا ہمدرد اور بہی خواہ ہے اور وہ واقعی یہ چاہتا

[1] جمع الفوائد بحوالہ ترمذی [2] ایضاً

ہے کہ مریض کو صحت حاصل ہو جائے۔ اس خیال سے اس کا دل خوش ہوتا ہے۔

مریض سے دعا کی درخواست

پریشان حال لوگوں کی دعائیں اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔ حالت مرض میں مومن صابر کی طرف اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے اس لیے اس کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مریض سے دعا طلبی کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عودوا المرضی ومروھم فلیدعوا لکم فان دعوۃ المریض مستجابۃ وذنبہ مغفور[1]	انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مریضوں کی عیادت کرو اور ان سے کہو کہ وہ تمہارے لیے دعا کریں کیونکہ بیمار کی دعا قبول کی جاتی اور اس کے گناہ بخشے جاتے ہیں

جس شخص کے گناہ بخش دیے گئے ہوں۔ اس کی دعاؤں کی مقبولیت کی توقع بڑھ جاتی ہے۔

بلا ضرورت دیر تک بیٹھنا صحیح نہیں

عن انس قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم العیادۃ فواق ناقۃ ورواہ سعید ابن المسیب افضل العیادۃ سرعۃ القیام[2]	حضرت انس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ عیادت فواق ناقہ کے برابر ہونی چاہیے اور سعید بن المسیب کی روایت میں ہے کہ عیادت کا افضل طریقہ ہے کہ عیادت کرنے والا جلد اٹھ کھڑا ہو

دو بار اونٹنی کا دودھ دوہنے کے درمیان کی مدت کو فواق ناقہ کہتے ہیں۔ اس حدیث میں جو تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ عیادت کے موقع پر بلا ضرورت دیر تک مریض کے پاس بیٹھنا صحیح نہیں ہے بعض اوقات اس سے خود مریض کو تکلیف پہنچتی ہے اور بعض اوقات اہل خانہ کو زحمت ہوتی ہے۔ البتہ اگر مریض خود خواہش ہو اور اہل خانہ کو بھی کوئی زحمت نہ ہو تو دیر تک بیٹھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] الترغیب والترہیب بحوالہ طبرانی

[2] مشکوٰۃ۔ کتاب الجنائز بحوالہ بیہقی

دعوت میں حکمت و موعظت کا لحاظ

(سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

"اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ"
(النحل - ۱۲۵)

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہئیں۔ ایک حکمت، دوسرے عمدہ نصیحت ۔ حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بیوقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے۔ پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں ان کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی اور خیر خواہی چاہتا ہے۔

بحث و گفتگو کی نوعیت مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں، الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو، بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو، اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد، بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں زیادہ دور نہ نکل جائے۔

(بقیہ اشارات)

جس ذات گرامی پر فرار کا جاہلانہ الزام لگایا گیا ہے اس کی ہمت، جرأت اور شجاعت کے سچے واقعات بیان کیے جائیں اور اس ذات گرامی کے پیغام کو گھر گھر پہنچایا جائے۔

تنظیم جہاں، ترتیب جہاں تہذیب جہاں کا کام کرو
صحرا صحرا، گلشن گلشن پیغام محمدؐ عام کرو

حکومتی ہدایت کی دو قسمیں

دنیا میں مغربی سیاست پر مبنی جو حکومتیں قائم ہیں ان میں ایک ہمارے ملک کی حکومت بھی ہے۔ یہ جو ہدایتیں اور احکام دیتی ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں اور یہ دونوں قسمیں حکومت کے کارندوں پر خوب واضح ہیں ایک قسم وہ ہوتی ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے اور دوسری قسم پر عمل ضروری نہیں ہوتا۔ اقلیتوں کے بارے میں جو ہدایت دی جاتی ہے وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ اس ہدایت کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ اقلیتوں کو خوش کر کے ان کو فریب میں مبتلا کرنا اور دنیا میں نیک نامی حاصل کرنا۔

ضروری اعلان

اپریل اور مئی دو مہینے ساقط کر کے گزشتہ شمارہ جون ۸۳ء کا قرار دیا گیا تھا خریداروں کی مدت خریداری میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ یہ شمارہ جولائی ۸۳ء کا ہے۔ **منیجر زندگی**

پاکستان کے مسلمان معاشرے کی ایک جھلک

روزنامہ جنگ لاہور ۲۵ ۲ سنہ ۸۳ میں ایک خط چھپا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

"اوچ شریف (ضلع بہاولپور) کے ایک نواحی گاؤں میں ایک معزز زمیندار (جو ضلع کونسل بہاولپور کا ممبر بھی ہے) کے بیٹے کی رسم ختنہ پر ایک ستا صد کو ستر ہزار روپیہ بطور سلامی ملے۔ قریباً پانچ ہزار افراد چاروں صوبوں سے اس دعوت میں شریک ہوئے۔ ان میں سجادہ نشین، کونسلر اور بعض سرکاری افسر بھی شامل تھے۔ بہاولپور، سکھر، خان پور اور لاہور سے بھی "طائفے" منگوائے گئے تھے۔ یہ رقص و سرود تین دن رات تک جاری رہا۔ شخص مذکور کی زمینداری کا حال یہ ہے کہ غریب عوام اپنے جانوروں کی دم اور رسے پکڑ کر راتیں گذارتے ہیں۔ ان صاحب کے رقبہ سے گذرنے والے پانی کے نالوں اور راجباہوں سے چھوٹے زمینداروں کا پانی کاٹ لیا جاتا ہے۔ بیوروکریسی اور یہ ظالم اور عیاش وڈیرے (زمیندار) نہیں چاہتے کہ ملک میں اسلام نافذ ہو۔ مقامی اور ضلعی انتظامیہ اور پولیس سے ان وڈیروں کی ملی بھگت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے استحصال اور مظالم سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اکثر سجادہ نشین، زمیندار، جاگیردار، ان پڑھ، پس ماندہ، ضعیف الاعتقاد عوام کا استحصال اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ستم بالائے ستم اور انتہائی اندھیر یہ ہے کہ یہی طبقہ اسلام کا نعرہ لگانے میں پیش پیش ہے اور اپنے مخالفین پر فتووں کی بارش اس کا ایک اہم حربہ ہے۔ جب تک یہ طبقہ اپنے تمام عیوب کے ساتھ موجود ہے اور اس کو اپنی حرکات جاری رکھنے کے وسائل دستیاب ہیں، پاکستان میں نفاذ اسلام کے تذکرے اور اس کے وعدوں کو ایک سراب سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکے گی۔ ابولہب اور ابوجہل قسم کے لوگ اسلام کے نعرے لگائیں اور عوام کو لوٹتے رہیں۔ اس سے زیادہ اسلام کی توہین اور ملک و قوم کی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔

(ماہنامہ فیض الاسلام راولپنڈی مئی ۱۹۸۳ء)

رسائل و مسائل

رسم و رواج کی پابندی

(سیّد احمد قادری)

سوال ۱: ہمارے یہاں شادیوں میں رسم و رواج کی سخت پابندی کی جاتی ہے۔ یہاں ایک بارات صرف اس لیے واپس کر دی گئی کہ دولہا کے سر پر سہرا نہ تھا۔ گویا سہرے کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا لڑکی والوں کا یہ عمل صحیح تھا؟

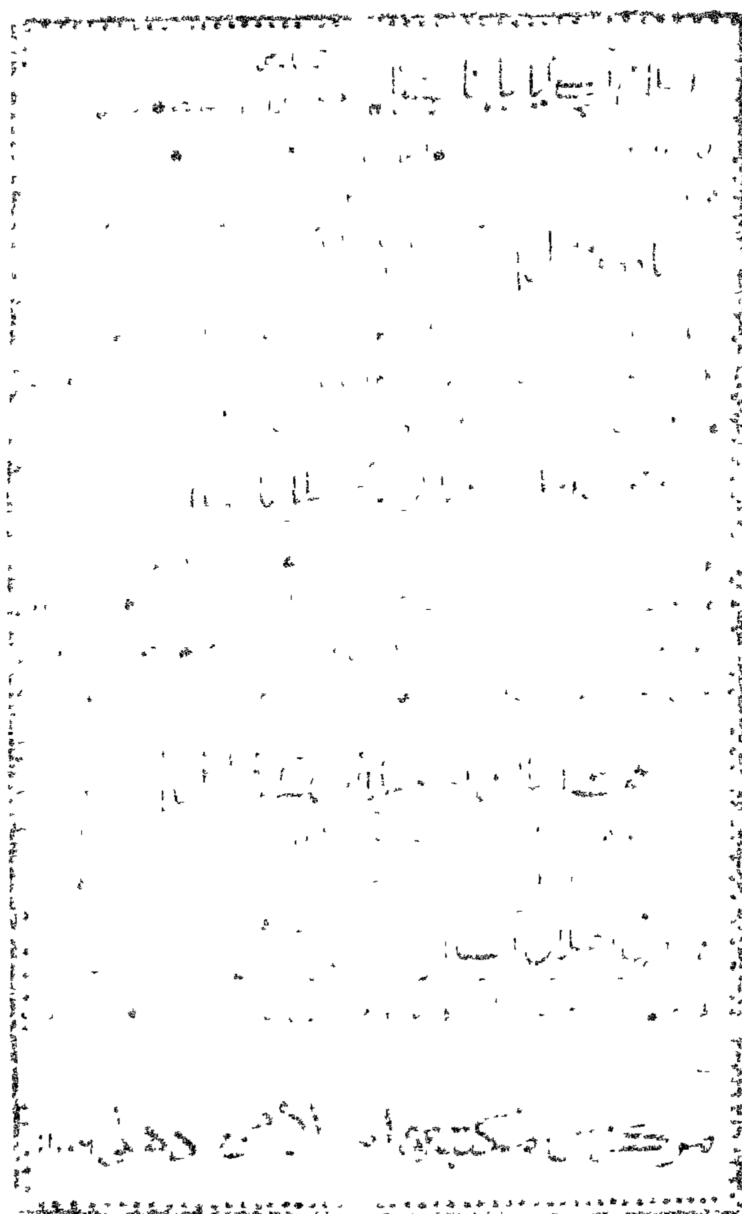
سوال ۲: یہاں ایک اور "بھات" کی رسم جاری ہے۔ شادی کے موقع پر یا کسی تقریب کے موقع پر بہن اپنے بھائی سے "بھات" کے نام پر کھانے کی دعوت وصول کرتی ہے اور یہ ایک لازمی چیز ہے۔ اس کا حکم کیا ہے؟

جواب: اصولی بات یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں اس کے صحیح ہونے کے لیے شریعت اسلامیہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ کسی معاملے میں اپنی طرف سے کوئی ایسی پابندی لگا لینا کہ اس کے بغیر وہ معاملہ ہو ہی نہ سکے، ناجائز ہے۔ مسلمانوں کو بدعات و خرافات سے اجتناب کرنا چاہیے۔ آپ کے دونوں سوالات کے مختصر جوابات یہ ہیں۔

۱۔ سہرے کی رسم ہندوستان میں ایجاد کی گئی ہے۔ پورے ہندوستان میں رائج ہے یا نہیں؟ اس کا علم نہیں لیکن یوپی اور بہار میں رائج ہے۔ عرب کے لوگ شاید اس رسم سے واقف بھی نہ ہوں گے۔ اس رسم کی اتنی پابندی کہ برات واپس کر دی جائے، دین سے ناواقفیت اور محض جہالت ہے۔ اس نامعقول رسم کو بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ مرد کے چہرے پر نقاب ایک عجیب مہمل چیز ہوتی ہے۔

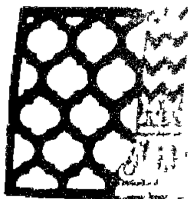
۲۔ کسی سے لازمی طور پر دعوتِ طعام (کھانے کی دعوت) کا مطالبہ کرنا اور اس کو لازمی رسم بنا لینا ناجائز ہے۔ اس رسم کو بھی ترک کر دینا چاہیے۔

نوٹ:۔ شادی اور غمی کے مواقع پر جو بدعات اور غلط رسوم رائج ہیں ان کو ختم کرنے میں نرمی اور حکمت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ زور زبردستی سے معاملہ کچھ اور زیادہ بگڑ جاتا ہے۔ ان رسموں کے شرعاً ناجائز ہونے کے ساتھ ساتھ اب تو یہ اقتصادی طور پر بھی یہ رسمیں تباہ کن بن گئی ہیں۔



MONTHLY ZINDAGI

R N I 2188 57
MRD 66
JULY 83





ماہنامہ

زندگی

رامپور

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 30/-
ششماہی
ہندوستان سے 15/
قیمت فی پرچہ
3/-

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بذریعہ ہوائی جہاز
100/
بذریعہ بحری جہاز
60/-

جلد:- ۷۱ | شوال المکرم ۱۴۰۳ھ مطابق اگست ۸۳ء | شمارہ:- ۲

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں اگر آپ کی طرف سے پرچہ بند کرنے کے لئے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

منیجر زندگی رامپور۔ یوپی

مالک دعوت ٹرسٹ، ایڈیٹر سید احمد عروج قادری، پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ زندگی رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

وہ کون ہے جو انسان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ :۔

اپنی آنکھوں سے سینما کے پردوں اور ٹی وی کی پلیٹوں پر عریاں مناظر دیکھے، خوبصورت عورتوں پر بری نگاہیں ڈالے تاک جھانک کرے، بل کھاتے ہوئے جسموں کے رقص اور فحش تصویریں دیکھے گندے افسانے اور اخلاق کو تباہ کرنے والی کتابیں پڑھے اور موقع ملے تو بدکاری سے بھی نہ چوکے

وہ کون ہے جو انسان کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ :۔

اپنے کانوں سے گندے فلمی گانے سنے، شہوت انگیز غزلیں اور نظمیں سماعت کرے، فتنہ انگیز تقریریں اپنے دل میں اتارے۔

کون ہے وہ جو انسان کو اکساتا ہے کہ وہ :۔

اپنے ہاتھوں سے کمزوروں کو ستائے، ان کے گالوں پر طمانچے مارے، ان کے سروں پر لاٹھیاں برسائے، ان کے سینوں میں گولیاں پیوست کرے، ان کی جان لے لے، ان کے مال لے اڑے، شریفوں کی پگڑیاں اچھالے۔

وہ کون ہے کہ جو انسانوں کو اکساتا ہے کہ وہ

اپنی ٹانگوں سے سینما گھروں کی طرف جائے، قحبہ خانوں کی سیر کرے، میکدوں میں جا گھسے، اپنے گھر سے چوری کرنے یا ڈاکہ مارنے کے ارادے سے نکلے۔

کون ہے وہ جو انسانوں کو اکساتا ہے کہ وہ :۔

اپنی زبان سے گالی بکے، جھوٹ بولے، غیبت کرے، بہتان جوڑے، چغلی کھائے، ٹھٹھے مارے،

بیہودہ گوئی کرے۔

کون ہے وہ جو انسان کو اکساتا ہے کہ وہ

اپنے دماغ سے فتنہ و فساد پھیلانے کے منصوبے سوچے۔ نقشے بنائے۔ طرح طرح کے ڈھونگ رچانے کی باتیں سوچے۔ بے قصور لوگوں کو بدنام کرنے کے لیے الزامات و اتہامات کے جال بنے۔ اپنے فرائض انجام نہ دینے کے الزام سے بچنے کے لیے طرح طرح کے بہانے تراشے۔ قسم قسم کے جھوٹ سجائے۔ حلال و حرام کی تمیز اٹھا کر مال کمانے کی تدبیریں سوچے۔ جرائم کی یہ مختصر فہرست نمونے کے طور پر ہے۔

کون ہے وہ جس کے جرائم کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے دماغ پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ مئی جون کی چلچلاتی دھوپ کی طرح اس کا جواب صاف و شفاف ہے۔ یہ سب سے بڑا مجرم، یہ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن انسان کے باہر نہیں اس کے اندر ہی ہے یعنی نفس امارہ ہے جو برائیوں کی تلقین و ترغیب جس کی جبلت میں داخل ہے اور جو ابلیس و ذریت ابلیس کا سب سے بڑا ایجنٹ ہے۔

نفس کی کاٹ اتنی تیز ہے کہ کریم بن کریم بن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کو اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے یہ فریاد کرنی پڑی۔

"اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔" (یوسف: ۳۳)

اور حضرت یوسف علیہ السلام ہی کو یہ بھی کہنا پڑا تھا:

میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب غفور و رحیم ہے۔ (یوسف: ۵۳)

"تزکیہ و تربیت" کا حاصل یہی ہے کہ انسان اپنے سرکش نفس کے منہ میں تقویٰ کی خاردار لگام ڈال دے اور اس کی باگ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر ہر وقت چوکنا رہے۔

یہ شمارہ تربیتی مقالات نمبر ہے۔ اس میں دو طویل تربیتی مقالے شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ مقالے امرائے حلقہ جات اور ناظمات کے اجتماعات کے لیے جو مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں مئی ۱۹۸۳ء کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوئے تھے لکھے گئے اور ان میں پڑھ کر سنائے گئے۔

سلام وجواب سلام

(سید احمد قادری)

"عیادت" کے عنوان سے چند احادیث ایک مختصر مضمون کی شکل میں گذشتہ شمارے میں پیش کی گئی تھیں۔ اس تازہ شمارے میں سلام وجواب سلام سے متعلق چند احادیث ایک مختصر مضمون کی شکل میں پیش کی جارہی ہیں۔ بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق کا اور ایک دوسری حدیث میں چھ حقوق کا اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث میں سات حقوق کا ذکر ہے۔ ہمارے سامنے یہی سات حقوق والی حدیث ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان ساتوں حقوق کی مختصر تشریح سامنے آجائے اور ہم ان حقوق کو ادا کرنے کی سعی کریں۔ حضرت براء کی حدیث میں سات مامورات اور سات منہیات وممنوعات کا ذکر ہے۔ پہلے ان امور کا ذکر ہے جن کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان امور کا ذکر ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ ہم اس کے پہلے حصہ کا ترجمہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب کی حدیث

سوید بن المقرن قال	سوید ابن مقرن نے کہا کہ میں براء بن عازب
دخلت علی البراء بن عازب	کے پاس گیا اور ان کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ
فسمعته یقول امرنا رسول	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بسبع	چیزوں کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع
ونہانا عن سبع۔ امرنا	کیا ہمیں حکم دیا۔ مریض کی عیادت کا،

بعیادۃ المریض و اتباع	جنازے کی شرکت کا ۔ چھینکنے والے کو دعا
الجنازۃ و تشمیت	دینے کا ۔ قسم دینے والے کی قسم کو پورا کرنے
العاطس و ابرار المقسم	کا ۔ مظلوم کی مدد کرنے کا ۔ دعوت دینے
و نصر المظلوم و اجابۃ	والے کی دعوت قبول کرنے کا اور سلام
الداعی و افشاء السلام[1]	کو پھیلانے کا ۔

اس حدیث کی بعض روایتوں میں افشائے سلام کے بجائے جواب سلام کا ذکر ہے ۔ گزشتہ شمارے میں عیادت کے بیان میں جن حدیثوں کے ترجمے پیش کیے گئے ہیں ان میں بھی ردِ سلام (سلام کا جواب دینا) کا ذکر ہے ۔ امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے کہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ابتداءً سلام کرنا سنت اور سلام کا جواب دینا واجب ہے ۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا اگر سنت ہے تو سنت موکدہ سے کم نہیں ہے ۔

سلام کا عموم اور اس کا رواج

مسلم معاشرے میں سلام کو عام ہونا چاہیے ۔ مرد ہوں یا عورتیں یا ذی شعور بچے ۔ سب کو سلام کرنا چاہیے ۔ نیز یہ کہ سلام کرنے کے لیے پہلے سے جان پہچان بھی ضروری نہیں ہے ۔ جس مسلمان سے ہمارا تعارف نہ ہو اس سے ملاقات کے وقت بھی اس کو سلام کرنا چاہیے ۔ البتہ جو مسلمان علانیہ فسق و فجور میں مبتلا ہو اس کو ابتداءً سلام نہ کرنا چاہیے ۔ وہ سلام کرے تو جواب دے دینا چاہیے ۔

عن عبد اللہ بن عمرؓ ان	عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت
رجلا سال رسول اللہ صلی	ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
اللہ علیہ وسلم ای الاسلام	وسلم سے پوچھا کہ اسلام کی کونسی خصلت
خیر؟ قال تطعم الطعام و	بہتر ہے ۔ آپ نے فرمایا یہ کہ تم کھانا کھلاؤ
تقرء السلام علی من عرفت	اور سلام کرو جس کو تم جانتے پہچانتے ہو اس کو
و من لم تعرف[2]	بھی اور جس کو نہیں جانتے اس کو بھی

[1] مسلم شریف ۔ کتاب اللباس والزینۃ ۔ باب تحریم استعمال اناء الذہب والفضۃ
[2] ابوداؤد ۔ کتاب الادب ۔ باب افشاء السلام ۔ بخاری کتاب الاستیذان

یہ حدیث الترغیب و الترہیب میں بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ اس متفق علیہ حدیث سے سلام کا عموم اس حیثیت سے معلوم ہوا کہ ابتداً سلام کرنے کے لیے پہلے سے تعارف ضروری نہیں ہے۔

عمار بن یاسر: ثلاث من الایمان الانفاق من الاقتار و بذل السلام للعالم و الانصاف من نفسک [1]	حضرت عمار بن یاسرؓ نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تین چیزیں ایمان کے خصائل میں ہیں۔ تنگ روزی میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔ بلا تخصیص سلام کرنا، اپنے آپ سے انصاف کرنا۔

علامہ ابن قیم نے یہ حدیث امام بخاری کے حوالے سے نقل کی ہے:۔

و قال البخاری فی صحیحہ قال عمار ثلاث من جمعهن فقد جمع الایمان۔ الانصاف من نفسک و بذل السلام للعالم و الانفاق من الاقتار [2]	اور بخاری نے اپنی صحیح میں کہا عمار نے کہا تین باتیں ایسی ہیں کہ جس نے ان کو اپنے اندر جمع کر لیا اس نے ایمان کی خصلتوں کو جمع کر لیا۔ اپنے نفس سے انصاف کرنا، بلا تخصیص سب کو سلام کرنا اور بحالت تنگ دستی راہ خدا میں خرچ کرنا

انھوں نے اس حدیث کی ایک جامع تشریح بھی کی ہے۔ ہم صرف "بذل السلام للعالم" کی تشریح نقل کرتے ہیں:۔

و بذل السلام للعالم يتضمن تواضعه و انه لا يتكبر على احد بل يبذل	سب کو سلام کرنا سلام کرنے والے کے تواضع کی علامت ہے یعنی کسی کے مقابلہ میں بھی اپنے کو بڑا نہیں سمجھتا بلکہ نیچے

---

[1] جمع الفوائد بحوالہ بزار باب خصال الایمان و آیاتہ

[2] ابن قیم زاد المعاد ج ۲ ص ۷۷، المطبعۃ المیمنۃ مصر

السلام للصغير والكبير والشريف والوضيع و من يعرفه ومن لا يعرفه المتكبر ضد من ألا يرد السلام على كل من سلم عليه كبراً منه ونيها فكيف يبذل السلام لكل احد ؀

بوڑھے، معاشرے میں ذی عزت اور کم رتبہ سب کو سلام کرتا ہے اسی طرح وہ اس شخص کو بھی سلام کرتا ہے جس کو جانتا ہے اور اس کو بھی جس کو نہیں جانتا۔ اور متکبر اس کی ضد ہوتا ہے وہ ہر سلام کرنے والے کو سلام کا جواب بھی نہیں دیتا۔ کبر و نخوت کی وجہ سے تو ایسا شخص ہر ایک کو سلام کس طرح کر سکتا ہے۔

امام ابن قیم نے یہ ایک تجربے کی بات لکھی ہے میں نے بعض علم دین رکھنے والے اشخاص کو دیکھا ہے کہ وہ سلام کے جواب میں محض اپنی گردن ہلا دیتے ہیں۔ یہ بات عام طور پر کسی نہ کسی قسم کے گھمنڈ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ (اعاذنا اللہ منہا) بہرحال اس حدیث سے سلام کا عموم بھی ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی کہ سلام کرنا ایمانی خصائل میں سے ایک خصلت ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کے بارے میں ابو نعیم نے اپنی رائے یہ دی ہے۔

وقد تضمنت هذه الكلمات اصول الخير وفروعه ؀

ان کلمات نے خیر کے اصول و فروع کو جمع کر لیا ہے۔

عن ابی یوسف عبد الله بن سلام رضی الله عنه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول يا ايها الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا بالليل والناس نيام تدخلوا الجنة بسلام ؀

ابو یوسف عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ اور کھانا کھلاؤ اور رات کو جب لوگ سو رہے ہوں تم تہجد کی نماز پڑھو۔ اس کے صلے میں تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے

؀ ایضا ؀ ایضا ؀ الترغیب و الترہیب رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم جہنم سے بچا لیے جاؤگے اور جنت میں داخل کر دیے جاؤگے۔

سلام کا مفہوم

جب ہم کسی مسلمان فرد یا جماعت کو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہتے ہیں تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی ایک روایت ہے۔

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال السلام اسم من اسماء اللہ تعالیٰ وضعہ فی الارض فافشوہ بینکم فان الرجل المسلم اذا مر بقوم فسلم علیہم فردوا علیہ کان لہ علیہم فضل درجۃ بتذکیرہ ایاھم السلام فان لم یردوا علیہ رد علیہ من ھو خیر منھم [شہ]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس کو اس نے زمین میں قائم کیا ہے۔ تو تم اس کو اپنے درمیان پھیلاؤ اور رواج دو ایک مسلمان جب کسی جماعت کے پاس سے گزرتا ہے اور ان کو سلام کرتا ہے اور جماعت کے لوگ اس کو جواب دیتے ہیں تو اس کو ایک درجہ ان پر فضیلت حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس نے ان کو سلام کی یاد دہانی کی اور اگر وہ جواب نہیں دیتے تو ان کو وہ جواب دیتا ہے جو ان لوگوں سے بہتر ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب الاستیذان میں ایک ترجمہ باب "السلام من اسماء اللہ" قرار دیا ہے اس پر حاشیہ میں محشی نے عینی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ امام بخاری نے یہ حدیث "الادب المفرد" میں حضرت انس رضی سے مرفوعاً روایت کی ہے بزار نے حضرت ابن مسعودؓ سے اور (باقی بر صفحہ ۵۴)

[شہ] الترغیب ج ۳ مطبوعہ دار الفکر رواہ البزار والطبرانی واحد اسنادی البزار جید قوی وفی مجمع الفوائد بحوالہ بزار والطبرانی فی الکبیر۔

تدبر قرآن پر ایک نظر

(مولانا جلیل احسن ندویؒ)

مولانا اصلاحی صاحب نے بقرہ آیت ۹۷ تا ۱۰۳ (قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ ـــ كَانُوا يَعْلَمُونَ) کی تفسیر کے تمہیدی نوٹ میں یہ لکھا ہے:۔

"آگے یہود کی اس قرآن دشمنی کی مزید تفصیل کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا کہ یہود اس دشمنی میں اللہ، اس کے ملائکہ، اس کے انبیاء اور جبرئیل و میکائیل کے دشمن بن گئے ہیں اور اس طرح انھوں نے خدا کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ (تدبر ص ۲۳)

اور توضیح کرتے ہوئے یہ لکھا:۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہود قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے یہود کے علماء اور لیڈروں کو جب اندیشہ ہوا ہو کہ قرآن کی دعوت ان کے عوام کو کہیں متاثر نہ کر دے تو انھوں نے یہ شوشہ چھوڑا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ان کے اپنے بیان کے مطابق جبریل فرشتہ آتا ہے اور یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے اور ہمارے اوپر فلاں فلاں آفتیں اسی کے ہاتھوں آئیں۔ اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتے سے سازباز ہے۔" (تدبر اول ص ۲۳۵)

غرض ہے کہ مولانا کو یہ شان نزول بنانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور یہود کبھی جبرئیل و میکائیل کے دشمن نہ تھے، نہ کل تھے اور نہ آج ہیں۔ یہ دونوں فرشتے ان کے نہایت محبوب اور معزز فرشتے ہیں، انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ جبرئیل ہمارے دیرینہ مخالف ہیں اور انھوں نے ہم پر فلاں فلاں آفتیں

دکھائی ہیں۔ یہاں تو ذکر ہو رہا ہے ان کی قرآن دشمنی کا انھیں بتایا جا رہا ہے کہ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جب تم قرآن اور نبی کے دشمن ہوئے تو تم جبرئیل کے دشمن ہوئے، اور جب تم اللہ کے دشمن ہوئے تو اس کے تمام فرشتوں کے دشمن ہوئے۔ اس پیغمبر کا انکار تمام رسولوں کے۔ جن میں موسیٰؑ بھی ہیں انکار کے ہم معنے ہے اور اس قرآن کا انکار، تمام آسمانی کتابوں ــ جن میں تورات بھی ہے ــ کے انکار کے مترادف ہے۔ پس یہ صرف قرآن کا انکار نہیں ہے، بلکہ اس کے تمام فرشتوں، تمام انبیاء اور جملہ آسمانی کتابوں سے تمہارے تعلق کو ختم کر دینے والا ہے۔ سب سے تمہارا رشتہ منقطع ہو جائے گا اور اس طرح خدا سے دشمنی کر کے خدا کو اپنا دشمن بنا لیے گے اور خدا جس کا دشمن ہو گیا اس کا بھلا کہاں ٹھکانا ہو گا۔ غرض یہ کہ یہ شان نزول بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، خود قرآن اپنا شان نزول ہے۔ استدلال کی عبارت عربی میں یوں بنے گی۔ من کان عدوًّا للقرآنِ فھو عدو لجبریل، عدو لمیکال، عدو للملٰئکۃ اجمعین۔ عدوٌ لجمیع الرسل عدو لکل کتاب سماوی۔ مولانا نے مَنْ کَانَ کا جواب شرط "تو اسے جان لینا چاہیے" بنایا ہے اس سے اچھا جواب شرط یہ ہے" تو اس خدا کا دشمن ہے" اور فَاِنَّہٗ اس محذوف جواب شرط کی علت ہے۔ چنانچہ بعد کی آیت اس پہلی آیت کی توضیح کرتی ہے۔ قارئین کی آسانی کے لیے ان دونوں کا توضیحی ترجمہ یہ ہے:۔

> "آپ اے پیغمبر! دشمنانِ قرآن یہود سے کہہ دیجیے کہ جو لوگ جبرئیل (قرآن والے) کے دشمن ہوں گے تو وہ خدا کے دشمن ہوں گے۔ اس لیے کہ جبرئیل نے قرآن کو آپ کے قلب پر اتارا ہے۔ خدا کے حکم سے، حال یہ کہ یہ مطابق ہے ان پیشین گوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہے اہل ایمان کے لیے، جو اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کے دشمن ہوئے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے اور جن کا دشمن اللہ ہو اس کے حصہ میں ذلت و خواری ہی آئے گی۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۰۲ کے ابتدائی ٹکڑے (وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّیَاطِیْنُ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ) کا ترجمہ یہ کیا ہے:۔" اور ان چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمانؑ کے عہدِ

حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے" اور تفسیر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں :۔

اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک کر جس چیز کو انھوں نے سینہ سے لگایا، یاس کا بیان ہے۔ قرآن مجید میں شیاطین سے متعدد جگہ جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کے مفسدین اور اشرار مراد لیے گئے ہیں، ہمارے نزدیک یہاں بھی دونوں ہی کے اشرار مراد ہیں۔ علیٰ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ سے مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کا زمانہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق یہاں ایک مضاف محذوف ہے یعنی علی عہدِ مُلْكِ سلیمان، آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں نے کتاب الٰہی کو تو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور سحر و شعبدہ اور علم نجوم وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کو جو سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں جنوں اور ان کی پیروی کرنے والے انسانوں کے باہمی اشتراک سے رواج پائے۔ اس کی جگہ اختیار کر لیا۔

اور مزید لکھتے ہیں :۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے روحانی علوم کے مقابلے کے شوق میں، شیاطین جن و انس کے ایک طبقہ میں سحر و ساحری کے سیکھنے سکھانے کا رواج بہت بڑھ گیا تھا اور ان مفسدین نے اپنے ان علوم کو مرتب و مدون بھی کر ڈالا تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب یہود دینی و اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوئے اور کتاب و سنت کا ذوق ان کے اندر مردہ ہوا تو قدرتی طور پر اس طرح کی مزخرفات کے سیکھنے سکھانے میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا تھا اور جیسا کہ قاعدہ ہے ان چیزوں کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے وہ ان کو براہ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب بھی کرتے رہے ہوں گے اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بنانے کے لیے یہ دعوے بھی کرتے رہے ہوں گے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انہیں علوم کے ذریعے وہ کارنامے انجام دیتے رہے ہیں جو ان کی طرف منسوب ہیں۔

(تدبر اول صفحہ ۲۳۸)

مولانا کے جن جملوں کو ہم نے زیر خط کیا ہے وہ ٹھیک بات ہے، تب تو انھوں نے جو ترجمہ کیا ہے وہ غلط ہے، یہ بات بھی بالکل غلط ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت الٰہیہ میں ان کے روحانی علوم کے

مقابلہ کرنے کا شوق شریر جنوں اور شریر انسانوں کے اندر پیدا ہوا اور انھوں نے جادو کے ذریعہ مقابلہ کیا۔ سلیمان خدا کے رسول تھے، خدا کے بندے تھے۔ اوّاب تھے، وہ کتاب وحکمت کے علمبردار تھے۔ وہ کتاب وسنت کو رواج دینے والے تھے، کافر جنوں سے تعمیرات اور سمندروں سے موتی نکالنے کے لیے ان کو غوطہ خوری کے کام میں لگاتے اور سرکش جنوں کو جیل میں ڈال رکھا تھا۔ زنجیروں میں باندھ کر کسی بدمعاش جن کی مجال کہاں کہ وہ ان کی مملکت میں سحر کا رواج دیتے۔ جب کہ ساحر ان کی کتاب تورات کی رو سے واجب القتل ہے۔ غرض ان کے عہدِ مبارک میں ساحری کے رواج پانے کی بات بالکل غلط ہے اور شیاطین سے مراد عہدِ سلیمانی کے جن وانس ہیں۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ یہ شیاطین قرآن کے معاصر یہود ہیں اور علیٰ کے معنے (پر) آتے ہیں اس کو "میں" کے معنے میں کیوں لیتے ہیں؟ علیٰ اصلاً بنایا گیا ہے پر کے معنے دینے کے لیے جب عبارت میں علیٰ کے اصلی معنے نہیں تب فی کے معنے میں لیجیے اور تتلوا کے صلے میں علیٰ نہیں آتا اور اللہ کی اس آیت میں علیٰ ہے اور کسی کو کوئی چیز پڑھ کر سنائیں تب علیٰ آئے گا اور وہ داخل ہوتا ہے ان پر جنھیں سنایا جائے اور یہاں اقتدار سلیمانی ایسی چیز نہیں جس کو پڑھ کر سنایا جائے۔ پس یہ واضح دلیل ہے کہ یہاں تضمین کا اسلوب کام کر رہا ہے۔ یہ علیٰ متعلق ہے قائلین یا مفترین کے اور صحیح ترجمہ یہ ہوگا۔

"لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لیکر پیش کیا کرتے تھے۔"

(تفہیم اول ص۹۷، مرکزی مکتبہ مطبوعہ ۱۹۶۱ء)

اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ ترجمہ کیا۔

اور مولانا اصلاحی صاحب نے تشریح میں جس کا ایک حصہ ہم اوپر پیش کر آئے ہیں، جو کچھ کہا ہے وہ اسی ترجمہ کا تقاضا کرتا ہے۔ امید ہے کہ وہ اپنا ترجمہ نظرِ ثانی کے وقت بدل دیں گے۔

مولانا اصلاحی صاحب بھی عام مترجمین کی طرح ہر جگہ لَو کا ترجمہ "کاش کہ" سے کرتے ہیں۔ یہاں آیت ۱۰۲ و ۱۰۳ کے آخری جملہ کا ترجمہ "کاش کہ وہ اس کو سمجھتے" ہی کیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی اس کی وجہ یہ ہے کہ لو بنایا گیا ہے اصلاً شرطیت کے لیے یعنی اگر کے معنے دینے کے لیے اور اگر موقع حسرت کا ہو یا وَدَّ، اَحَبَّ یا اس کے ہم معنے الفاظ کے بعد آئے تب تمنا یہ بنتا ہے اور وہاں "کاش کہ" سے ترجمہ کرنا صحیح ہوگا۔ ایسے مواقع پر اگر کا ترجمہ غلط ہوگا۔ غور کیجیے یہاں متکلم اللہ تعالیٰ

ہے اسے ان دانستہ غلط کار لوگوں کے سلسلے میں اسے تمنا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا قانون اٹل ہے۔ ہدایت اور ضلالت کا قانون بنا دیا ہے خیر و شر کی راہیں واضح کر دی ہیں جس کا جی چاہے جنت کی راہ پکڑے اور جس کا ارادہ ہو جہنم میں جانے کا ہو وہ جہنم میں جائے۔ خدا کو کاش کہنے کی کیا ضرورت، کوئی کہہ سکتا ہے۔ خدا رحمٰن و رحیم ہے اسے کیوں نہ تمنا ہوگی۔ کاش یہ جنت کی راہ پر چلتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک خدا رحمٰن و رحیم ہے مگر جان بوجھ کر جہنم میں جانے والوں کے لیے وہ رحمٰن و رحیم نہیں ہے ایسے لوگوں کے لیے تو وہ غضبان اور منتقم ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہاں اور دوسری ایسی ہی جگہوں پر لَو اگر کے معنے میں لے کر ترجمہ یوں کیا جائے۔

"اگر یہ لوگ جانتے ہوتے کہ صحیح راہ اختیار کرنے پر خدا انہیں کتنے انعام سے نوازے گا تو سحر و ساحری سے دست کش ہو جاتے اور کتاب کی پیروی کرتے"

سورہ بقرہ آیت ۱۶۷ میں لو تمنا ہی ہے، وہاں لو شرطیہ نہیں بن سکتا۔ پیرو لوگ کہیں گے۔ "کاش ایک بار دنیا میں ہم واپس کر دیے جاتے تو اپنے ان لیڈروں سے اظہار بے تعلقی کرتے جس طرح انھوں نے ہم سے بے تعلقی کی روش اختیار کی ہے اس طرح کے بہت سے مقامات ہیں جہاں لو تمنا ہی کے لیے آیا ہے، وہاں شرطیہ نہیں بن سکتا۔ غرض جہاں لو شرطیہ (اگر کے معنے میں) بنے وہاں لو شرطیہ ہی بننا چاہیے۔

منیجر زندگی کا پتہ

۱۵۲۵ محلہ سوئی والان۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایڈیٹر زندگی کا پتہ

دفتر ماہنامہ "زندگی" گھیر سیف الدین خاں۔ رامپور۔ یوپی۔
پن کوڈ ۲۴۴۹۰۱

سرگرمِ عمل رہنے کی چند شخصی و جماعتی تدابیر

(سید احمد قادری)

یہ مقالہ امرائے حلقہ اور نظماء کے تربیتی اجلاس منعقدہ ۵ مئی ۱۹۸۳ء بمقام مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی کے لیے لکھا گیا اور اس میں پڑھ کر سنایا گیا۔

اس مقالہ کے دو حصے ہیں۔ تمہیدی حصہ اور تدابیر کا حصہ۔ تمہیدی حصے میں بعض باتوں کی توضیح بظاہر عنوان مقالہ سے غیر متعلق معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع وہ غیر متعلق نہیں ہے بلکہ دونوں حصے مربوط ہیں۔

جماعتوں اور تنظیموں کو اپنے کارکنوں کی بے عملی اور سرد مہری کا مرحلہ بھی پیش آتا ہے اور ذہنوں میں یہ سوال آنے لگتا ہے کہ ان کو سرگرم رکھنے کی تدابیر کیا ہیں؟ تحریک اسلامی جس کا نصب العین اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے عظیم ترین نصب العین ہے اور جو انسان کا اپنا مقرر کردہ نہیں ہے بلکہ رب العلمین کا عائد کردہ نصب العین ہے۔ اگر اس نصب العین کے حامل کارکنوں میں سرد مہری، بے عملی اور تعطل کی کیفیت پیدا ہو جائے تو بلا شبہہ یہ ایک نہایت تشویش انگیز مسئلہ بن جاتا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے وقت اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ سرگرمی عمل کا اصل محرک کیا اور کہاں ہوتا ہے تو مرض کی تشخیص میں آسانی ہوگی۔ اور پھر علاج بھی آسان ہوگا۔

عملی سرگرمی کا اصل محرک

ایک کاشتکار ہے کہ جب کھیت جوتنے اور بیج ڈالنے کا وقت آتا ہے تو وہ صبح ہی صبح کھیت جوتنے کا سامان لیکر اپنے کھیت پر پہنچ جاتا ہے اور پھر خارج کی کوئی زحمت اس کو اپنے کام سے باز نہیں رکھتی

چلچلاتی دھوپ ہو یا کڑکڑاتی سردی، دھواں دھار بارش ہو یا دماغ کھولا دینے والا حبس، وہ اپنے کام میں جٹا رہتا ہے۔ کھیت جوتنے کے وقت کھیت جوتتا ہے۔ بیج ڈالنے کے وقت بیج ڈالتا ہے۔ پانی دینے کے وقت کھیت کو سیراب کرتا ہے۔ کیڑے مارنے کی دوائیں چھڑکتا ہے۔ گھاس پھوس اگ آئے تو نرائی کراتا ہے۔ کھیت جوتنے کے وقت سے فصل پکنے، اس کو کاٹنے، کھلیان میں جمع کرنے، اس کو صاف کرنے اور پھر اپنے کھتے بھر لینے تک وہ مسلسل سرگرم رہتا ہے۔ اس کاشتکار کو سرگرم رکھنے کے لیے خارج میں کوئی تدبیر اختیار نہیں کی جاتی۔ پھر وہ کون سا محرک ہے اور کہاں ہے جو اس کو خود بخود سرگرم رکھتا ہے؟

ایک تاجر ہے جو وقت پر اپنی دکان کھولتا ہے۔ کوئی ملازم نہ ہو تو خود ہی دکان صاف کرتا ہے، چیزیں قرینے سے سجاتا ہے اور پھر دن بھر مشغول رہتا ہے۔ سامان تجارت خریدنے اور اس کو اپنی دکان تک پہنچانے میں غفلت نہیں برتتا۔ وہ فارغ اوقات میں بھی اپنے کاروبار کو ترقی دینے کی فکر سے خالی نہیں رہتا۔ وہ کون سی چیز ہے اور کہاں ہے جو اس کو کسی خارجی تدبیر کے بغیر خود بخود متحرک رکھتی ہے۔

ایک صانع ہے، کارخانہ دار ہے جو اپنی صنعت اور اپنے کارخانے کو فروغ دینے کے لیے رات دن ایک کر دیتا ہے اور وہ سب کچھ کرتا ہے جو اس کے لیے ضروری ہو۔ انسانی زندگی کے بہت سے شعبے ہمارے سامنے روز و شب یہ مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ وہ کون سی قوت محرکہ ہے جو ان سب کو کسی خارجی تدبیر کے بغیر خود بخود متحرک اور سرگرم رکھتی ہے؟ کیا اس سوال کے جواب کے لیے کسی صغریٰ اور کبریٰ کی ضرورت ہے؟ کسی منطقی خارمولے سے جواب طلب کرنے کی حاجت ہے؟ وہ محرک جو ان سب کو متحرک رکھتا ہے کہیں خارج میں نہیں بلکہ ان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اور وہ یہ یقین ہے کہ اگر وہ سرگرم عمل نہ ہوں، ملمبی تان کر سوتے رہیں تو دو وقت کی روٹی بھی انہیں نہیں مل سکتی۔ انہیں اپنی مادی ضرورت کا احساس انہیں نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ کاشتکار کے دل میں یہ زندہ یقین موجود رہتا ہے کہ اگر اس نے روز و شب محنت نہ کی تو نہ لہلہاتے ہوئے کھیت کی سبزی اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا سکتی اور نہ پکی ہوئی فصل کی زردی اس کے دل کو تقویت دے سکتی اور نہ گھر میں غلے کا انبار اس کے دل کا سکون بن سکتا ہے۔ ایک مسلمان کاشتکار یقین رکھتا ہے کہ اگر وہ سوتا رہا تو اپنے کھیت کا وہ منظر نہیں دیکھ سکتا جس کا نقشہ جگہ جگہ قرآن کریم نے کھینچا ہے

> اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے۔ پھر جہاں ہم نے مینھ برسایا کہ وہ لہلہانے لگی، پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی (الحج ۵)

کاشتکار کو یقین ہے کہ اگر وہ سرگرم عمل نہ رہا تو اس کی کیفیت بقول سعدی شیرازی یہ ہوگی۔

شب چو عقد نماز بر بندم ۔ چہ خورد بامداد فرزندم

(ترجمہ) شب کو جب میں نماز کا تحریمہ باندھتا ہوں تو دل اس فکر میں پھنسا ہوتا ہے کہ صبح کو میرا فرزند کیا کھائے گا۔

دو وقت کی روٹی کے لیے یہ سرگرمی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے۔ جب انسان صرف روٹی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ پلاؤ قورمے اور مرغ و ماہی سے اپنے کام و دہن کو محظوظ کرنا چاہتا ہے۔

پیٹ بھرنے یا لذت کام و دہن کے لیے دنیا کی زراعت و تجارت اور دوسرے ذرائع معاش میں یہ سرگرمی دن رات نہ صرف ہماری نگاہوں کے سامنے ہے بلکہ ہم خود اس کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

اب اگر اقامت دین کے عظیم نصب العین کے حصول کے لیے میں سرگرم عمل نہیں ہوں تو میری بیماری کی تشخیص میں کیا دشواری ہے۔ یقیناً میں ضعف یقین یا بالفاظ دیگر ضعف ایمان کی بیماری میں مبتلا ہوں اگر میرے دل میں یہ زندہ یقین موجود ہوتا کہ دنیا مزرع آخرت ہے اور اس کھیت میں گیہوں جو اور چاول نہیں ڈالے جاتے، بلکہ تقویٰ، طہارت اور عبادت کے بیج ڈالے جاتے ہیں اور اس میں گیہوں چاول اور جو کے پودے نہیں لہلہاتے بلکہ نیکیوں کے نوع بہ نوع اور بوقلموں پودے لہلہاتے ہیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ مجھ میں اپنے مادی وجود کے لیے تو سرگرمی اور اپنے اخلاقی و روحانی وجود کے لیے سرد مہری ہوتی ایک کے لیے تو عمل ہوتا اور دوسرے کے لیے بے عملی ہوتی؟

تجارت کا ذکر قرآن میں

آپ اور ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو ہمارا خالق و مالک ہے وہ ہماری نفسیات ہم سے زیادہ جانتا ہے اسی لیے اس نے دنیا کی مادی تجارت کا بھی ذکر کیا ہے اور آخرت کی روحانی تجارت کا بھی یہاں تک کہ اس نے ہدایت و ضلالت اور ایمان و کفر کے لیے کہیں بیع و اشتراء اور کہیں تجارت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ محض ہماری نفسیات کی رعایت ہے۔ ایک جگہ منافقین کے بارے میں قرآن نے کہا:۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے مگر یہ تجارت ان کے لیے نفع بخش

نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔" (البقرۃ ۱۶)

"انھوں نے ہدایت کے بدلے میں ضلالت خریدی اور اس کو بڑا نفع بخش مال سمجھا لیکن یہ مال ان کے لیے نہ آخرت میں نفع بخشنے والا ہے، نہ دنیا میں (تدبر قرآن ج ۱ ص ۸۲)

ایک جگہ اہل کتاب علماء و فقہاء کے لیے فرمایا گیا ہے:۔

"پس ہلاکی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تاکہ اس کے ذریعے سے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں پس ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی ہے اور ان کے لیے ہلاکی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں۔" (البقرہ: ۷۹)

ایسے لوگوں کے لیے یہ فرمایا گیا:۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی آخرت بیچ کر دنیا کی زندگی خرید لی ہے۔ لہٰذا نہ ان کی سزا میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ انہیں کوئی مدد پہنچ سکے گی۔ (البقرہ: ۸۶)

ایک جگہ فرمایا:۔

"رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لیے سخت دردناک سزا ہے۔ (آل عمران)

"اس سخت سزا کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز بس یہی اللہ کے مقرب بندے ہوں گے انہی کی طرف نظر عنایت ہوگی اور جو تھوڑا بہت گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھو ڈالا جائے گا حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔" (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۶۶)

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:۔

"آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قول و قرار کو اس طرح خرید فروخت کی چیز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے دنیوی مفادات پر (جن کی بڑی سے بڑی مقدار بھی

اجر آخرت کے مقابلے میں حقیر ہی ہے) اس کو اس بے دردی سے قربان کر رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے وہ اپنے جواہرات کو کوڑیوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی امانت کے معاملے میں ایسے نااہل ثابت ہوئے ان سے نہ تو اللہ اب بات کرے گا، نہ ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اب آخرت میں ایسے شامت زدوں کے لیے دردناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

الفاظ کے تیور جو لوگ پہچانتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں ان کے اندر کتنی نفرت اور کیسی شدید بیزاری چھپی ہوئی ہے لیکن اہل کتاب بالخصوص یہود ان کارستانیوں کے باعث جن کا اوپر ذکر ہوا اسی کے سزاوار تھے، خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ یہ وہ قوم تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے واسطے سے اپنے خاص کلام وخطاب کے شرف سے نوازا یہ فرعونیوں کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھی تو خدا نے اس پر عنایت کی نظر کی اور اس کو ذلت سے نکال کر سیادت وامامت کے تخت پر بٹھایا۔ اس کے تزکیہ کے لیے کتاب نازل فرمائی اور اس کو منوانے اور سدھانے کے لیے اس کے اندر اپنے رسول اور نبی بھیجے لیکن اس قوم نے نہ تو اس خطاب وکلام کی کچھ قدر کی اور نہ اس نظر شفقت وعنایت اور اس تزکیہ وتطہیر کی، جس کا خدا اور اس کے نبیوں نے یہ اہتمام کیا تو اب اس قوم کا کیا منھ ہے کہ اللہ اس سے بات کرے، یا اس کی طرف نظر کرے، یا اس کو پاک کرے۔ اس نے تو اپنے اوپر امید کے سارے دروازے خود بند کر لیے۔" (تدبر قرآن ج ۱ ص ۷۲۹)

یہ لمبی عبارت میں نے یہ سوچنے کے لیے نقل کی ہے کہ امت مسلمہ کے لیے بالعموم اور ارکان جماعت اسلامی کے لیے بالخصوص اس "حدیث دیگراں" میں کوئی سبق ہے یا نہیں؟

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:۔

جو لوگ ایمان کے بدلے کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ (آل عمران: ۱۷۷)

ایک اور سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوا:۔

ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات

کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا۔ انہیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا مگر انھوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔

(آل عمران: ۱۸۷)

فرمایا کہ خود ساختہ عہد کے حوالے دے کر یہ حق کی مخالفت کے معاملے میں تو بڑے چابک دست ہیں لیکن وہ اصل میثاق جو اللہ نے ان سے اپنی کتاب کو ایک ایک کے آگے آشکارا کرنے کا لیا تھا اور یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ اس کی کسی چیز کو چھپانا مت۔ اس عہد کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا تھا اور دنیا کے حقیر فائدے کے عوض قربان کر دیا۔ اس عہد کا حوالہ تورات اور انجیل دونوں میں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں سے ہوا ہے۔ ہم یہاں اختصار صرف دو حوالے نقل کرتے ہیں۔ استثنار میں ہے:۔

اس لیے میری ان باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے طور پر ان کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور تمہاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں اور تم ان کو اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا۔　(۱۱: ۱۸-۲۱)

ان الفاظ پر غور فرمایئے جس کتاب کی تبیین کا ان الفاظ سے یہود سے عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ گلدستۂ طاق نسیاں بنا کر رکھ دیا بلکہ اس میں تحریف کر کے اس کے حقائق کی قلب ماہیت بھی کر ڈالی — اسی طرح انجیلوں میں بھی نہایت موثر اسلوبوں میں یہ ہدایت موجود ہے اور خاص طور پر یہ فقرہ تو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے:۔

"جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو۔　متی ۱۰: ۲۷ (تدبر قرآن ج ا ص ۸۲۴)

امت مسلمہ کے بھی بہت سے علما، فقہا، اور صوفیہ نے قرآن کے ساتھ ٹھیک وہی معاملہ کیا ہے جو یہودیوں نے تورات کے ساتھ اور عیسائیوں نے انجیل کے ساتھ کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان علما، فقہا اور صوفیہ قرآن کے الفاظ کو بدل دینے پر قادر نہیں ہو سکے ہیں اور نہ کبھی قادر ہوں گے — یہ وہ تجارت تھی جو انسان کے لیے آخرت میں تباہ کن ہوگی۔ آیئے اب اس تجارت پر نظر ڈالیں جو بندۂ مومن کو اپنے مالک کے سامنے سرخ رو کرے گی۔ اس کو نظر عنایت کا مستحق بنائے گی۔

نرخ بالا کن　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توراۃ اور انجیل اور قرآن میں' اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔" (توبہ : ۱۱۱)

کتنی دل فروز وجاں نواز ہے یہ آیت' اس کو پڑھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے۔ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ تیری خوشنودی' تیری نظر عنایت' تیری جنت اور تیرا دیدار تو اتنی انمول چیز ہے کہ اس کے لیے ایک جان' نہیں' ہزار جانوں کی قربانیاں بھی کچھ نہیں ہیں۔ بلاشبہ! اس بیع" پر اور اس سودے پر جتنی خوشی منائی جائے کم ہے۔

یہاں مقصود اس بیع وشرا اور اس تجارت کے تمام پہلوؤں پر گفتگو کرنا نہیں ہے۔ صرف یہ دکھانا ہے کہ ایمان کے معاہدے کو بھی خود اس ذات نے بیع وشرا مقرار دیا ہے جس پر ہم ایمان لائے ہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ گذرا' یہ محض ہماری نفسیات کی رعایت اور مالک کی لاانتہا بے نہایت کا کرشمہ ہے ورنہ ہماری جانیں اور ہمارے مال تو اسی کے عطا کیے ہوئے ہیں۔ خرید و فروخت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کتنا حقیر ہے بائع اور کس قدر عظیم ہے مشتری۔

یہاں یہ لفظ ہے لفظ مجازی خریداری نہیں بندہ نوازی

ایک جگہ اپنے انہی بندوں کے بارے میں فرمایا:۔

"اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اور اللہ ایسے بندوں پر بہت مہربان ہے۔" (البقرہ: ۲۰۷)

یہاں بیچ دینے کے معنی اپنا سب کچھ تج دینے اور اپنی جان کھپا دینے کے ہیں۔ یہ منافقین کے مقابلے کا ایک کردار ہے

جہاد فی سبیل اللہ بھی تجارت ہے

ذیل کی آیات کے الفاظ سورۂ صف میں پڑھیے اور سوچیے۔ ہم ان آیات کا ترجمہ دے رہے ہیں:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے، یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی تمہیں دے گا اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہونے والی فتح۔ اے نبی اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔

سورۂ توبہ اور سورۂ بقرہ کی آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے اسی کو زیادہ صراحت کے ساتھ ان آیات میں کہا گیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ نے لکھا ہے:

"یہ وہ سوداگری ہے جس میں کبھی خسارہ نہیں۔ دنیا میں لوگ سیکڑوں طرح کے بیوپار اور تجارتیں کرتے ہیں اور اپنا کل سرمایہ اس میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ اس سے منافع حاصل کریں گے اور اس طرح راس المال گھٹنے اور تلف ہونے سے بچ جائے گا پھر وہ بذات خود اور اس کے اہل و عیال تنگ دستی وافلاس کی تلخیوں سے محفوظ رہیں گے لیکن مومنین اپنی جان و مال کا سرمایہ اس اعلیٰ تجارت میں لگائیں گے تو صرف چند روزہ افلاس سے نہیں بلکہ آخرت کے دردناک عذاب اور تباہ کن خسارے سے مامون ہو جائیں گے۔ اگر مسلمان سمجھے تو یہ تجارت دنیا کی سب تجارتوں سے بہتر ہے جس کا نفع کامل مغفرت اور دائمی جنت کی صورت میں ملے گا جس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

ان آیتوں میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کو ایک عجیب ترغیبی انداز میں تجارت (سوداگری) قرار دیا گیا ہے جس کا صلہ آخرت میں مغفرت و جنت اور دنیا میں فتح و نصرت ہے۔ یہاں ضمناً یہ اشارہ کر دینا نامناسب نہیں ہے کہ جب فلسفیانہ تصوف کا غلبہ ہوا تو صوفیہ اور صوفی علماء و شعراء نے قرآن کے دیے ہوئے اس تصور کو پوری طرح ملیا میٹ کرنے کی کوشش کی ہے یہاں تک کہ آخرت کو بھی ترک کر دینے کی "نصیحت" کی گئی ہے۔ علامہ اقبال پر جب اس تصوف کا غلبہ تھا تو وہ بھی یہ کہہ گزرے ہیں۔

واعظ کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد   دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

اے بے خبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے

یہ اشعار اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ کیونکہ اس نے تو اپنے اوپر ایمان تک کو سوداگری قرار دیا ہے

دنیا کی تجارت اور آخرت کی تجارت میں ایک بڑا فرق

دنیا کی مادی تجارت اور آخرت کی تجارت میں ایک بڑا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ دنیا فانی اور اس کی تجارت بھی فانی ہے اور اس میں گھاٹے اور ٹوٹے یہاں تک کہ دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ ہر وقت لاحق ہے۔ اس کے برعکس آخرت کی تجارت میں گھاٹے اور ٹوٹے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ سورۂ فاطر میں فرمایا گیا ہے:۔

جو لوگ پڑھتے ہیں کتاب اللہ کی اور سیدھی کرتے ہیں نماز اور خرچ کرتے ہیں کچھ ہمارا دیا ہوا، چھپے اور کھلے امیدوار ہیں ایک بیوپار کے جس میں ٹوٹا نہ ہو تاکہ پورا دے ان کو ثواب ان کا اور زیادہ دے اپنے فضل سے، تحقیق وہ ہے بخشنے والا قدردان (الفاطر-۲۹-۳۰)

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:۔

"یعنی اللہ سے ڈر کر اس کی باتوں کو مانتے اور اس کی کتاب کو عقیدت سے پڑھتے ہیں نیز بدنی و مالی عبادات میں کوتاہی نہیں کرتے وہ حقیقت میں ایسے زبردست بیوپار کے امیدوار ہیں جس میں خسارے اور ٹوٹے کا کوئی احتمال نہیں بلاشبہ جب خدا ان کے اعمال کا خریدار ہو تو اس امید میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ نقصان کا کوئی اندیشہ کسی طرف سے نہیں ہو سکتا از سرتاپا نفع ہی ہے"

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ آخرت کی تجارت کے امیدوار ہوتے ہیں وہ اس کو دنیا کی تجارت پر ترجیح دیتے اور ان کو دنیا کی بڑی سے بڑی تجارت بھی آخرت کی تجارت سے غافل نہیں کرتی۔

(اس کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) ان گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا، اور جن میں اپنے نام کی یاد کا اللہ نے اذن دیا ہے ان میں ایسے لوگ صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر دیتی وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل الٹنے

دیدے پھر اجانے کی نوبت آجائے گی (اور وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں) تاکہ اللہ ان کے بہترین اعمال کی جزا ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے نوازے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ (النور: ۳۷-۳۸)

"ذکر اللہ" اور ذکر یہاں نماز اور ذکر و دعوت کی ان تمام شکلوں پر حاوی ہے جو اللہ کی یاد اور اس کے دین کی سربلندی کے لیے اختیار کی جائیں"۔ (تدبر قرآن ج ۴ ص ۴۴۵)

دنیوی و اُخروی تجارت کا دوسرا قابل غور فرق

دنیوی و اخروی تجارت کا دوسرا قابل غور فرق یہ ہے کہ پہلی تجارت کا معاملہ نقد انقد معاملہ ہے اس کا نفع بھی دست بدست مل جاتا ہے اور ہمیشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اور دوسری تجارت کا معاملہ ادھار کا معاملہ ہے اس کا نفع بھی نگاہوں سے اوجھل ہے اور نقصان بھی۔ یہی وہ فرق ہے جس کی وجہ سے ہم پہلی تجارت میں سرگرم رہتے اور دوسری تجارت کے معاملے میں ہم پر سرد مہری اور بے عملی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ فرق ہمارے لیے بہت زیادہ قابل غور ہے۔

ایمان بالغیب

آزمائشی زندگی اور اس کی تمام ترقیوں کا دارومدار "ایمان بالغیب" ہی پر ہے۔ خدا ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ گر نہیں ہے۔ فرشتے آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ آخرت کا اجر و نوید، ثواب اور عذاب، جنت اور جہنم سب ہی پردے کے پیچھے ہیں۔ ہماری ساری آزمائش ہی یہ ہے کہ ہم عاجلہ پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں یا نہیں اور نقد کے مقابلے میں ادھار کا انتظار کرتے اور کر سکتے ہیں یا نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو ہمارے دل و دماغ میں زندہ و توانا ہو تو سرد مہری، تعطل اور بے عملی پاس نہیں پھٹکتی اور اگر مردہ یا کمزور ہو تو ہمیں کی سرگرمی ہم سے دور بھاگتی ہے۔ یہی حقیقی بیماری ہے اور اسی کا علاج حقیقی علاج ہے۔ اس کے بغیر ہم شفایاب نہیں ہو سکتے خواہ کتنی ہی خارجی تدابیر اختیار کر ڈالیں۔ "ایمان بالغیب" ایک مستقل موضوع ہے جس پر تفصیل سے گفتگو اس مقالے کو بہت طویل کر دے گی۔ اس تفصیل کا اجمال سورۃ البقرہ کی ابتدا ہی میں دے دیا گیا ہے۔ متقین کی وہ جماعت جس کے لیے قرآن ہدایت ہے اس کی پہلی صفت اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہمیں اپنے دلوں میں زندہ و توانا بنانا چاہیے یہ حاصل ہو جائے تو سب کچھ ہے اور نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ آنے والی تدابیر کے لیے

تمہید اور تخم کی حیثیت رکھتا ہے۔

تدابیر

یقین و اذعان کو زندہ و توانا رکھنے کی تدابیر بھی خود اللہ رب العزت نے بتادی ہیں۔ یہ جو ہم پانچ وقتوں کی نمازیں پڑھتے۔ یہ جو ہم مہینہ بھر کے روزے رکھتے ہیں یہ جو ہم زکوٰۃ دیتے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، یہ جو ہم حج کرتے ہیں، یہ جو ہم دعائیں مانگتے ہیں اور یہ جو ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں ان سے بڑھ کر اور کون سی تدابیر ہو سکتی ہیں؟ ہم یہاں چند شخصی و جماعتی تدابیر کی یاد دہانی کر رہے ہیں

(۱) محاسبہ

ہم میں جو شخص بھی اپنے ایمان بالغیب اور یقین آخرت کو زندہ و توانا رکھنا یا زندہ و توانا بنانا چاہتا ہو اس کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اپنے فرائض، اپنی ذمہ داریوں، اپنے اعمال اور اپنی کوتاہیوں کا محاسبہ کرے، جائزہ لے اور یہ کام قبر کی تنہائیوں اور قیامت کی ہولناکیوں کو پیش نظر رکھ کر کرے۔ سب کو معلوم ہے کہ کبھی مریض کو اپنے مرض کا احساس ہی نہ ہو اور وہ دوائیں استعمال ہی نہ کرے پھر اس کے باوجود اپنے مرض کے دور نہ ہونے کی شکایت بھی کرے تو یہ شکایت، یا تو منافقت ہوگی یا حماقت ـــــ قرآن کریم میں تدبر، تفکر اور محاسبے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی غایت یہی ہے کہ ایمان و یقین پر افسردگی اور یوسیدگی طاری نہ ہونے پائے۔

> اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو۔ اور ہر متنفس کو یہ دیکھتے رہنا چاہیے کہ کل کے لیے اس نے کیا بھیجا ہے۔ بے شک اللہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔ (الحشر ۱۸)
>
> کل سے مراد آخرت ہے۔ گویا دنیا کی یہ پوری زندگی "آج" ہے اور "کل" وہ یوم قیامت ہے جو اس آج کے بعد آنے والا ہے۔ یہ انداز بیان اختیار کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقہ سے انسان کو یہ سمجھایا ہے کہ جس طرح دنیا میں وہ شخص سخت نادان ہے جو آج کے لطف و لذت پر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتا ہے اور نہیں سوچتا کہ کل اس کے پاس کھانے کو روٹی اور سر چھپانے کو جگہ بھی باقی رہے گی یا نہیں؟ اسی طرح وہ شخص بھی اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہا ہے جو اپنی دنیا بنانے کی فکر میں ایسا منہمک ہے کہ اپنی آخرت سے بالکل غافل ہو چکا ہے

حالانکہ آخرت ٹھیک اسی طرح آتی ہے جس طرح آج کے بعد کل آنے والا ہے اور وہاں وہ کچھ نہیں پا سکتا اگر دنیا کی موجودہ زندگی میں اس کے لیے کوئی پیشگی سامان فراہم نہیں کرتا اس کے ساتھ دوسرا حکیمانہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں ہر شخص کو آپ ہی اپنا محتسب بنایا گیا ہے جب تک کسی شخص میں خود اپنے اچھے اور برے کی تمیز پیدا نہ ہو جائے۔ اس کو سرے سے یہ احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ آخرت میں اس کو سنوارنے والا ہے یا بگاڑنے والا۔ اور جب اس کے اندر یہ حس بیدار ہو جائے تو اسے خود ہی اپنا حساب لگا کر یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اپنے وقت، اپنے سرمائے، اپنی محنت، اپنی قابلیتوں اور اپنی کوششوں کو جس راہ میں صرف کر رہا ہے وہ اسے جنت کی طرف لے جا رہی ہے یا جہنم کی طرف، یہ دیکھنا اس کے اپنے ہی مفاد کا تقاضا ہے، نہ دیکھے گا تو آپ ہی اپنا مستقبل خراب کرے گا۔ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۴)

ایک اور مقام پر فرمایا:۔

پوچھتے ہیں، ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور کرو۔ دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں۔ (البقرہ: ۲۱۹-۲۲۰)

اس آیت میں دنیا اور آخرت کے معاملات میں توازن کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ:۔

عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دین داری کی طرف میلان ہو تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنگ و جہاد خواہ کسی حالت میں بھی ہو ان کے یہاں خلاف تقویٰ قرار پا جاتا ہے اور اگر دنیا داری کی طرف میلان ہو گا تو جوئے اور شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر ان میں بھی تو کچھ پہلو فائدے کے ہیں۔ قرآن نے فکر انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ اس عدم توازن کو دور کر کے اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق صحیح صحیح پہچان سکے۔ (تدبر قرآن ج ۱ ص ۴۷۳)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مطلب سے کی تاکید فرمائی ہے۔ ہم یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صرف ایک

نصیحت نقل کرتے ہیں :۔

ویروی عن عمر بن الخطاب قال	حضرت عمرؓ بن الخطاب سے مروی ہے کہ
حاسبوا انفسکم قبل ان	انھوں نے فرمایا اس سے پہلے کہ تمہارا حساب
تحاسبوا وتزینوا للعرض الاکبر	لیا جائے تم خود اپنا حساب کرلو اور اس سب سے
وانما یخف الحساب یوم القیامۃ	بڑی پیشی کے لیے اپنے آپ کو آراستہ کرو ۔
علی من حاسب نفسہ فی الدنیا	قیامت کے دن اس شخص پر حساب آسان
(ترمذی ج ۲ ابواب الزہد)	ہوگا جس نے دنیا میں اپنا حساب آپ کیا ہوگا

ہمارے اور آپ کے لیے کتنی قیمتی ہے یہ نصیحت — قدرتی طور پر اس محاسبے اور جائزے میں وہ عہد وپیمان بھی آئے گا جو ہم نے جماعت اسلامی ہند کا رکن بنکر کیا ہے ۔ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہم کہاں تک یہ عہد پورا کر رہے ہیں اور جماعت کے طے کردہ پروگرام کو روبہ عمل لانے میں ہمارا حصہ کتنا ہے ؟ اس محاسبے کے لیے کوئی خاص وقت متعین نہیں ہے ۔ ہم چوبیس گھنٹوں میں کسی وقت بھی یہ محاسبہ کرسکتے ہیں ۔ ویسے اس کا موزوں وقت وہ ہے جب ہم رات کو سونے کے لیے لیٹتے ہیں یا پھر آخر شب کے پرسکون لمحات — اسی طرح کا احتساب جماعتی اور اجتماعی بھی ہونا چاہیے ۔

(۲) استغفار و توبۂ نصوح

خلوص کے ساتھ یہ محاسبہ کیا جائے تو لازماً اس سے دل میں نرمی پیدا ہوتی اور کوتاہیوں کا احساس بیدار ہوتا ہے ۔ پھر طبیعت توبہ و استغفار کی طرف مائل ہوتی ہے ۔ ہمیں پورے خلوص سے اللہ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنی چاہیے ۔ اور یہ عزم کرنا چاہیے کہ آئندہ ہم سے یہ کوتاہیاں سرزد نہ ہوں گی ۔ ندامت اور آئندہ کے لیے عزم توبۂ نصوح کی جان ہے ۔

> اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے توبہ کرو خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی یہ وہ دن ہوگا جب اللہ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہ کرے گا ۔ ان کا نور ان کے آگے آگے دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کردے اور ہم سے درگذر فرما! تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔ (التحریم : ۸)

یہ توبہ و استغفار وہ چیز ہے جو مومن کی شعوری زندگی سے شروع ہوتی اور آخری لمحہ زندگی پر ختم ہوتی ہے۔ مومن کسی وقت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا بلکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ استغفار اور اپنی کوتاہی کا احساس جنت کے دروازے تک اس کا ساتھ دے گا۔ اس آیت میں توبۂ نصوح (خالص توبہ) کا ذکر آیا ہے۔

"اصل میں توبۃً نصوحًا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں نصح کے معنے عربی زبان میں خلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو عسل ناصح کہتے ہیں جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو پھٹے ہوئے کپڑے کو سی دینے اور ادھڑے ہوئے کپڑے کو مرمت کر دینے کے لیے نصاحۃ الثوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصوح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہوگا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے جس میں ریا اور نفاق کا شائبہ تک نہ ہو یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بدانجامی سے بچالے۔ یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے توبہ کے ذریعے سے اس کی اصلاح کر دے، یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی کی طرح اپنی اصلاح کر لیں۔ یہ تو ہیں توبۂ نصوح کے وہ مفہومات جو اس کے لغوی معنوں سے مترشح ہوتے ہیں۔ رہا اس کا شرعی مفہوم تو اس کی تشریح ہمیں اس حدیث میں ملتی ہے جو ابن ابی حاتم نے زر بن حبیش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابی بن کعب سے توبۂ نصوح کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا آپ نے فرمایا" اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو۔ یہی مطلب حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی منقول ہے اور ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے توبۂ نصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اعادہ تو درکنار اس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے (ابن جریر) حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بدو کو جلدی جلدی توبہ و استغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا یہ توبۃ الکذابین ہے۔ اس نے پوچھا۔ پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا اس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہئیں۔

(۱) جو کچھ ہو چکا اس پر نادم ہو۔ (۲) اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو ان کو ادا کر۔ (۳) جس کا حق مارا ہو اس کو واپس کر۔ (۴) جس کو تکلیف پہنچائی ہو اس سے معافی مانگ (۵) آئندہ کے لیے عزم کر لے کہ اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا (۶) اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گھلا دے جس طرح تو نے اب تک

اسے معصیت کا خوگر بنائے رکھا ہے اور اس کو طاعت کی تلخی کا مزا چکھا جس طرح اب تک تو اسے معصیتوں کی حلاوت کا مزا چکھاتا رہا ہے۔ (کشاف)

توبہ کے سلسلے میں چند امور اور بھی ہیں جنھیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اول یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لیے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے ورنہ کسی گناہ سے اس لیے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے یا کسی بدنامی کا، یا مالی نقصان کا موجب ہے۔ توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ دوسرے یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے اسی وقت اس کو توبہ کرنی چاہیے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو بلا تاخیر اس کی تلافی کر دینی چاہیے، اسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور توبہ کو کھیل بنا لینا اور اسی گناہ کا بار بار اعادہ کرنا جس سے توبہ کی گئی ہو، توبہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ چوتھے یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا اس سے اگر بشری کمزوری کی بنا پر اسی گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پچھلا گناہ تازہ نہ ہوگا۔ البتہ اسے بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہیے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہیے کہ آئندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے تو توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے لیکن اگر اس کا نفس اپنی سابق گنہگارانہ زندگی کی یاد سے لطف لے رہا ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لیے لذت کے بجائے شرمساری کی موجب بن جائے اس لیے کہ جس شخص نے فی الواقع خدا کے خوف کی بنا پر معصیت سے توبہ کی ہو وہ اس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے خوف نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۱)

توبہ کا عام حکم ہر مسلمان کو دیا گیا ہے:۔

اے مومنو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ (النور: ۳۱)

سچی توبہ سے صرف ذنوب و سیئات کا کفارہ ہی نہیں ہوتا بلکہ رفع درجات بھی ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھی استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حیات طیبہ کے آخری دور میں اور زیادہ تسبیح و تحمید مع استغفار کا حکم دیا گیا ہے یہ وہ اصلاحی اسباب ہے جس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ترین و محبوب ترین بندے کو دی تھی۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

نے کیا خوب لکھا ہے :۔

"یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے کسی انسان سے اللہ کے دین کی خواہ کیسی ہی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو اس کی راہ میں خواہ کتنی ہی قربانیاں اس نے دی ہوں اور اس کی عبادت و بندگی بجا لانے میں خواہ کتنی ہی جاں فشانیاں اس نے کی ہوں، اس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آنا چاہیے کہ میرے رب کا جو حق تھا وہ میں نے پورا کا پورا ادا کر دیا ہے۔ بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا اور اسے اللہ سے یہی دعا مانگنی چاہیے کہ اس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی بھی مجھ سے ہوئی ہو، اس سے درگذر فرما اور میری حقیر سی خدمت قبول فرما لے۔ یہ ادب جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا گیا جن سے بڑھ کر خدا کی راہ میں سعی و جہد کرنے والے کسی انسان کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تو دوسرے کسی کا یہ مقام کہاں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل کو کوئی بڑا عمل سمجھے اور اس غرے میں مبتلا ہو کہ اللہ کا جو حق اس پر تھا وہ اس نے ادا کر دیا ہے۔ اللہ کا حق اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کوئی مخلوق اسے ادا کر سکے ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے یہ سبق دیتا ہے کہ اپنی کسی عبادت و ریاضت اور کسی خدمت دین کو بڑی چیز نہ سمجھیں بلکہ اپنی جان راہ خدا میں کھپا دینے کے بعد بھی یہ سمجھتے رہیں کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ اسی طرح جب کبھی انہیں کوئی فتح نصیب ہو اسے اپنے کسی کمال کا نہیں بلکہ اللہ کے فضل ہی کا نتیجہ سمجھیں اور اس پر فخر و غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے اپنے رب کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکا کر حمد و تسبیح اور توبہ و استغفار کریں۔"

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۵۱۷)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سامنے سر زمین پر رکھے ہوئے سجدے میں یہ فرمایا کرتے تھے۔ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ (ہم نے تیری ویسی عبادت نہیں کی جیسا کہ حق تھا عبادت کرنے کا) حضورؐ خود بکثرت استغفار کرتے اور صحابہ کرام کو اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔

(۳) کلمہ طیبہ کا ذکر اور اس کی تکرار

تیسری چیز جو اپنے فرائض کی ادائیگی، اپنے عہود و مواثیق کے ایفا اور اپنے رب کی خوشنودی کے

حصول کے لیے ہمیں سرگرم رکھ سکتی ہے وہ لا الہ الا اللہ کا ذکر اور اس کی تکرار ہے۔ لا الہ میں ہر اس چیز کی نفی کیجیے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں نامقبول اور اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ سب سے بڑھ کر اپنے نفس امارہ کی نفی کیجیے جو اللہ کی نافرمانی پر مجبول ہے اور اس کی خواہشات انسان کا معبود بن جاتی ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ بت پرستی بھی نفس پرستی کی ایک شکل ہے مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (جس نے اپنی خواہش نفس کو معبود بنا لیا ہو) یہ اسلامی تصوف ہے — یہ ہے وہ تصوف جس کی تعبیر کتاب و سنت میں تقویٰ اور احسان کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ میں ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ جب تک ہم اس تصوف کی طرف توجہ نہ کریں گے ہماری سردمہری کا دور ہونا سخت دشوار رہے۔ اس کلمہ پر تفصیل سے لکھنے کا یہ موقع نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے اتنا یاد کر لینا کافی ہے کہ "سورۂ محمد" میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی خوب اچھی طرح جان لو کہ لا الٰہ الا اللہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں کوئی مستحق عبادت نہیں۔

اس حقیر کے نزدیک نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دینا اس کلمہ کی ایسی فضیلت ہے جس سے بڑی کوئی فضیلت نہیں ہو سکتی۔ احادیث میں بھی اس کو افضل الذکر قرار دیا گیا ہے۔



حضرت جابرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ افضل الذکر لا الہ الا اللہ اور افضل الدعاء الحمد للہ ہے[1]

ایک اور حدیث میں ہے:-

حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی۔ اے میرے رب مجھے کوئی ایسی چیز سکھا کہ میں اس سے تجھے یاد کیا کروں تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ اے موسیٰ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا کرو۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے:-

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے ایمانوں کی تجدید کیا کرو۔ دریافت کیا گیا۔ یا رسول اللہ ہم لوگ کس طرح اپنے ایمان کی تجدید کیا کریں؟

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الاسماء فی ثواب التسبیح بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ
[2] ایضاً بحوالہ شرح السنۃ

آپؐ نے فرمایا۔ بکثرت لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہا کرو[1]

بعض حدیثوں میں ہے کہ صحابہ کرام اس کلمہ کو سب سے بڑا کلمہ تصور کرتے تھے جو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے مرض الموت میں ان کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ یہی کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ تھا۔ بخاری و مسلم کی صحیح ترین احادیث میں جن چار کلمات کی فضیلت آئی ہے ان میں ایک لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ہے۔ اتنے دلائل بھی اس کلمہ کی اہمیت و فضیلت جاننے کے لیے کافی ہیں۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے سب سے پہلے اسی کلمہ کی تبلیغ کی ہے اور احادیث میں اس ماننے والے کو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے جس کا آخری کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ ہو۔

تجربہ بتاتا ہے کہ ذہن کو اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز اور جسم کو اس کی اطاعت میں مشغول رکھنے کے لیے اس کلمہ کی تکرار بے حد مفید ہے۔ قلبی و ذہنی طور پر اس کلمہ کو یاد رکھنے اور اس کی تکرار کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ "دست بکار و دل بیار" ایک مجرب جملہ ہے۔ اسی طرح "خلوت در انجمن" کا جملہ بھی کوئی وہمی چیز نہیں ہے۔ ویسے زبان سے اس کے ذکر و تکرار کے لیے کوئی وقت مقرر کر لینا چاہیے۔ سب سے بہتر وقت آخر شب کا ہے۔ اس کے معنے و مفہوم کو سامنے رکھ کر اس کی تکرار دل کو نرم کرتی اور اپنی کوتاہی کا احساس بیدار کرتی ہے۔ اسی طرح اس کی تکرار اللہ تعالیٰ سے تعلق اور لگاؤ میں اضافہ کرتی ہے بعض اوقات آنکھوں سے جھڑی لگتی اور کشت روح ہری ہوتی ہے۔ دل سے محبت الٰہی فوارے کی طرح ابلتی اور جوش مارتی ہے۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات میں پڑھا ہے کہ آپ اپنے گھر کے اندر ازواج مطہرات کے ساتھ ہنس بول رہے ہوتے، اتنے میں اذان کی آواز کانوں میں آتی تو آپ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے آپ کسی کو پہچانتے ہی نہیں ہیں۔ نماز کی تیاری میں مشغول ہو جاتے۔ وضو کرتے اور مسجد تشریف لے جاتے یہ دفعۃً لوگوں سے بے تعلقی اس لیے پیدا ہوتی کہ آپ پر پہلے ہی سے خلوت در انجمن کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ خلوت در انجمن کا مفہوم یہ ہے کہ مجمع میں رہتے ہوئے انسان کا ذہن اور اس کا دل خدا کی طرف لگا رہے یہ کیفیت خدا کی اطاعت میں بھی سرگرم رکھتی ہے اور بہت سی برائیوں سے بھی انسان کو بچاتی ہے۔

(۴) دعاء۔

اللہ سے تعلق میں اضافے کے لیے دعا بھی ایک بے خطا نسخہ ہے۔ دعا پڑھنا نہیں بلکہ دعا مانگنا ہم اکثر و بیشتر

[1] جمع الفوائد کتاب الایمان بحوالہ مسند احمد

دعا پڑھتے ہیں جس میں کوئی جان نہیں ہوتی۔ یہاں میری مراد ان دعاؤں سے نہیں ہے جو ہم فرض نمازوں کے بعد یا اجتماعات کے خاتمہ پر کرتے ہیں بلکہ اس سے مراد وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ سے تجدید ایمان کے لیے کرنی چاہیے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ کرام سے فرمایا:۔

"ایمان تمہارے دلوں میں اس طرح پرانا' بوسیدہ ہو جاتا ہے جس طرح کپڑا پرانا ہو جاتا ہے لہٰذا اللہ سے دعا کیا کرو کہ ایمان کو تمہارے دلوں میں تازہ کر دے (جمع الفوائد)

اس کام کے لیے بھی بہترین وقت آخر شب کے پرسکون لمحات ہیں۔ نماز پڑھیے۔ لا الٰہ الا اللہ کی تکرار کیجیے اور جب دل میں رقت پیدا ہو تو خدا کے سامنے ہاتھ پھیلا دیجیے اور کہیے:۔

اے ہمارے رب تو قادر ہے۔ ہم عاجز ہیں۔ ہمارے چمن ایمان کو نئی بہار عطا فرما۔ اس کے پھولوں کو اپنی محبت کی خوشبو اور اپنی اطاعت کا رنگ عطا فرما۔ ہم گنہگار ہیں ہم کو بخش دے ہماری عبادت تیرے لائق نہیں محض اپنے کرم سے اسے قبول فرمالے۔

یہ مفہوم ہے' مقصد یہ نہیں کہ آپ یہی الفاظ کہیں۔ تجربہ کر کے دیکھیے کہ اس مخلصانہ دعا سے آپ کے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ اور آپ کے دل پر سکون کی بارش ہوتی ہے یا نہیں؟

یہ وہ چند تدابیر ہیں جن کا تعلق ہر فرد سے ہے خواہ وہ امیر ہو یا مامور' امام ہو یا مقتدی۔ جماعتی تدابیر کی اصل بھی یہی شخصی تدابیر ہیں۔ میں یہاں صرف دو چیزوں کی یاد دہانی کراتا ہوں۔

(۱) اطاعت

امیر کی اطاعت فی المعروف وہ چیز ہے جس کے بغیر کسی جماعت کا نظم و ضبط اور اندرونی استحکام وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور صحیح معنے میں اطاعت وجود میں نہیں آ سکتی جب تک ہم ان چار چیزوں پر عمل نہ کر رہے ہوں جن کا ذکر شخصی تدابیر کے ذیل میں گزرا۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تھا:۔

سنو اور اطاعت کرو۔ اگرچہ کسی حبشی غلام کو جس کا سر خشک انگور کی طرح ہو۔ تمہارا امیر بنا یا گیا ہو جب تک وہ تمہارے اندر کتاب اللہ کے مطابق امارت کے فرائض انجام دے رہا ہو۔[1]

تو مبالغے کے ساتھ یہ تمثیلی انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ اطاعت فی المعروف کی حیثیت جماعتی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی جیسی ہے۔ اس اطاعت کی دینی اہمیت اس درجہ کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ

[1] جمع الفوائد بحوالہ بخاری

علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے :۔

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی ۔[1]

اس سے زیادہ واضح اور موکد الفاظ میں اطاعت امیر کی اہمیت بیان نہیں کی جا سکتی ۔ ہماری عقل بھی اس دینی حکم کی اہمیت کا پوری طرح ادراک کرتی ہے ۔

(۲) بیدار و سرگرم قیادت

کسی اسلامی جماعت کی قیادت، پھولوں کا نہیں کانٹوں کا تاج ہے جو کسی کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے ۔ امارت ایک جانگسل و جانگداز ذمہ داری ہے اور اس کی دشوار ترین ذمہ داری پوری جماعت کی بیدار نگرانی و نگہبانی ہے کہاں کیا ہو رہا ہے، ارکان اپنی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں یا نہیں، ان کے درمیان کوئی باہمی نزاع و اختلاف تو پیدا نہیں ہو رہا ہے ان کے درمیان کوئی فتنہ تو سر نہیں اٹھا رہا ہے، غرض ان کے حالات سے واقفیت اور خرابیوں کا فوری بر وقت ازالہ بے حد ضروری کام ہے اور یہ کام، آرام کو قربان کئے بغیر نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے حالات و واقعات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کی قیادت کتنا مشکل کام ہے بے لوث خدمت، بے لاگ انصاف، بلا امتیاز شفقت، حالات سے واقفیت اور بر وقت اصلاح کا تصور کر کے بھی پتہ پانی ہوتا ہے ۔ میں یہاں صرف ایک واقعہ نقل کروں گا غزوہ حنین وا رطاس میں غنائم کا بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا تھا اس کی تقسیم کے بارے میں لکھا ہے :

> جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے اس پر انصار کو رنج ہوا بعضوں نے کہا رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں بعض بولے ۔ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے ۔ آں حضرت صلی اللہ وسلم نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا ۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے آپ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا ہے لوگوں نے عرض کی کہ حضور! ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا نو خیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے ۔ صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انس سے روایت ہے کہ جب آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم

[1] ایضاً بحوالہ بخاری و مسلم

نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ انھوں نے کہا آپ نے جو سنا ہے وہ صحیح ہے۔

آپ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فن بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:۔

کیا یہ سچ نہیں کہ پہلے تم گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولت مند کیا۔

آپ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرے پر انصار کہتے جاتے تھے خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے ——— آپ نے فرمایا نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح مدد کی۔ یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ ——— انصار بے اختیار چیخ اٹھے: "ہم کو صرف محمد صلے اللہ علیہ وسلم درکار ہیں" اکثروں کا یہ حال تھا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہوگئیں — آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیف قلب کے لئے دیا (سیرت النبی ج ۱ ص ۵۴۴)

کس قدر موثر اور سبق آموز ہے یہ واقعہ اس سے معلوم ہوا کہ خود حضور نبی کریم کے بارے میں جو غلط فہمی انصار کے نوجوانوں میں پیدا ہوگئی تھی۔ آپ نے اس کو بھی نظر انداز نہیں فرمایا بلکہ فوراً اس غلط فہمی کو دور کرتے اور اصلاح حال کے لئے نہایت نفسیاتی اور موثر تدبیر اختیار فرمائی۔

اسلامی تحریکوں کے ذمہ دار

(مولینا صدر الدین اصلاحی مدظلہٗ)

ہر تنظیم بنیادی طور پر دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ تنظیمی لحاظ سے دونوں کی حیثیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں، اور ان کی ذمہ داریاں بھی جدا جدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو اس تنظیم میں "اعضائے رئیسہ" کا سا مقام رکھتے ہیں، اور باقی تمام لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی حیثیت عام اجزائے جسم کی سی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی اجتماعی ادارہ نہ تو صرف اعضائے رئیسہ کی بدولت برقرار رہ سکتا ہے، نہ صرف عام اعضاء و جوارح کے بل پر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی زندگی، اس کی توانائی اور اس کی ترقی کے لئے چند چیزیں انتہائی حد تک ناگزیر ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک طور سے ادا کرتے رہیں، انھیں اپنی اپنی حدود بھی معلوم ہوں اور اپنے فرائض کا بھی پورا پورا احساس ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اس علم اور اس احساس میں کوتاہ رہا تو یہ اجتماعی ادارہ ڈیڑھ پہیے کی گاڑی بن کر رہ جائے گا اور اگر کوتاہی و خام کاری کے مرض میں دونوں ہی مبتلا ہو رہے تو پھر گاڑی ٹوٹے ہوئے پہیوں پر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی بس جوں توں گھسٹتی رہے گی، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس کھڈ میں جا گرے گی۔

اسلام نے اپنے پیرووں کو بالعموم ہر کام اجتماعی شکل میں، اور نظم کے ساتھ انجام دینے کی جو ہدایتیں دی ہیں، ان کا بیّن تقاضا ہے کہ اس دین کی حمایت اور نصرت و اقامت کے لیے قائم کی جانے والی تحریکیں بھی ان کے تقاضوں کو اچھی طرح ملحوظ رکھیں، اور منظم طور سے اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھائیں۔ اسلامی تحریکوں یا تنظیموں کے "اعضائے رئیسہ" "جماعتی ذمہ دار" اور "امراء" کہلاتے ہیں، اور عام اعضاء و جوارح ان کے "ماتحت" یا "مامورین" ہوتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسولؐ نے ان دونوں ہی قسم کے لوگوں کی

ذمہ داریوں کو بڑی وضاحت سے بیان فرمارکھاہے، اور ان اخلاقیات پر بھی پوری طرح روشنی ڈال دی ہے جن کی، اس خصوص میں، نمایاں اہمیت ہے۔ یہیں اس وقت، موقع اور ضرورت کی مناسبت سے، صرف انہی ذمہ داریوں اور ایسی اخلاقی صفات کی یاددہانی کرنا چاہتا ہوں جو اسلامی تحریکوں کے اصحاب امر سے، خواہ وہ کسی درجے اور حیثیت کے ہوں، تعلق رکھتی ہیں۔

ایک جامع الفرائض دعا قرآن کریم کی ایک دعائیہ آیت کا آخری ٹکڑا ہے

.... وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (سورۃ الفرقان) .... اور (اے پروردگار) ہمیں متقیوں کا سربراہ بنا۔

اس دعا کا سادہ انداز میں مفہوم یہ ہے کہ خدایا! جو لوگ ہماری ماتحتی اور نگرانی میں ہیں انھیں تقوے کی راہ پر چلا۔

تین لفظوں کا یہ دعائیہ جملہ **جوامع الکلم** میں سے ہے، اور ایک فرض شناس مسلمان کی نگہ جستجو کے لئے اس میں سب کچھ موجود ہے کیونکہ یہ اگرچہ بظاہر صرف ایک دعا ہے، مگر اس دعا کے پس منظر میں ان سبھی واجبات اور صفات کے مطالبے موجود ہیں جن سے سچے اہل ایمان کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ جب ایک مرد مومن اپنے رب سے یہ التجا کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اسے اہل تقویٰ کا سربراہ بنا دے، تو یہ التجا دعا ہونے کے ساتھ ساتھ لازماً اس عہد پر بھی مشتمل ہوتی ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک میں خود بھی اس مدعا و مطلوب کے حصول کے لئے کوشاں رہوں گا کیونکہ دعا صحیح معنوں میں دعا ہوتی ہی اس وقت ہے، جب اس کا رشتہ دعا کرنے والے کی اپنی ممکنہ کوششوں سے جڑا ہوا ہو۔ آدمی اپنے مطلوب کے لئے خود تو کچھ نہ کرے، اور صرف یا رب یا رب پکارتا رہے تو یہ دعا نہیں، تمنی علی اللہ ہوگا، جو نہ عقلاً کوئی پسندیدہ چیز ہے نہ شرعاً۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اہل ایمان کو اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کی دعا کے ساتھ ساتھ کیا کوششیں انجام دینا اور دیتے رہنا چاہئے کہ ان کی یہ عظیم المقاصد دعا صحیح معنوں میں دعا بن جائے، تمنی علی اللہ بن کر نہ رہ جائے۔ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ دعا کرنے والا اپنے جن زیر اثر اور ماتحت لوگوں کو متقی دیکھنا چاہتا ہے انہیں تقویٰ کی صفات سے آراستہ کر دینے یا آراستہ بنائے رکھنے کی جس طرح وہ خدا سے التجا کرے، اسی طرح اس مقصد کی خاطر خود بھی سعی و تدبیر کرتا رہے، اور اپنے ماتحتوں کو تقویٰ کے مقام تک پہنچا دینے میں اپنی سعی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے، لیکن ذرا ٹھہرئیے، یہ جواب ابھی تشنہ ہے، اور یہ مکمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاملہ کا ایک اور اہم پہلو

بھی سامنے آجائے، اور وہ یہ کہ اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کی دعا میں اگرچہ ذکر تو صرف ماتحتوں کے صاحبِ تقویٰ ہونے یا بنائے جانے کی التجا کا ہے، مگر لفظوں میں مذکور نہ ہونے کے باوجود اس التجا سے پہلے ایک اور اہم تر التجا بھی اس دعا میں موجود ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدایا! خود ہمیں بھی نہ صرف متقی بلکہ اُن سب سے بڑھ کر متقی بنا دے۔ کیونکہ یہ بالکل بے معنی سی بات اور بڑی بے جا قسم کی جسارت ہوگی کہ آدمی خود تو تقویٰ کے معاملے میں کچھ یوں ہی سا ہو، مگر اللہ تعالیٰ سے عرض پر عرض کرتا رہے کہ وہ اسے متقیوں کا امام بنا دے۔ ایسی عرض معروض تو اسی شخص کو زیب دے سکتی ہے جو خود بھی صاحبِ تقویٰ ہو اور تقویٰ کی صفت سے اپنے کو بیش از بیش بہرہ ور کرتے رہنے کی بصدق دل اللہ سے التجا کرتا ہے، بلکہ اتقیٰ یعنی دوسروں سے بڑھ کر متقی ہو، یا اتقیٰ بن جانے کی فکر اور کوشش میں ہو۔ مذکورہ بالا سوال کا یہ مکمل جواب سامنے آجانے کے بعد، واضح طور پر اہلِ ایمان کی ذمہ داریاں دو گونہ قرار پا جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ تقویٰ اور خدا ترسی کی راہ میں اپنے کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتے رہیں۔ دوسری یہ کہ اپنے ماتحت افراد کو بھی اس مدارِ دین ایمانی صفت سے بہرہ ور کرتے رہنے کے لئے برابر فکر مند اور کوشاں رہیں اور پھر دونوں ہی باتوں کے لئے خدا سے سچی دعائیں بھی کرتے رہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نظر میں رہنی چاہئے کہ تقویٰ کی صفت، بجائے خود تو مطلوبِ دین ہے ہی، ساتھ ہی اس لئے بھی مطلوب اور ضروری ہے کہ جب تک پیروانِ اسلام کے اندر یہ ایمانی جوہر ایک معقول حد تک موجود نہ ہو، اس وقت تک اسلام اپنے پورے وجود کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ جو نظامِ رحمت لے کر آیا ہے وہ خدا کی زمین پر ہرگز قائم نہیں ہو سکتا اور اگر پہلے سے قائم ہو تو اپنی جگہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کوئی بھی اسلامی تحریک اپنے سفر کے اس اصل زادِ راہ سے تہی دامن رہ کر، یا اس کی محض معمولی سی مقدار کے بل پر کبھی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔

ان تمہیدی مگر بنیادی نکتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب آئیے ان اہم صفات کو ذہن نشین کر لیں جو کسی اسلامی تحریک کے ذمہ داروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ لازماً پائی جانی چاہئیں، اور جن کی موجودگی پر ہی اس تحریک کی کامیاب پیش قدمی بہت بڑی حد تک موقوف رہتی ہے:-

۱۔ احتسابِ نفس

سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت تو احتسابِ نفس کی صفت ہے۔ جب تک اس احتساب پر بھرپور توجہ نہ رہے گی، اس وقت تک یہ ذمہ دارانِ تحریک ان صلاحیتوں اور صالحیتوں کے مالک بن ہی نہیں سکتے جو تحریک میں اقدام کی روح دوڑا سکتی اور اسے ترقی کی راہ پر رواں دواں رکھ سکتی ہیں۔ پس مبالغہ نہ ہوگا اگر احتسابِ نفس کو تحریک کی کامیابی کی شاہ کلید سمجھا جائے۔

یہ احتساب کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا نظری جواب اگرچہ ہم سب جانتے ہیں، مگر موضوع گفتگو کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس جانے ہوئے جواب کو پھر سے جان لیا جائے، تاکہ وہ ذہنوں میں تازہ ہو رہے۔ کیونکہ یہ جواب جس قدر معلوم اور واضح ہے، اسی قدر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا دشوار، اور اس کا عملی نتیجہ کمیاب ہے کون نہیں جانتا کہ نفس کی کیا دی بے مثال اور اس کے حملوں کی شدت بے نظیر ہوتی ہے۔ یہ حملے اتنے شاطرانہ انداز کے، اور اس طرح چھپ کر ہوا کرتے ہیں کہ بس حضرات انبیاء ہی ان سے پوری طرح محفوظ رہ سکے ہیں۔ آدمی کو محسوس تک نہیں ہو پاتا اور وہ متاع دین و ایمان لوٹ لے جاتا ہے۔ یہ نفس جس شیطانِ اعظم کا ایجنٹ ہے وہ لعین دربار خداوندی میں چیلنج دے آیا ہے کہ میں ابنِ آدم کو اپنی گرفت میں لے لینے کی کوئی تدبیر اور کوشش اٹھا نہ رکھوں گا، اور اس پر سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، غرض ہر جہت اور ہر رخ سے چھاپے ماروں گا۔ پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھانے میں کم از کم اسی نوے فی صد تو بہر حال کامیاب رہا۔ کوئی چالاک دشمن جب بھی اپنے حریف پر دھاوا مارتا ہے تو اس کی طاقت کا اندازہ لگا کر مارتا ہے۔ شیطان اور اس کا ایجنٹ نفس امارہ اس اصول جنگ کا ماہر ہے۔ جو افراد انسانی جتنے ہی زیادہ قوی الایمان اور صاحب علم و عرفان ہوتے ہیں انہیں پھانس لینے کے لئے وہ اتنا ہی زیادہ مضبوط آہنی جال بچھاتا رہتا ہے۔ اور اگر وہ قوی الایمان اور صاحب علم و عرفان ہونے کے ساتھ ساتھ نصرت دین کے مرد میدان بھی ہوں تو وہ اپنے اس آہنی جال کی کڑیوں کو اور زیادہ کس دیتا ہے۔ صحیح معنوں کی اسلامی تحریکوں سے بڑھ کر اس کو کوئی مبغوض اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بڑے سے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو تو شاید کچھ دیر کے لئے برداشت کر لے، مگر دین حق کا علم اٹھانے والوں کو ایک آن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس جنگی تدبیر سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ غنیم کے لشکر کو تہ و بالا کر کے رکھ دینے کی سب سے کارگر شکل یہ ہے کہ اس لشکر کے سالاروں اور کمانڈروں کا کام تمام کر دیا جائے پھر باقی فوج آپ سے آپ سفید جھنڈے لہرانے لگے گی۔ یہ خوفناک حقیقت متنبہ کرتی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے عام ارکان بالعموم، اور ان کے ذمہ دار بالخصوص، نفس اور شیطان کی طرف سے برابر چوکنے رہیں۔ ایک طرف تو انھیں ان کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہیئے، دوسری طرف اپنے اندر دل میں جھانک کر دیکھتے رہنا چاہیئے کہ کہیں شیطان نقب تو نہیں لگا رہا ہے۔ ان دو گونہ فکر مندیوں اور کوششوں کے بعد ہی اس توقع کا رکھنا حق بجانب ہو سکتا ہے کہ اس کے مذموم عزائم کامیاب نہ ہونے پائیں گے۔

۲-۱ اخلاص نیت

احتساب نفس کے پہلو ایک دو نہیں، بہت سے ہیں۔ ان کی اہمیتوں کے درجات اور وقت کی گنجائش کو دیکھ

ہوئے میں یہاں صرف دو اہم ترین پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے پر اکتفاء کروں گا:۔

پہلی چیز جسے اس احتساب کے سلسلے میں خصوصیت سے ملحوظ رکھنا چاہیئے نیت کا اخلاص ہے۔ اہلِ ایمان کی نیتوں کا خلوص شیطان کے لئے حد درجہ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی شعلہ بار نگاہیں اسے برابر گھورتی رہتی ہیں اس کے لئے یہ لڑائی کا ایسا محاذ ہوتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اور اگر اسے توڑ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسرے سارے مورچے آپ سے آپ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ گویا اکیلے اس محاذ کا ختم ہو جانا پوری لڑائی کے ہر جانے کے ہم معنے ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد نہ نماز نماز رہ جاتی ہے نہ زکوٰۃ زکوٰۃ رہ جاتی ہے دعوت الی اللہ، نصرتِ اسلام اور اقامتِ دین کے صرف دعوے اور الفاظ رہ جاتے ہیں۔ ان کے اندر سے معنویت اسی طرح غائب ہو جاتی ہے جس طرح دل کی حرکت بند ہو جانے سے جسم سے زندگی ناپید ہو رہتی ہے۔ اس خوفناک بلا کے خطروں سے مامون تو کوئی بھی نہیں ہوتا، مگر جو شخص جتنی ہی زیادہ نمایاں دینی پوزیشن رکھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ ان خطروں کی زد میں رہتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے ذمہ دار اور اصحابِ امر، خواہ وہ کسی درجے کے ہوں، اپنے اپنے دائروں میں بہرحال ایک خاص پوزیشن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ پوزیشن بجائے خود بھی کمزور آدمی کے لیے فتنہ کا سامان بن جاسکتی ہے، نفس آسانی سے اسے یہ وہم دلا سکتا ہے کہ امارت کا یہ منصب اس کے لیے ایک اعزاز اور وجہ افتخار ہے، حالانکہ فی الاصل وہ ایک بھاری ذمہ داری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا لیکن اگر اس منصب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت نے اسے کسی مخصوص اور نمایاں قسم کی صلاحیت سے بھی نواز رکھا ہو ـــ مثلاً تحریر و تصنیف کی صلاحیت، یا تقریر و خطابت کی صلاحیت، یا مؤثر افہام و تفہیم کی صلاحیت، یا حسن کارکردگی کی صلاحیت ـــ تو پھر خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے اور غافل شخص بڑی آسانی سے تعلّی کا شکار اور شہرت کا حریص بن جاتا ہے۔ اپنی کسی اچھی صلاحیت پر لوگوں کی تحسین سے خوشی محسوس کرنا تو کوئی معیوب بات نہیں، مگر جب یہ خوشی آگے بڑھ کر اپنی شخصیت کی بلند قامتی کے احساس فخر میں تبدیل ہو جائے تو پھر بڑی تباہ کن بیماری بن جاتی ہے۔ اس طرح کا احساس نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک انتہائی ناپسندیدہ چیز ہے، بلکہ وہ تحریر و تقریر کے منھ کو بھی مار دیتا ہے، اور بات کا اثر بس اپنی ایک لپک سی دکھا کر ختم ہو رہتا ہے۔ اور یہ اس تحریک کے حق میں ایک بڑی خیانت اور ایک بڑا ظلم ہے جس نے اسے امارت کی کوئی چھوٹی یا بڑی ذمہ داری سپرد کی ہوتی ہے۔

۴۔ شرائع کی پابندی میں عزیمت کا رویہ

احتساب نفس کے ضمن میں، تحریکی نقطۂ نظر سے، دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ذمہ داران تحریک کو شرائع کی پابندی میں بالخصوص ان کی دونوں عملی بنیادوں ــــ نماز اور زکوٰۃ ــــ کے بارے میں نسبتاً زیادہ عزیمت کا رویہ اختیار کیے رہنا چاہیے، اور معمولی معمولی عذرات کی آڑ ہرگز نہ لینی چاہیے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک بار ایک نابینا صحابیؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "میں ایک اندھا آدمی ہوں، اور مدینہ کی بستی میں سانپ بچھو اور درندے کثرت سے نکلا کرتے ہیں، کوئی ایسا شخص بھی میسر نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا کرے، اس لیے حضور اجازت دے دیں کہ میں نماز گھر ہی میں پڑھ لیا کروں۔" آپ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ اجازت حاصل کر کے جب وہ صاحب لوٹ کر جانے لگے تو انہیں واپس بلا کر آپ نے پوچھا۔ هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلٰوةِ (کیا تمہیں نماز کی اذان سنائی دیا کرتی ہے؟) انھوں نے جواب دیا کہ "نَعَمْ" (ہاں حضور سنائی تو دیتی ہے) یہ سن کر آپ نے انھیں ہدایت فرمائی "فَاَجِبْ" (تو پھر اس کا جواب دیا کرو) یعنی پھر تو تمہیں مسجد آنا ہی چاہیے ــــ اس حدیث سے اندازہ لگائیے کہ عام اور معمولی عذرات کی بات اللہ و رسول کی نظر میں کتنی بے وزن ٹھہرا کرتی ہوگی۔

فقہی رخصتوں کا معاملہ بھی عذرات کے معاملے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اصحاب امر کو ان رخصتوں سے فائدہ اٹھانا بالکل زیب نہیں دیتا، الا آں کہ خود شریعت ہی نے کسی رخصت پر عمل کرنے کو واجب یا مستحسن قرار دے رکھا ہو۔ رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کا مزاج دراصل دینی مزاج کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ دینی مزاج کی خامی ایک عام مسلمان اور ایک عام فرد تنظیم کے حق میں بھی کچھ کم افسوس ناک چیز نہیں، لیکن تحریک اسلامی کے اصحاب امر کے حق میں تو اسے قابل ملامت ہی کہا جائے گا۔ کیونکہ اس خامی کے اثرات صرف انہی کی ذات تک محدود نہ رہیں گے، بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ان کے مامورین پر بھی پڑ کر رہے گا۔ اور یہ تحریک کا اتنا بڑا زیاں ہوگا جسے کوئی بھی حساس شخص انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

اصحاب امر کا مامورین کے ساتھ رویہ

یہ تو وہ خاص خاص اہم باتیں تھیں جو اصحاب امر کے اپنے احتساب نفس اور اپنی اصلاحِ ذات

سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ان ذمہ داریوں کی طرف آئیے جو ان پر ان کے مامورین کی نسبت سے عائد ہوتی ہیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصحاب امر کو اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے لیے کن صفات سے خاص طور پر متصف ہونا اور کن طور طریقوں پر کاربند رہنا ضروری ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اصحاب امر اور ان کے مامورین کے درمیان رابطہ تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا واضح اصولی جواب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشہور ارشاد میں موجود ہے۔

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته. الامام راع ومسئول عن رعيته ...... الخ (بخاری)

تم میں کا ہر شخص راعی اور نگراں ہے اور تم سب کو اپنی اپنی رعیتوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کا سربراہ ایک راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

یہ فرما کر آپ نے چند اور اقسام کے راعیوں اور ان کی رعیتوں کی نام بنام مثالیں دے کر بات کو پوری طرح واضح کر دیا۔ اس ارشاد نبوی کے مطابق تحریکوں کے ذمہ دار اور اصحاب امر بھی ایک خاص نوعیت کے راعی اور نگراں قرار پاتے ہیں، اور دنیا اور آخرت، دونوں ہی جگہ وہ اپنی اپنی رعیتوں کے، یعنی اپنے مامورین اور اپنے زیر نگرانی افراد تحریک کے بارے میں جواب دہ ٹھہرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے جو راتوں کی نیند اڑا دے سکتی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی انجام دہی کا اجر بھی بہت بڑا ہے۔

یہاں اس بھاری ذمہ داری کی نوعیت بھی سمجھ لینی چاہیے۔ یہ ایک واضح اصولی بات ہے کہ مختلف قسم کے راعیوں کی ذمہ داریاں مختلف نوعیتوں کی ہوں گی، جن کا تعین ان راعیوں کی رعیتوں کے مفاد اور مصالح کی بنیاد ہی پر ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں تحریکی ذمہ داریاں اور مسئولیتیں اپنے مامورین کے تئیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں کہ جس مقصد کی خاطر یہ لوگ ان کی رہنمائی اور نگرانی میں دیے گئے ہیں، وہ انھیں اس مقصد کے کام کے آدمی بنائیں، ان کے اندر اپنے تحریکی نصب العین کے حق میں زیادہ سے زیادہ ذہنی یکسوئی پیدا کریں اور اس کی خاطر جد و جہد کا حوصلہ پروان چڑھائیں، ان انفرادی اور اجتماعی

اوصاف سے انھیں بیش از بیش آراستہ کرتے رہنے کی فکر اور کوشش کریں جو تحریک کو مطلوب اور اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہیں۔

اصحاب امر اور مامورین کے درمیان تحریکی تعلق کی نوعیت اور اس کے تقاضے معلوم ہو جانے کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن صفات سے، جن کا حامل ہونا اور ان رویوں سے، جن کا اختیار کرنا اصحاب امر کے لیے ضروری ہے، واقفیت حاصل کر لی جائے۔

۱۔ نرم خوئی و نرم گیری

پہلی ضروری چیز نرمی اور لینت کی صفت ہے۔ اصحاب امر کو اپنے مامورین کے ساتھ ممکن حد تک نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے، اور اگر کبھی خود مفاد تحریک کا تقاضا ہو کہ ان کی گرفت کی جائے تو اس گرفت میں بھی حتی الوسع سخت گیری سے بچنا چاہیے پھر اتنی بات بھی کافی نہیں ہے کہ یہ نرم رویہ محض تدبیر اور پالیسی کے طور پر اپنا لیا گیا ہو، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ یہ تا حد امکان ان کا مزاج بن گیا ہو۔ یہ روش اور صفت سب سے زیادہ جس چیز کے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ تحریک کی ہیئت اجتماعیہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ہیئت اجتماعیہ اپنی صحت اور اپنے اندرونی استحکام کے لیے بڑی حد تک اصحاب امر کی اسی نرم روی پر انحصار کرتی ہے۔ جہاں کسی تحریک کا اجتماعی نظم اپنے اس سامان بقا سے محروم ہوا۔ اس کا نظام اعصاب اسی طرح ٹوٹ کر رہ جائے گا جس طرح کسی زلزلے کے بعد پختہ عمارتیں بھی اندر سے چٹخ کر رہ جاتی ہیں۔ انسانی فطرت کے خالق نے کسی اور کو نہیں، خود اپنے پیغمبر اعظم صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک بڑے اہم واقعے کے بعد مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ	سو یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ تم (اپنے)
وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ	ان ساتھی اہل ایمان) کے لیے نرم ہو۔ ورنہ
لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ	اگر کہیں تند خوا ور سخت دل ہوتے تو لوگ
(آل عمران - ۱۵۹)	تمہارے پاس سے چھٹ گئے ہوتے۔

سوچیے اور بار بار سوچیے کہ جب تند خوئی اور سخت دلی کے ساتھ رسالت پناہ جیسی عظیم اور بے مثال شخصیت کے لیے بھی اپنے لوگوں کی جمعیت کو برقرار رکھ سکنا ممکن نہ ہوتا تو دوسرے کس شمار و قطار میں ہیں معلوم ہوا کہ نرم مزاجی جہاں انسان کی سیرت کا ایک دل کش حسن ہے، وہاں اینٹوں کو مضبوطی سے جوڑے

رکھنے کا ایک ناگزیر ذریعہ بھی ہے۔ اس کے بغیر تحریک کا اجتماعی نظم پائیدار ہو ہی نہیں سکتا
یہ نرم خوئی کس پائے کی ایمانی صفت ہے، اسے جاننے اور سمجھنے کے لیے قرآن کریم کا یہ
بیان کافی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی فی الواقع اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کا
عطیہ تھی۔ آں حضرتؐ نے بھی اس وصف کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:۔

من یُحْرَمِ الرفقَ یُحْرَمِ الخیرَ کلَّهٗ (بخاری)	جو شخص نرم مزاجی سے محروم ہو، وہ (گویا) ساری بھلائیوں سے محروم ہے

غور کیجیے کہ جب نرم مزاجی سے محرومی آدمی کو اپنی شخصی زندگی میں ساری بھلائیوں سے
محرومی کا باعث بن جاتی ہے تو یہ جماعتی زندگی کے لیے کیا کچھ مصیبتیں نہ پیدا کردے گی اگر
خدانخواستہ اس کے اصحاب امر اس محرومی کا شکار رہوں؟
نرم خوئی، رفق اور لینت سے محرومی کے معنے تند خوئی اور سخت گیری کے ہیں۔ سخت مزاج امراء
حکام نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم ہیں کہ رحمۃ للعالمین اور رؤف رحیم
ہونے کے باوجود آپ ان کے حق میں دلوں کو ہلا دینے والی یہ بد دعا کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اللّٰھمَّ من ولِیَ مِنْ اَمْرِ اُمّتی شیئًا فشق علیھم فاشقُق علیہ (مسلم)	اے اللہ جو کوئی میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار ہوا اور وہ لوگوں پر سختی کرے، تو اس پر تو سختی کر۔

سختی اور سخت گیری کا یہ ہولناک انجام سامنے رکھیے۔ نرمی اور نرم خوئی کی قدر و قیمت
آپ سے آپ معلوم ہو جائے گی۔
۲۔ **عفو و درگذر** نرم خوئی اور لینت سے نہایت قریبی تعلق رکھنے والی ایک خاص صفت
جماعتی معاملات میں عفو و درگذر سے کام لینے کی صفت ہے جس سے اصحاب امر کا متصف رہنا
خصوصیت سے انتہائی ضروری ہے۔ عفو و درگذر کی مدح و منقبت سے، اور اس کی ترغیب و
تاکید سے کتاب الٰہی بھری پڑی ہے اور رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اس کی
جیتی جاگتی تصویر ہے۔ غزوۂ احد کے موقع پر مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی سے لڑائی کا پانسہ
یکایک مشرکوں کے حق میں پلٹ گیا تھا اور اس کے نتیجے میں بہت سے صحابہؓ کی شہادت کا، اور خود

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہو جانے کا المناک سانحہ پیش آگیا تھا۔ مسلمانوں کی یہ غلطی کوئی معمولی غلطی نہ تھی۔ دنیا کا کوئی اور سپہ سالار ہوتا تو ایسے لوگوں کا کورٹ مارشل کرکے انھیں بدترین سزائیں دیے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان خطاکار لشکریوں کے حق میں کسی اقدام کی بات سوچی تک نہیں اور عفو عام سے کام لیا جس کی اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تصویب فرمائی، بلکہ تحسین بھی کی، اور اسے اپنی رحمت کا ثمرہ قرار دیا، جیسا کہ آپ ابھی فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ کے الفاظ الٰہی میں سن چکے ہیں۔ اور پھر اس تحسین ہی پر اکتفا نہیں کر لیا بلکہ ساتھ ہی آپ کو اس بات کی ہدایت بھی کی کہ:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

انہیں معاف کردو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو، اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔

مقصود اس ہدایت کا یہ تھا کہ انہیں معاف کرنے ہی تک اپنی روش کو محدود نہ رکھو، بلکہ آگے بھی ایسا رویہ اختیار کرو جس سے انھیں اطمینان ہو جائے کہ یہ معافی کوئی رسمی اور قانونی معافی نہیں ہے بلکہ حقیقی معافی ہے۔ زبان مبارک ہی نے نہیں، قلب اطہر نے بھی انہیں معاف کر دیا ہے اور اب ان سے سرزد ہو جانے والی غلطی کا کوئی انقباضی اثر آپ پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

مقتدائے عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جانے والی اس ہدایت میں عام افراد امت کے لیے بالعموم اور کسی طرح کی جماعتی ذمہ داریاں رکھنے والوں کے لیے بالخصوص، رہنمائی کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ اس امر کی کھلی ہوئی تلقین ہے کہ جماعتی معاملات میں اگر عام افراد سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اصحاب امر کو عفو و درگذر سے کام لینا چاہیے، اور یہ کہ یہ عفو و درگذر صدق دل سے ہو، محض قانونی انداز کا نہ ہو۔ بلاشبہہ یہ کوئی لازمی کلیہ نہیں ہے، اور بعض اوقات خود تحریک ہی کا مفاد تقاضا کرتا ہے کہ اس موقع پر سرزنش سے کام لیا جائے۔ لیکن یہ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں۔ عام روش عفو و درگذر ہی کی رہنی چاہیے۔ اس کے بغیر جماعتی نظم میں باہمی حسن تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔

۳۔ صبر و تحمل

نرم خوئی سے ایسا ہی قریبی تعلق رکھنے والی ایک اور بھی ضروری صفت صبر و تحمل کی صفت ہے

یہاں صبر و تحمل سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر نا روا حملوں کے موقع پر اپنا غصہ پی جائے۔ اشتعال انگیز حالات میں برداشت سے کام لینا عام طور سے بہت مشکل ہوتا ہے، مگر جس قدر یہ چیز کڑوی ہوتی ہے اسی قدر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے، اور تحریکی زندگی کے لیے تو یہ پھل مقوی غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی اسلامی تحریک کے سربراہ اگر خدانخواستہ اپنے اندر صبر و تحمل کا مادہ نہ رکھتے ہوں تو صرف ان کی اپنی ذات ہی نہیں، تحریک بھی اس کا خمیازہ بھگتنے سے نہیں بچ سکتی۔ اصحاب امر کو اپنی ذات پر ہونے والی ناروا تنقیدوں سے سابقہ پیش آنا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ ہر تنظیم میں ایسے خام کار لوگ موجود ہوا ہی کرتے ہیں جو حدود کا لحاظ نہیں رکھ پاتے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے اگر اشتعال انگیز حرکتیں ہو جائیں تو ان پر غصہ کا آنا فطری ہے اور یہ شرعاً بھی کوئی مذموم چیز نہیں ہے۔ مذموم بات صرف یہ ہے کہ غصہ کے عالم میں صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا جائے۔ زندگی کے ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہی ایک مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہے۔ آپ کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ آپؐ نے اپنی ذات کے خلاف ہونے والی کسی زیادتی کا کبھی انتقام نہیں لیا، بلکہ ہر بات پر صبر کیا۔ مثال کے طور پر دو واقعات کا سن لینا کافی ہوگا: پہلا واقعہ غزوۂ حنین کے موقع کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ "جنگ حنین میں حاصل ہونے والے اموال غنیمت کو حضورؐ نے جب لوگوں میں تقسیم کیا تو (دعوت اسلامی کے پیش نظر) کچھ اشراف عرب کو باقی لوگوں پر اس معاملے میں ترجیح دی اور انھیں نسبتاً زیادہ دیا۔ ایک انصاری شخص نے یہ دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ واللہ ھذہ قسمۃ ما عدل فیھا وما اُرید فیھا وجہ اللہ (بخدا یہ ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے اور اس میں اللہ کی رضا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے) جب آپ تک یہ بات پہنچی تو چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ سرخ رنگ کی طرح لال ہو گیا۔ مگر صرف اتنا فرما کر آپؐ خاموش ہو رہے کہ:۔

فمن یعدل اذا لم یعدل	اگر اللہ اور اس کا رسول ہی عدل نہ
اللہ ورسولہ، ثم قال یرحم	کرے گا تو پھر اور کون کر سکتا ہے؟ پھر
اللہ موسیٰ قد اوذی باکثر	فرمایا "اللہ موسیٰ کو اپنی رحمت سے
من ھذا فصبر (بخاری)	نوازے، ان کو اس سے بھی بڑھ کر دل آزاری کی

کی گئی تھی، مگر انھوں نے ہر بات پر صبر کیا (بخاری)

دوسرا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائے جانے والے بہتانِ عظیم کا ہے۔ اس واقعے کے نتیجے میں مسلسل ایک ماہ تک آپ نے جس قلبی اذیت کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اتنا کچھ ہو جانے پر بھی صبر و تحمل کے اس پیکر مقدس نے ایسی عالی ظرفی سے کام لیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ دونوں واقعات ایسا آئینہ ہیں جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ صبر و تحمل کی پوری کیفیت دیکھی جا سکتی ہے۔ آپ کے اس اسوے میں افراد ہی کی ایمانی زندگی کا نہیں، جماعت کی بھی اندرونی صحت و توانائی کا راز چھپا ہوا ہے۔

۴۔ فروتنی

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اُن کے اہلِ ایمان اصحابؓ کے سلسلے میں جو مختلف ہدایتیں دی تھیں، ان میں سے ایک اہم ہدایت یہ بھی تھی کہ:۔

واخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنين (الشعراء ۲۱۵)	اپنے اہلِ ایمان پیرووں کے لیے اپنے بازووں کو جھکائے رکھو۔

بازووں کو جھکائے رکھو، یعنی فروتنی اور تواضع کا رویہ اپنائے رکھو۔ تواضع اگرچہ بجائے خود ایک اعلیٰ انسانی جوہر اور ایمانی صفت ہے لیکن آیت کا موقع کلام اور اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں آپؐ کو اس کی تلقین، دعوتِ اسلامی کے مفاد کے خصوص میں کی گئی ہے۔ اور یہ مفادِ دعوت یہ تھا کہ آپ کا یہ متواضعانہ رویہ پیروانِ اسلام کے اندر آپ کی ذات اور دعوت، دونوں سے گرویدگی پیدا کرے گا۔ جب حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے داعیِ حق اور رہبر راہ کو بھی اپنے نصب العین کی خاطر کامیاب جد و جہد کرنے کے لیے اپنے پیرووں کے ساتھ فروتنی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی تو دوسروں کو یقینی طور پر بدرجۂ اولیٰ ہوگی، اور اس سے صرفِ نظر کر کے کوئی سربراہ بھی اپنے تحریکی منصب کا حق ادا نہیں کر سکتا۔

لیکن فروتنی و خود شکنی کی روش، اختیار کیے رہنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے اور عام لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے جو کوئی نمایاں پوزیشن رکھتے ہوں کیونکہ یہ پوزیشن ان کے لیے ایک فتنہ بن جانے کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے تحریکی

سربراہوں کے لیے اس خلق کریم سے بہرہ ور ہونا بڑا ذہنی ریاض چاہتا ہے۔ اس ذہنی ریاض کی پہلی ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کی صحیح نوعیت کا گہرا شعور حاصل ہو۔ پھر یاد کر لیجیے کہ کسی اسلامی تحریک میں مناصب کی حیثیت اصلاً نہ تو کسی استحقاق کی ہوتی ہے نہ کسی اعزاز کی ہوتی ہے، بلکہ ایک ہمت آزما بھاری ذمہ داری کی ہوتی ہے۔ اصحاب امر کی فروتنی، اگر وہ فی الواقع فروتنی ہو، وہ کیمیا ہے جو انھیں زرِ خالص بنا دینے میں بڑا اہم رول انجام دیتی ہے۔ یہ بظاہر ایک پستی ہوتی ہے، مگر فی الواقع عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے کہ:

...... مَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰہِ اِلَّا رَفَعَہُ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ (مسلم)	جو شخص اللہ کے لیے متواضعانہ روش اختیار کرتا ہے، اللہ بزرگ و برتر اسے بلند کر کے رہتا ہے۔

فروتنی اور تواضع کا یہ ثمرہ تو آدمی کی اپنی ذات کو ملتا ہے۔ تحریک کو اس کا فائدہ اس سے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ ایسے اصحاب امر اپنے مامورین کی نگاہوں کا تارا بن جاتے ہیں۔ اور ان کی امارت ان لوگوں کے ظاہر ہی کی طرح ان کے دلوں اور دماغوں پر بھی قائم ہو جاتی ہے۔ اور فی الواقع ایسے ہی اصحاب امر وہ اصحاب امر ہوتے ہیں جو اپنے مامورین کے اندر طاعتِ امر کا، اور دعوتی جذبۂ جہد کا ولولہ پیدا کر سکتے اور اسے بیدار رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے اچھے امراء اور حکام انہیں قرار دیا ہے جن سے ان کو دلی محبت ہو:-

خِیَارُ اَئِمَّتِکُمُ الَّذِیْنَ تُحِبُّوْنَھُمْ وَیُحِبُّوْنَکُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَیْھِمْ وَیُصَلُّوْنَ عَلَیْکُمْ (مسلم)	تمہارے اچھے امام و پیشوا وہ ہیں جن کو تم محبوب رکھو اور جو تم سے محبت رکھیں، جن کے لیے تم دعائے رحمت کیا کرو اور جو تمہارے لیے دعائے رحمت کریں۔

جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا، امراء و ذمہ داران تحریک کے لیے محبوبیت کے اس مقام کا حاصل ہونا بہت کچھ ان کے متواضعانہ رویے پر موقوف ہے۔

۵۔ مامورین کی خیر خواہی | اپنے زیر امارت افراد کی دلی خیر خواہی بھی اُن خاص اور

اہم صفات میں سے ایک ہے جن سے ذمہ داران تحریک کا متصف رہنا ضروری ہے، ورنہ وہ کبھی کامیاب صاحب امر نہیں بن سکتے۔ یہ ان کے عین منصب کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مامورین کی بھی خواہی کو اپنے فکر و عمل کا جزو بنائے رکھیں، جہاں تک ممکن ہو ان کے نجی حالات سے بھی بے خبر نہ رہیں اور اگر وہ کسی مشکل سے دوچار ہوں تو اس کے حل میں ان کی لازماً معاونت کریں۔ یہ ان کی شرعی ذمہ داری ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:۔

ما من امیر یلی امور المسلمین	ہر وہ امیر، جو مسلمانوں کے معاملات کا نگراں
ثم لا یجھد لھم و لا	و ذمہ دار ہو، مگر وہ ان کے بھلے کے لیے
ینصح لھم الا لم یدخل	جد و جہد نہ کرے نہ ان کی خیر خواہی کرے،
معھم الجنۃ (مسلم)	وہ ان کے ساتھ جنت میں نہ داخل ہو سکیگا

اور یہ کہ:۔

من ولاہ اللہ شیئا من امور	جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی
المومنین فاحتجب دون	معاملے کا بھی والی و انتظام کار بنایا،
حاجتھم وخلتھم وفقرھم	وہ اگر ان کی ضرورتوں، حاجتمندیوں
احتجب اللہ دون حاجتہ	اور ناداریوں کے مسائل اپنے تک نہ پہنچنے
وخلتہ وفقرہ یوم	دے، تو قیامت کے دن اللہ اس کی
القیامۃ (ترمذی)	ضرورتوں، حاجتمندیوں اور ناداریوں

اپنے مامورین کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے کی یہ اہمیت تو اخروی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ تحریکی اور تنظیمی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ مامورین کی نفسیات پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اپنے ذمہ داروں کے ساتھ ان کی محبت اور الفت میں اضافہ ہوتا ہے، دوسری طرف تحریک کے فروغ کے لیے ان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ متحرک سے متحرک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں نتائج الٹے نکلتے ہیں۔ ذمہ داروں اور مامورین کے درمیان وہ قربت باقی نہیں رہتی جو رہنی چاہیے اور پھر تحریک کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو یاد کیجیے۔ آپ جماعت المسلمین کے ساتھ جس محبت، شفقت اور بہی خواہی کا برتاؤ کرتے اور ان کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا جتنا خیال رکھتے

تھے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ایک صحابی رضی کا یہ بیان مذکور ہے کہ "ہم کچھ نوجوان، جو سب کے سب تقریباً یکساں عمر کے تھے، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ کے پاس بیس روز تک ٹھہرے رہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بڑے رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ آپ نے از خود محسوس کر لیا کہ ہمیں اپنے اہل وعیال کی یاد آ رہی ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی آپ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ اپنے گھروں پر کن کن کو چھوڑ کر آئے ہو۔ ہم نے جوبات تھی بتادی۔ صورت حال معلوم کر کے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم وعلموھم و مروھم	اپنے اہل وعیال کے پاس واپس جاؤ، ان کے درمیان مقیم رہو، اور انھیں دین سکھاتے اور اچھے کاموں کی تلقین کرتے رہو۔

۶۔ اصلاح و تربیت کا حکیمانہ انداز

قرآن کریم نے دعوت الی اللہ کے جو اصولی طریقے تلقین فرمائے ہیں، ان میں سے ایک "موعظہ حسنہ" کا اصول بھی ہے۔ اس "موعظت حسنہ" کے اصول کو اسلامی تحریکوں کے نظام تربیت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھنا چاہیے۔ پند و نصیحت اگر مخلصانہ اور درد مندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کا انداز بھی لیے ہوئے ہو تو اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے، اور اصلاح و تربیت کے سو پروگراموں اور رسمی تدبیروں پر بھاری ثابت ہوتی ہے۔ مربی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اصلاح و تربیت کا عام طور سے جو طریقہ اپنایا کرتے تھے اور اس کے جو نتائج نکلتے تھے، اس کی صرف دو مثالیں سن لیجیے۔ سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ ایک بار آپ نے حضرت خریم الاسدی کے بارے میں فرمایا:۔

نعم الرجل خریم الاسدی لولا طول جمتہ واسبال ازارہ	خریم بڑے اچھے آدمی ہیں، کاش ان کے بالوں کی لٹ اتنی لمبی، اور ان کی تہ بند نیچے تک لٹکی نہ ہوتی۔

نتیجہ اس طرز تربیت کا حسب توقع یہ نکلا کہ حضور کے یہ الفاظ حضرت خریم تک پہنچے تو دل میں تیر بن کر اتر گئے، انھوں نے ایک چھری اٹھائی اور اپنی لٹوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی طرح بخاری شریف کی روایت ہے کہ آپ نے اپنے ایک صحابی، حضرت عبداللہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:۔

نعم الرجل عبد الله لو — عبداللہ خوب آدمی ہیں، کیا اچھا ہوتا
کان یصلی باللیل — کہ وہ رات میں نماز بھی پڑھا کرتے۔

حضرت عبداللہ کو جب حضورؐ کا یہ ارشاد معلوم ہوا تو ذہن نے مثبت فیصلہ کرلیا اور پھر وہ راتوں میں بہت کم سونے لگے۔

آدمی جن خامیوں کا شکار ہوتا ہے اور جن کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں:۔ ایک تو کردار کی خامی، دوسرے اندازِ فکر کی خامی۔ کردار کی خامی کی اصلاح کے سلسلے میں حضورؐ کا انداز بالعموم ایسا ہی حکیمانہ اور مشفقانہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ اندازِ فکر کی خامی آپ کی نگاہ میں زیادہ قابلِ توجہ اور قابلِ گرفت قرار پاتی تھی۔ اس لیے اس کی اصلاح کے اندر حکمت کے ساتھ تنبیہ اور قدرے زجر و توبیخ کا عنصر بھی شامل ہوا کرتا تھا، اور وہ بالعموم "مابال اقوام" کے لفظوں سے شروع ہوتا تھا۔ یعنی آپؐ ایسے مواقع پر یوں فرمایا کرتے کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے یا ایسا ایسا کہتے ہیں۔ گویا ایسے مواقع پر بھی آپ فکری خامی کا مظاہرہ کرنے والوں کے نام لیے بغیر نصیحت اور تنبیہ بالکل عمومی انداز میں فرمایا کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ کلام آپؐ اس مصلحت کی خاطر اختیار فرماتے کہ لوگوں میں کہیں ناگواری کا جذبہ نہ ابھر آئے اور اس طرح نصیحت و تنبیہ کا مقصد ہی فوت ہوکر نہ رہ جائے۔

اصلاح و تربیت کے بارے میں ہمیں بھی اسی اسوے کی پیروی کرنی چاہیے۔ کیونکہ اس اندازِ تربیت سے بہتر انداز دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ تھیں وہ چند ضروری یاد دہانیاں جو اس موقع پر آپ حضرات کو کرا دینی مناسب معلوم ہوئیں۔ خدا کرے کہ انھیں دل کے کانوں سے سنا گیا ہو، اور ہم اپنے مدعا کو، کسی نہ کسی حد تک ہی حاصل کرلینے میں کامیاب ہوجائیں۔

گفتگو ختم کرنے سے پہلے ایک کھٹک کا دور کردینا ضروری ہے جو ان معروضات کے سننے سے بعض ذہنوں میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بحث میں جن آیتوں اور حدیثوں کے حوالے دیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر کا راست تعلق اصلاح اور حکومتی امراء و حکام سے ہے۔ تحریکی اصحاب امر

نہیں۔ بلاشبہ حقیقت واقعی یہی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس سے کوئی بڑا اور بنیادی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان آیتوں اور حدیثوں میں جو اصل روح کارفرما ہے وہ تحریکی ذمہ داروں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری اور واجب لاقتضا ہے جتنی اصطلاحی امرا و حکام کے لیے ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ آیات و احادیث سربراہان تحریک کے لیے اور زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اصطلاحی امرا و حکام کو بنا بنایا اسلامی معاشرہ ملا ہوتا ہے، جبکہ تحریکوں کے سربراہوں کو اسلامی معاشرہ بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا کام ان کے مقابلے میں دوگنا بھاری ہوتا ہے۔ پھر اصطلاحی امرا و حکام کے پاس اقتدار کی طاقت ہوتی ہے، اس لیے اگر وہ اخلاقی حیثیت سے کچھ خام ہوں، تب بھی اپنا فرض منصبی کسی نہ کسی حد تک انجام دے ہی سکتے ہیں لیکن تحریکوں کے اصحاب امر کی کل طاقت ان کی یہی اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔ اس لیے اگر خدانخواستہ وہ اس سے تہی دامن رہ گئے تو اپنے فرض کی ادائی میں ناکام ہو جانے سے نہ بچ سکیں گے۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ٥

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

(آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو)

اصل میں لفظ "لمز" استعمال ہوا ہے جس کے اندر طعن و تشنیع کے علاوہ متعدد دوسرے مفہومات بھی شامل ہیں۔ مثلاً چوٹیں کرنا، پھبتیاں کسنا، الزام دھرنا، اعتراض جڑنا، عیب چینی کرنا اور کھلم کھلا یا زیر لب یا اشاروں سے کسی کو نشانہ ملامت بنانا۔ یہ سب افعال بھی چونکہ آپس کے تعلقات کو بگاڑتے اور معاشرے میں فساد برپا کرتے ہیں اس لیے ان کو حرام کر دیا گیا ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

سورۃ الحدید کی آیت ۴ کا یہ چھوٹا سا جملہ وھو معکم اینما کنتم (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو) سننے والے یا پڑھنے والے کے ذہن کو جھنجھوڑ کر بیدار کرتا ہے اور اس کے سامنے ایک بڑی حقیقت کا وسیع میدان کھول دیتا ہے۔ اس میں ایک ایسا عقیدہ چھپا ہوا ہے جس کے بغیر انسانی زندگی کبھی درست نہیں ہوئی اور کبھی درست نہیں ہو سکتی۔ یہ عقیدہ کہ اللہ ہر جگہ ہمارے ساتھ ہے اور رات پردوں میں بھی ہماری کوئی حرکت اس کے دائرۂ علم سے باہر اور اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہے انسان کو انسانیت کی حدود پھلانگ جانے سے روکتا ہے۔ یہ عقیدہ درندگی سے بچا کر، ظلم و جور سے بچا کر، ناجائز شہوت رانی سے بچا کر انسان کو انسان بناتا ہے۔ اس عقیدے کے بغیر کوئی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا خلق خدا پر مہربان نہیں ہو سکتا۔ خدا کے دیے ہوئے قوانین کا نگہبان نہیں ہو سکتا۔ یہ عقیدہ انسان کو قانون کا نگہبان اور قانون ساز کا مطیع فرمان بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مختلف اسلوب سے یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ علیم ہے۔ سمیع ہے، بصیر ہے، قدیر ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے سب کچھ دیکھتا ہے اور ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔ کوئی اس کی گرفت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت دو طرح کی ہے۔ ایک کا تعلق اس کی ان صفات سے ہے جن کا ابھی اوپر ذکر گزرا یہ اس کی معیت عامہ ہے جس کے دائرے سے کوئی شے باہر نہیں ہے۔ اوپر قرآن کا جو جملہ نقل کیا گیا ہے اس میں اسی معیت کا ذکر ہے ایک مفسر اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"یعنی کسی جگہ بھی تم اس کے علم، اس کی قدرت، اس کی فرماں روائی اور اس کی تدبیر و انتظام سے باہر نہیں ہو۔ زمین میں، ہوا میں، پانی میں، یا کسی گوشۂ تنہائی میں، جہاں بھی تم ہو اللہ کو معلوم ہے کہ تم کہاں ہو، وہاں تمہارا زندہ ہونا بجائے خود اس کی علامت ہے کہ اللہ اسی جگہ تمہاری زندگی کا سامان کر رہا ہے۔ تمہارا دل اگر دھڑک رہا ہے، تمہارے پھیپھڑے اگر سانس لے رہے ہیں، تمہاری سماعت اور بینائی اگر کام کر رہی ہے تو یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ اللہ کے

انتظام سے تمہارے جسم کے سب کل پرزے چل رہے ہیں اور اگر کسی جگہ بھی تمہیں موت آتی ہے تو اسی وجہ سے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری بقا کا انتظام ختم کرکے تمہیں واپس بلا لینے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۴ ص ۳۰)

اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کے بیان سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ ان سب کو یہاں پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ اللہ نے اپنی معیت عامہ کو ایک اور جگہ اس انداز سے بیان کیا ہے۔

کیا تم کو خبر نہیں ہے کہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا اللہ کو علم ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے درمیان چوتھا اللہ نہ ہو۔ یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور چھٹا اللہ نہ ہو۔ خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ ان کو بتا دے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔" (المجادلہ: آیت: ۷)

یہ تمثیل سرگوشی کے وقت انسان کو یاد دلاتی ہے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے۔ یہ احساس اگر تازہ ہو تو بڑی بڑی تباہ کن سازشیں ہی نہیں معمولی نقصان پہنچانے والی چھوٹی چھوٹی سازشوں میں بھی کمی آجائے۔ اللہ کی ایک اور معیت وہ ہے جس کا تعلق اس کی نصرت و حمایت اور رحمت و محبت سے ہے۔ یہ اسکی معیت خاصہ ہے جو اس کے نبیوں اور رسولوں اور دوسرے نیک بندوں کو حاصل رہی ہے اور قیامت تک اس کے فرمانبردار اور پرہیزگار بندوں کو حاصل رہے گی۔ یہ ایک ایسی عظیم طاقت ہے جس کا زندہ احساس مچھلے کو باز کے مقابلہ میں اور چیونٹی کو ہاتھی کے مقابلہ لاکھڑا کرتا ہے اور دیکھنے والی آنکھ دیکھتی ہے کہ ممولے نے باز کو چیر ڈالا اور چیونٹی نے ہاتھی کو زیر کرڈالا کیونکہ ممولے اور چیونٹی کی پشت پر جو طاقت تھی کروڑوں باز اور لاکھوں ہاتھی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اس معیت کا احساس انتہائی خطرناک حالات اور انتہائی نازک مواقع پر بھی بندۂ خدا کو مطمئن رکھتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ ساتھ ہے اور اس کی طاقت بے کراں ہے۔ تصور کیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے تاکہ فرعون کی غلامی اور اس کے ظلم و ستم سے بچ کر آزاد فضا میں اللہ کی بندگی کریں۔ ان کا قافلہ بحر احمر کی طرف بڑھ رہا ہے، فرعون کو اس کی خبر ملی تو وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اپنا لاؤ لشکر لے کر بنی اسرائیل کے پیچھے دوڑتا ہے اور وہ ٹھیک اس وقت ان کے قریب پہنچا ہے جب سامنے بحر احمر کی موجیں مار رہا ہے پیچھے فرعون کا لشکر اور آگے سمندر، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی چیخ اٹھے کہ ہم تو پکڑے گئے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے

قَالَ كَلَّا ۖ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ (الشعراء ۶۲)

موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ضرور مجھے راستہ بتائے گا۔ (آیت ۶۲)

(بقیہ صفحہ ۸)

اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث روایت کی ہے۔ سورہ حشر کے آخری رکوع میں جو اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں ان میں ایک "سلام" ہے۔ امام نووی نے "السلام علیک" کا مطلب یہ لکھا ہے: "انت فی حفظ اللہ" (تم اللہ کی حفاظت میں ہو) جس طرح کہا جاتا ہے "اللہ معک" یعنی اللہ کی حفاظت ونصرت یا اس کی نگرانی تمہارے ساتھ ہے۔ السلام علیک کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تم کو سلامت رکھے اور یہ کہ تم میری طرف سے ہر نقصان سے محفوظ و مامون ہو، میں تمہارا دوست ہوں، دشمن نہیں ہوں۔ ان معانی کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پھیلانے اور رواج دینے کا جو حکم دیا ہے اس کی اہمیت کیا ہے۔

سلام کی ابتدا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، ان کے قد کی لمبائی ساٹھ ذراع تھی۔ پھر ان کی اولاد میں قد کی لمبائی اب تک کم ہوتی رہی ہے اور جنت میں داخل ہونے والا ہر فرد آدم کی صورت پر ہوگا۔ ان کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ یہ جو فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہے ان کے پاس جاؤ اور سلام کرو اور دھیان سے سنو کہ وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں۔ وہی جواب تمہاری اور تمہاری ذریت کے لیے تحیۃ ہوگا۔ آدم نے جاکر کہا۔ السلام علیکم۔ انھوں نے جواب دیا۔ السلام علیک ورحمۃ اللہ، فرشتوں نے "رحمۃ اللہ" کا اضافہ کیا [۱]

یہ حدیث امام مسلم نے بھی روایت کی ہے۔ یہاں تحیۃ سے مراد السلام علیکم کا دعائیہ کلمہ خیر ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کی ابتدا حضرت آدم کی تخلیق کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تعلیم سے ہو گئی تھی، اس سے بھی سلام کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

السلام علیکم میں الفاظ کا اضافہ

رحمۃ اللہ کا اضافہ تو اوپر کی متفق علیہ حدیث میں موجود ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم

[۱] بخاری کتاب الاستیذان۔ باب بدء السلام

کے پاس آئے اور کہا السلام علیکم آپ نے ان کو سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ بیٹھ گئے
تو آپ نے فرمایا "دس"۔ پھر دوسرے شخص آئے اور انھوں نے کہا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ
آپ نے جواب دیا اور وہ بیٹھے تو فرمایا "بیس" پھر ایک اور شخص آئے اور انھوں نے
کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ نے جواب دیا اور وہ بیٹھے تو فرمایا تیس[10]
ابوداؤد کی ایک حدیث میں "برکاتہ" کے بعد "ومغفرتہ" کا اضافہ بھی ہے۔ اوپر کی حدیث کی شرح
حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے :-

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے السلام علیکم کہا اس کے لیے دس
نیکیاں لکھی گئیں اور جس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں اور
جس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی گئیں۔[11]

یہ تشریح حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں بھی ہے جس کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت
کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول منقول ہے۔

قال رجل السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ ثم زاد شیئا فقال ابن عباس ان السلام قد انتهى الى البركة[12]	ایک شخص نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ اس کے بعد کچھ اور اضافہ کیا تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سلام وبرکاتہ پہ ختم ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی وبرکاتہ کے بعد کسی اضافے کو ناپسند فرمایا ہے (موطا)
معلوم ہوا کہ صحیح طور پر مکمل سلام جو ثابت ہے وہ یہ ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جہاں
تک جواب سلام کا تعلق ہے تو اس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام قرآن مجید میں دی ہے۔ سورہ
النساء میں شفاعۃ حسنہ (اچھی سفارش) کی ترغیب کے بعد فرمایا گیا ہے۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا (النساء ۸۶)	اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔

[10] ابوداؤد، باب کیف السلام۔ [11] الترغیب بحوالہ طبرانی۔ (۱۲) جمع الفوائد بحوالہ موطا مالک

اس آیت کے حاشیے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے:۔

"یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا در حقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے تو حق تعالےٰ شفاعت حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع ذائع ہے صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے۔ کہ جب کوئی اے مسلمانو تم کو دعا دے یا سلام کرے تو تم کو بھی اس کا جواب دینا ضرور چاہئے یا تو وہی کلمہ تم بھی اس کو کہو یا اس سے بہتر مثلاً اگر کسی نے کہا السلام علیکم تو واجب ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو اور زیادہ ثواب چاہو تو ورحمۃ اللہ بھی بڑھا دو اور اگر اس نے یہ لفظ بڑھایا ہو تو تم وبرکاتہ زیادہ کرد و۔ اللہ کے یہاں ہر ہر چیز کا حساب ہوگا اور اس کی جزا ملے گی سلام اور اس کا جواب بھی اس میں آ گیا۔"

(باقی آئندہ)

(بقیہ صفحہ ۵۳)

یہ ہے اللہ کی معیت کا وہ احساس جو انسان کو عزم وہمت کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھیوں نے دیکھا کہ سمندر پھٹ گیا وہ صاف بچ کر نکل گئے اور فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اسی سمندر میں غرق ہو گیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے نکلے اور احتیاطاً غار ثور میں جا چھپے، خون کے پیاسے دشمنوں نے اطراف مکہ کا چپہ چپہ چھان مارا وہ پاگلوں کی طرح ہر طرف دوڑتے پھر رہے تھے کہ کہیں بھی حضورؐ کو پائیں (نعوذ باللہ) آپ کا خاتمہ کر دیں۔ آخر کار وہ غار ثور کے قریب بھی جا پہنچے کتنا نازک موقع تھا وہ، کتنی خطرناک حالت تھی وہ، حضرت ابوبکرؓ جیسا شخص گھبرا اٹھا لیکن حضورؐ

اِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ (توبہ)

دنیا نے دیکھا دشمن ناکام واپس آگئے اور حضور اپنے ساتھی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

اسی قسم کی معیت تمام داعیان حق اور اللہ کے صالح متقی اور محسن بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّ الَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ (النحل ۱۲۸)

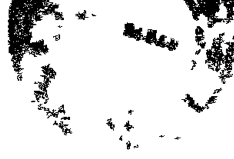
بلاشبہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں

اللہ والوں کو اس معیت کا احساس ہر جگہ رہتا ہے خواہ وہ دوستوں کے درمیان ہوں یا دشمنوں کے نرغے میں، جیلوں میں ہوں یا تختۂ دار پر۔

بہ جرم عشق تو ام می کشند غوغائیست
تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائے است

MONTHLY
ZINDAGI

R N.I./2188/57
MRD. 66
AUGUST 83

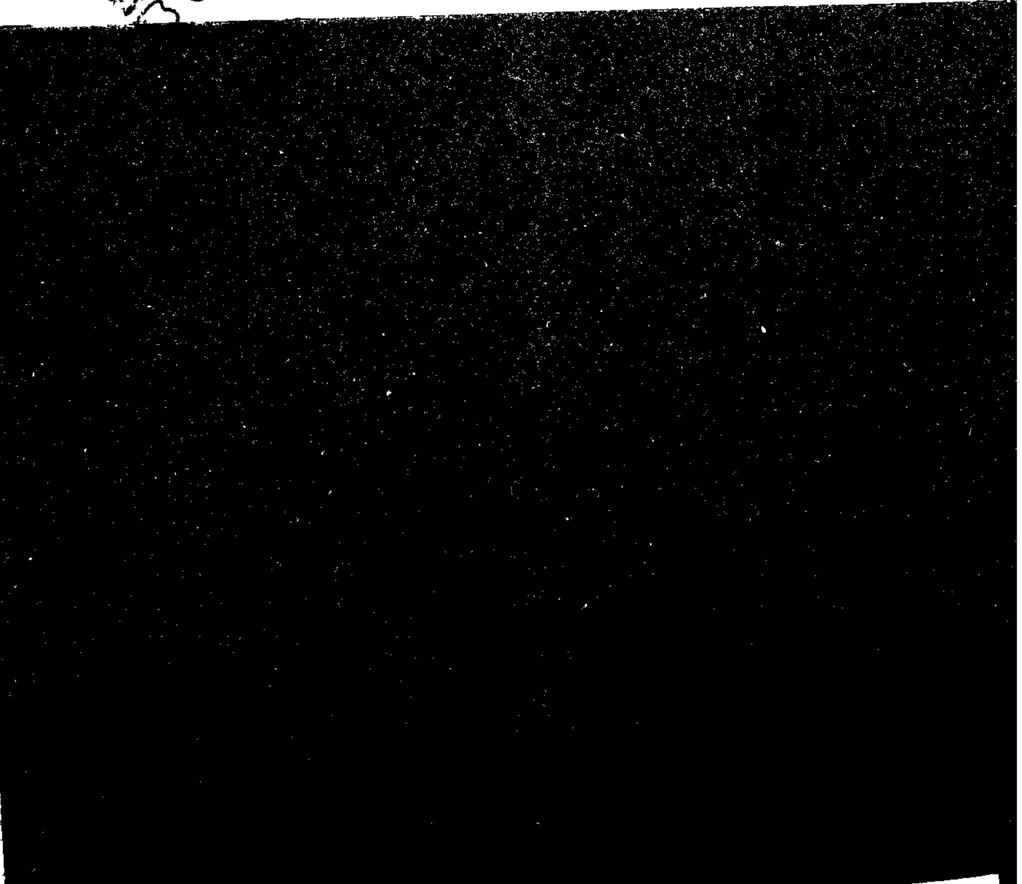


صرف نیشنل دلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

ماہنامہ

زندگی

رامپور



سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بذریعہ ہوائی ڈاک
۱۰۵/
بذریعہ بحری جہاز ۶۰/

ماہنامہ
زندگی رامپور

(مدیر۔ سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۳۰/-
ششماہی
ہندوستان سے ۱۶/
قیمت فی پرچہ ۳/-

جلد: ۷۱ | ذیقعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۳ء | شمارہ: ۳

اس دائرہ ( ) میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ انشاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا

منیجر زندگی ۱۵۲۵ سوئیوالان۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مالک۔ دعوت ٹرسٹ۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ زندگی رامپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

سچے اور پکے مسلمان کون لوگ ہیں؟ اس سوال کا جواب ہم قرآن سے حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ کسی نظریہ حیات کو قبول کرنے والوں کی دو بڑی قسمیں ہمیشہ رہی ہیں ایک قسم ان لوگوں کی جو کسی نظریہ یا کسی عقیدہ کو اپنے دل کی گہرائیوں اور اپنے پورے وجود سے قبول کرتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو کسی نظریہ یا عقیدے کو اوپر کے دل سے دوسروں کی تقلید میں مان لیتے ہیں منافقین یہاں زیر بحث نہیں ہیں یعنی وہ لوگ یہاں زیر بحث نہیں ہیں جن کی زبان کسی نظریہ یا عقیدہ کا اقرار کرتی اور ان کے دل اس کا انکار کرتے ہیں ۔ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو ایمان تو لے آتے ہیں مگر ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوتا ۔ اب ہمارے سامنے پہلی اور دوسری قسم کو پہچاننے کا مسئلہ آتا ہے ۔ ہم یہ کس طرح معلوم کریں کہ پہلی قسم میں کون لوگ داخل ہیں اور دوسری قسم میں کون لوگ ؟

دلوں کا حقیقی اور واقعی حال تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو علیم بذات الصدور (دلوں کا حال جاننے والا) ہے لیکن دونوں قسموں میں ایسی علامات ضرور پائی جاتی ہیں جن سے ہر ایک کا اندازہ کیا جا سکتا اور تشخیص کی جا سکتی ہے اور جہاں تک سچے اور پکے مسلمانوں کو پہچاننے کا تعلق ہے تو قرآن حکیم نے ان دونوں قسموں کو الگ الگ کر کے دکھا دیا ہے ۔ سچے اور پکے مسلمانوں کی جو علامتیں قرآن نے بتائی ہیں وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ہیں جو علیم بذات الصدور ہے اس لیے اس میں کسی شبہے کی گنجائش ہی نہیں ہے حقیقی مومنوں کی صفات و علامات متعدد سورتوں اور بہت سی آیتوں میں بیان کی گئی ہیں یہاں ان سب کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ہم صرف ان آیتوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں ہمارے

سوال کا براہ راست جواب "سچے اور حقیقی" کے لفظوں میں دیا گیا ہے۔ سورۂ البقرہ ترتیب کے لحاظ سے سب سے پہلی طویل سورۃ ہے۔ اس کی آیت ۱۷۷ کی تلاوت کیجیے۔ ہم یہاں ترجمہ نقل کر رہے ہیں :۔

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اپنا مال، اس کی محبت کے باوجود رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہی لوگ ہیں سچے اور یہی لوگ ہیں پرہیزگار

(البقرہ رکوع ۲۲ آیت ۱۷۷)

اس آیت کی پوری تفسیر و تشریح تو بہت تفصیل چاہتی ہے۔ ہم صرف اس کا حاصل یہاں پیش کرتے ہیں۔ اس آیت میں سب سے پہلے اہل کتاب پر تنقید ہے جنھوں نے تورات و انجیل کی اصل تعلیمات تو فراموش کر دی تھیں اور مشرق و مغرب کے قبلہ ہونے یا اسی طرح کے بعض دوسرے مسائل میں اس طرح لڑ جھگڑ رہے تھے کہ جیسے پورے دین کا انحصار انہیں جزئی مسائل پر ہے اور تنبیہ یہ کی جارہی ہے کہ سچے مومنوں کی یہ روش نہیں ہوتی بلکہ سچا اور پکا مومن بننے کے لیے جو چیزیں ضروری ہیں وہ یہ ہیں :۔

(۱) اللہ، آخرت، ملائکہ، کتاب اور پیغمبروں پر صدق دل سے ایمان

(۲) انفاق مال، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر۔

(۳) اقامت صلوٰۃ (۴) ایتائے زکوٰۃ (۵) ایفائے عہد (۶) صبر، فقر و فاقہ اور جسمانی تکالیف کے موقع پر اور حق و باطل کے درمیان جنگ اور کش مکش کے موقع پر۔

ان صفات مذکورہ سے جو لوگ متصف ہوں، سچے مومن اور حقیقی متقی وہی لوگ ہیں۔ (مزید تفصیل آئندہ شمارے میں)

سلام وجواب سلام

(۲)

سیّد احمد قادری

سلام کی تین قسمیں سلام اجازت[۱]، سلام تحیۃ[۲]، سلام رخصت[۳]

عن انس ان رسول اللہ	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ
صلے اللہ علیہ وسلم اذا سلم	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب سلام
سلم ثلثا (۱)	کرتے تو تین بار سلام کرتے۔

کوئی مسلمان جب کسی دوسرے مسلمان کے گھر اس سے ملاقات کو جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنے کے لیے سلام کرے۔ اگر اجازت مل جائے تو گھر میں داخل ہو اور اگر اجازت نہ ملے تو دو بار اور سلام کرے۔ اگر تیسرے سلام کے بعد بھی اجازت نہ ملے تو واپس ہو جائے۔ یہ تو اجازت نہ ملنے کی صورت میں ہے۔ اگر اجازت مل جائے تو گھر میں داخل ہوتے وقت پھر سلام کرے۔ اس سلام کو سلام دخول یا سلام تحیت کہا جاتا ہے پھر ملاقات کے بعد جب واپس جانے لگے تو سلام کرے۔ اس سلام کو سلام رخصت کہا جا سکتا ہے۔ یہ کسی کے گھر جا کر اس سے ملاقات کرنے کی تعلیم ہے۔

اگر کسی کھلی جگہ پر مسلمانوں کے کسی مجمع سے ملاقات کرے تو پہلے سلام کرے۔ پھر درمیان میں

۱۔ بخاری شریف ج ۲ مطبوعہ ہند باب التسلیم والاستیذان ثلثاً ص ۹۲۳

اٹھ کر واپس جانا ہو تو سلام کرے۔ پہلا سلام تحیت ہے اور دوسرا سلام رخصت۔ گھر والوں سے اجازت طلب کرنے اور اس کے لیے سلام کرنے کی اجمالی تعلیم سورۃ النور کی دو آیتوں میں موجود ہے۔ امام بخاری نے ان دو آیتوں کو اپنے ایک ترجمہ باب میں نقل کیا ہے۔ آیتیں یہ ہیں:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے
تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ	گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل
حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا	نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا
عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ	نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ	یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ
تَجِدُوْا فِیْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا	تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں
حَتّٰى یُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِیْلَ	کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ
لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ	تم کو اجازت نہ دیدی جائے اور اگر تم سے
اَزْكٰى لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا	کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ
تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ۝	یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور
(النور - ۲۷-۲۸)	جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو تشریح فرمائی اس میں یہ بتایا کہ اجازت طلب کرنے کے لیے وقفے وقفے سے تین بار سلام کیا جائے اور اجازت نہ ملے تو اجازت طلب کرنے والا واپس ہو جائے۔ قرآن کریم کی آیت میں یہ تعلیم بھی ہے کہ اگر گھر والا موجود نہ ہو جب بھی اس کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہوا جائے جب تک اجازت حاصل نہ ہو۔

استیذان کی عملی تعلیم

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے ان کے گھر میں تشریف لے گئے اس کی تفصیل ان کے صاحبزادے قیس نے بیان کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر پر ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ آپ نے فرمایا:-

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ" سعدؓ نے آہستہ سے جواب دیا۔ قیس کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت نہ دیں گے؟ انھوں نے کہا رک جاؤ۔ تاکہ ہم پر آپ کے سلام کی اور بارش ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" سعدؓ نے پھر آہستہ جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیسری بار فرمایا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" اس کے بعد آپ واپس چلے۔ پیچھے سے حضرت سعدؓ آئے اور کہا یا رسول! میں آپ کے سلام کو سن رہا تھا اور آہستہ سے جواب بھی دے رہا تھا تاکہ آپ کئی بار ہمیں سلامتی کی دعا دیں۔ قیس نے کہا کہ آپ میرے والد کے ساتھ واپس آئے۔ میرے والد نے آپ کے لیے غسل کا اہتمام کیا۔ پھر آپ کو ایک چادر دی گئی اور آپ نے اپنے جسم کو اس میں لپیٹ لیا۔ پھر آپ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا دی۔ "اللّٰھم اجعل صلوٰتک و رحمتک علیٰ اٰل سعد بن عبادۃ" اے اللہ اپنی برکتیں اور اپنی رحمت سعد بن عبادہ کے اہل وعیال پر نازل فرما۔ قیس نے کہا کہ اس کے بعد آپ نے کچھ کھانا نوش فرمایا۔ جب آپؐ نے واپسی کا ارادہ کیا تو حضرت سعدؓ نے ایک گدھا جس پر حاشیہ دار عمدہ چادر کسی ہوئی تھی۔ آپ کے سامنے سواری کے لئے پیش کیا اور قیس سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جاؤ۔ قیس کہتے ہیں کہ آپؐ نے مجھ سے بھی سوار ہونے کے لیے کہا۔ میں نے ادباً انکار کیا تو آپ نے فرمایا۔ یا تو میرے ساتھ سوار ہو جاؤ یا واپس ہو جاؤ۔ میں واپس ہو گیا۔"

(ابوداؤد: کتاب الادب)

اس حدیث میں طریقۂ استیذان (اجازت طلبی) کی عملی تعلیم بھی ہے۔ صحابۂ کرام رضؓ کے دلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبت تھی اور جو احترام تھا اس کا بھی مظاہرہ ہے اور اس وقت کے اسلامی معاشرے کی ایک جھلک بھی ہے۔ عملی تعلیم کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک دن آپ اپنے عمِّ محترم حضرت عباس بن عبد المطلب کے یہاں تشریف لے گئے جہاں متعدد افراد اور بھی موجود تھے۔ غالباً وہ لوگ کسی مردانہ نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

آپؐ نے فرمایا "السلام علیکم" لوگوں نے جواب دیا "وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ

نے فرمایا:۔

"تم لوگوں کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا ہم سب بخیر ہیں اور اللہ کے شکر گزار ہیں۔ یا رسول اللہ ہمارے باپ ماں آپ پر قربان، حضور کا مزاج گرامی کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ میں بھی بخیر ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔" (۲)

اس حدیث میں سلام، جواب سلام اور مزاج پرسی کی عملی تعلیم ہے۔

اپنے گھر والوں کو سلام

عن انس قال لی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا بنی اذا دخلت علی اھلک فسلم یکن سلامک برکۃ علیک وعلی اھلک (۳)

حضرت انس نے کہا کہ مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بیٹے جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو ان کو سلام کرو۔ تمہارا سلام تمہارے لیے بھی اور ان کے لیے بھی موجب برکت ہوگا۔

ہمارے معاشرے میں اس تعلیم پر عمل بہت کم ہو گیا ہے۔

کسی مجمع میں بیٹھتے وقت سلام اور وہاں سے اٹھتے وقت سلام

حضرت ابوہریرہ رض سے مروی ہے۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم میں کا کوئی شخص کسی مجلس میں پہنچے تو اس کو سلام کرنا چاہیے اور جب وہاں سے اٹھ چلنے کا ارادہ ہو تو پھر سلام کرنا چاہیے اور دوسرا سلام پہلے سے کم اہمیت نہیں رکھتا" (۴)

اس حدیث کی تائید و تشریح ایک دوسری موقوف حدیث سے ہوتی ہے۔

معاویہ بن قرۃ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا اے بیٹے جب تم کسی ایسی مجلس میں شریک ہو جس کی خیر و برکت کی تمہیں امید ہو اور کسی ضرورت سے تمہیں اٹھ جانا پڑے تو کہو السلام علیکم۔ اس طرح تمہارے بعد اس مجلس میں جو کچھ خیر و صلاح کی باتیں ہوں گی تم ان میں شریک رہوگے۔ (۵)

(۲) جمع الفوائد بحوالہ ابن ماجہ　(۳) ترمذی۔ ابواب الاستیذان

(۴) الترغیب بحوالہ ترمذی۔ ابوداؤد، نسائی　(۵) ایضاً بحوالہ طبرانی

سلام میں پہل کرنے والا افضل ہے۔

عن ابی امامۃ قال قیل یا رسول اللہ الرجلان یلتقیان ایہما یبدء بالسلام قال اولاھما باللہ (۶)

ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ پوچھا گیا یا رسول اللہ دو شخص ملتے ہیں۔ ان میں کون سلام میں پہل کرے۔ آپ نے فرمایا ان میں سے جس نے سلام میں پہل کی وہ اللہ کی رحمت سے زیادہ قریب ہے۔

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم والماشیان ایہما بدء فہو افضل (۷)

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دو پیدل چلنے والوں میں جو سلام میں پہل کرے وہ افضل ہے

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دو مسلمان راستہ چلتے ہوئے مل جائیں تو سلام میں پہل کرنے والا افضل ہوگا لیکن سلام میں پہل کرنے کے لیے احادیث میں کچھ قاعدے بھی بتائے گئے ہیں

سلام میں پہل کرنے کا قاعدہ

حضرت ابوہریرہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے گا اور پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے مسلمان کو سلام کرے گا۔

انہیں سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ سوار پیدل چلنے والے کو سلام کرے گا اور کم تعداد لوگ بڑی تعداد والوں کو سلام کریں گے۔ (۸)

یہ حدیث امام مسلم نے بھی روایت کی ہے۔ اس حدیث میں ادب سلام کا ایک قاعدہ بیان کیا گیا ہے۔ بچے کو چاہیے کہ وہ بڑی عمر کے لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرے۔ پیدل چلنے والے کو چاہیے کہ وہ بیٹھے ہوئے مسلمان کو سلام کرنے میں پہل کرے۔ سوار کو چاہیے کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرنے میں پہل کرے اور کم تعداد والی جماعت کو چاہیے کہ زیادہ تعداد والی جماعت کو سلام کرنے میں پہل کرے۔ قاعدے کی رو سے یہی ہونا چاہیے، مفہوم یہ نہیں ہے کہ مثال کے طور پر بڑی عمر کا آدمی بچے کو سلام کرنے میں پہل نہ کرے۔ جو بھی پہل کرے گا فضیلت حاصل کرے گا۔

بچوں کو سلام نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس بچوں کو سلام کرتے تھے۔

---

۶ ترمذی ج ۲، ابواب الاستیذان (۷) الترغیب بحوالہ بزار وابن حبان فی صحیحہ۔ (۸) بخاری۔ کتاب الاستیذان

عن ثابت البنانی عن انس ابن مالک انہ مر علی الصبیان فسلم علیہم قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یفعلہ (۹)

ثابت البنانی سے روایت ہے کہ انس بن مالک بچوں پر گزرے اور انہیں سلام کیا اور فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے۔

یہ حدیث امام مسلم نے بھی روایت کی ہے:۔

عن سیار قال کنت امشی مع ثابت البنانی فمر بصبیان فسلم علیہم وحدث ثابت انہ کان یمشی مع انس فمر بصبیان وحدث انس انہ کان یمشی مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فمر بصبیان فسلم علیہم (۱۰)

سیار نے کہا کہ میں ثابت البنانی کے ساتھ ہوتا اور وہ بچوں کے پاس سے گزرتے تو ان کو سلام کرتے پھر ثابت نے بیان کیا کہ میں انس کے ساتھ کہیں جاتا اور وہ بچوں کے پاس سے گزرتے تو ان کو سلام کرتے اور انس نے بیان کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے اور آپ بچوں کے پاس سے گزرتے تو آپ ان کو سلام کرتے۔

حضرت انس رض نے اپنا یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ میں بچوں میں ایک بچہ تھا اور ان کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ہمیں سلام کیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کسی کو ایک پیغام بھیجا اور خود ایک دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے یہاں تک کہ میں آپ کے واپس آیا (۱۱)

بچے اگر سلام کریں تو ان کے سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے۔

عورتوں کو سلام

عن اسماء بنت یزید مر علینا النبی صلے اللہ علیہ وسلم فی نسوۃ فسلم علینا (۱۲)

اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ میں عورتوں کی ایک جماعت میں تھی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے اور ہمیں سلام کیا

(۹) ایضاً (۱۰) مسلم ج ۲ کتاب السلام (۱۱) ابوداؤد کتاب الادب باب فی السلام علی الصبیان (۱۲) ایضاً

غیر مسلموں کے سلام کا جواب

عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اذا سلم علیکم اھل الکتاب فقولوا وعلیکم (۱۳)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اہل کتاب تم کو سلام کریں تو تم لوگ "وعلیکم" کہو۔

"وعلیکم" کے معنے یہ ہوئے کہ "اور تم پر بھی" یعنی جو کچھ وہ لوگ سلام میں کہیں اسی کو ان پر لوٹا دیا جائے۔ ابوداؤد میں حضرت انس رضؓ کا بیان ہے کہ صحابہ کے سوال کرنے پر آپ نے یہ تعلیم دی تھی۔

ہندوستان میں عام طور پر غیر مسلم آداب عرض کہا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں آداب عرض ہے کہہ دینا چاہیے۔ اگر ابتداءً ان کو سلام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ان دعوتی فرامین سے جو آپ نے بادشاہوں کو بھیجے تھے یہ مسئلہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ آپؐ نے ان کو اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی (سلام اس پر جو ہدایت کا پیرو ہو) لکھا تھا۔ اور یہ دراصل قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ کو فرعون سے جو باتیں کہنے کی تعلیم دی تھی اس میں ایک یہ تھی:-

السلام علی من اتبع الھدیٰ (طٰہٰ ۴۷) اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے۔

قرینہ ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کے پیش نظر اپنے دعوتی فرامین میں غیر مسلم بادشاہوں کو یہی آیت لکھوائی تھی اور اگر کوئی مشترک مجمع ہو جس میں مسلم و غیر مسلم دونوں ہوں تو اس مجمع کو السلام علیکم کہا جا سکتا ہے

تبلیغِ سلام اور اس کا جواب

تبلیغ سلام کے معنے یہ ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کو سلام بھجوائے اس کی بھی حدیثوں میں تعلیم موجود ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص اپنے والد کا سلام لے گئے آپ نے جواب میں فرمایا۔

علیک وعلٰے ابیک السلام (۱۴) تم پر اور تمہارے والد پر سلام

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سلام کا پیغام لے جانے والے مسلمان کو بھی شریک کر لینا چاہیے۔

(۱۳) بخاری۔ کتاب الاستیذان (۱۴) جمع الفوائد بحوالہ ابوداؤد

اس کے علاوہ بخاری شریف میں یہ حدیث ہے :۔

عن عائشۃ رضؓ قالت قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا عائشۃ ھذا جبرئیل یقرء علیک السلام قالت قلت وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (۱۵)	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ یہ جبرئیل ہیں جو تمہیں سلام کر رہے ہیں انھوں نے جواب میں کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس سے معلوم ہوا کہ صرف سلام بھیجنے والے کو جواب دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے حضرت عائشہ کی یہ حدیث امام ترمذی نے بھی "باب تبلیغ السلام" میں روایت کی ہے ۔

سلام کلام سے پہلے ہونا چاہیے

اوپر کی احادیث سے بھی یہ واضح ہے کہ گفتگو سے پہلے سلام و جواب سلام ہو جانا چاہیے ۔ الگ سے اس کی تعلیم بھی حدیث میں موجود ہے ۔

عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم السلام قبل الکلام (۱۶)	حضرت جابر بن عبد اللہ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ سلام، کلام سے پہلے ہے ۔

اگرچہ یہ ضعیف حدیث ہے لیکن اوپر کی صحیح حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے ۔

استنجا کرنے والے کو سلام نہ کرنا چاہیے

عن ابن عمر رضؓ ان رجلا سلم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو یبول فلم یرد علیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم السلام (۱۷)	حضرت ابن عمر رضی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا جبکہ آپ پیشاب کر رہے تھے تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا ۔

فقہائے احناف نے اسی پر قیاس کر کے کہا ہے کہ کوئی شخص کسی کام میں مشغول ہو تو اس کو سلام نہیں کرنا چاہیے ۔ مثلاً نماز پڑھنے والے، قرآن کی تلاوت کرنے والے کسی فقہی بحث و تحقیق میں مشغول اشخاص کو سلام نہیں کرنا چاہیے اور اگر کوئی سلام کرے تو اس کا جواب واجب نہیں ہے ۔ (باقی)

---

(۱۵) بخاری کتاب الاستیذان (۱۶) ترمذی باب السلام قبل الکلام (۱۷) ایضاً باب ماجاء فی کراہیۃ التسلیم علی من یبول ۔

تدبر قرآن پر ایک نظر

(مولانا جمیل احسن ندوی)

مولانا امین احسن اصلاحی نے سورۂ بقرہ آیت ۶۵ و ۶۶ (ولقد علمتم ... للمتقین)
کا ترجمہ کیا ہے :-

اور ان لوگوں کا علم تو تمھیں ہے ہی جنھوں نے سبت کے معاملے میں حدود الٰہی کی بے حرمتی کی تو ہم نے انھیں دھتکارا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ تو ہم نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لیے جو اس کے آگے پیچھے تھے اور اس کو خدا ترسوں کے لیے نصیحت بنایا۔

(تدبر اول صفحہ ۱۹۶)

اور تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یہ اس نقض عہد کی ایک مثال ہے جس کا اجمالی ذکر اوپر والی آیت میں ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت (ہفتہ) کا دن عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، اس دن ان کو کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو شریعت الٰہی کی ان پابندیوں سے آزاد کرنے کے لیے بہت سے شرعی حیلے ایجاد کر لیے یہاں تک کہ یہاں تک کی سیر و شکار کی بھی بہت سی راہیں کھول لیں

(تدبر اول صفحہ ۲۰۰)

اس پر عرض یہ ہے کہ سبت کے معنی "ہفتہ کا دن" نہیں آتے۔ سبت کے معنی اعمال و اشغال سے کٹ کے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی اور عربی میں ہم معنی ہے۔ اس سے ہفتہ کا یا کوئی دوسرا دن مراد نہیں بلکہ وہ اجتماعی عبادت مراد ہے جو توراتیوں پر پورے ہفتہ میں حسب روایت صحیح بخاری جمعہ کے دن فرض کی گئی تھی۔ لیکن یہود نے اسے مادی اغراض کے تحت جمعہ کے اگلے دن سے بدل ڈالا اور نصاریٰ نے اگلے دن یعنی اتوار کو اختیار کیا

کیا۔ اس اجتماعی عبادت کے دن روزہ رکھنے اور تمام دن ہر طرح کی مصروفیات سے کٹ کر ذکر و تسبیح تلاوت تورات اور نوافل میں مشغول رہنے کی

سورۂ نحل میں یہود کے اعتراض کا کہ یہ کیسے نبی اور پیروان نبی ہیں جو سبت نہیں مناتے جب کہ ہمارے سب انبیا سبت مناتے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ انما جعل السبت علی الذین اختلفوا فیہ (آیت ۱۲۴) یعنی سبت کی عبادت اس نبی اور پیروان نبی پر تھوڑا ہی فرض کی گئی ہے۔ یہ اجتماعی ہفتہ وار عبادت تو تم پر فرض کی گئی تھی جس کا حلیہ بگاڑ کر تم نے رکھ دیا ہے اور سورۂ اعراف میں یہی واقعہ آیت ۱۶۳ میں بیان ہوا ہے اس میں یوم سبتھم کے الفاظ آئے ہیں۔ اگر سبت کے معنے، مولانا اصلاحی کی تحقیق کے مطابق ــــ ہفتہ کے دن کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ کرنا ہوگا "ہفتہ کے دن کے دن" اور آگے یوم لا یسبتون آیا ہے اس کا ترجمہ اور دلچسپ ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ سبت کے معنے ہفتہ کے دن یعنی سنیچر اور شنبہ کے نہیں آتے۔ سبت یسبت سبتاً کے معنے ہیں کاٹ لینے یا کاٹ دینے کے یعنی تمام اعمال و اشغال سے اپنے آپ کو کاٹ لینے کے، اور سبت نام ہے ہفتہ وار اجتماعی عبادت کا جس طرح ہمارے یہاں ہفتہ وار اجتماعی عبادت ــــ نماز جمعہ ــــ کے نام سے فرض ہے ہلکی پابندیوں کے ساتھ! اس کے بعد مولانا نے کونوا قردۃ (تم بندر ہو جاؤ) کے ذیل میں حسب ذیل سوال اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس جرم کی پاداش میں لعنت فرمائی...... اہل تاویل کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس لعنت کے نتیجہ میں ان کا ظاہر بھی بندروں کے مشابہ ہو گیا تھا یا یہ مسخ صرف عقلی اور روحانی مسخ تھا۔"

اس سوال کے جواب میں انھوں نے جو تقریر کی ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مسخ عقلی اور روحانی مراد ہے، اس سے ہم کو اختلاف ہے، ہماری رائے یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے بندر بنائے گئے تھے اور یہی رائے جمہور علماء تفسیر کی ہے اور یہ رائے قرآن کے الفاظ سے بہت زیادہ ہم آہنگ ہے یعنی ان کا جسم بندروں جیسا ہو گیا تھا۔ ہر لحاظ سے وہ بندر بنا دیے گئے۔ اور بعض تابعین کی یہ

رائے کہ جسم تو بندروں کا سا بنا دیا گیا مگر عقل و شعور انسانی ہی رکھا گیا۔ یہ تاویل بھی الفاظ قرآنی ہم آہنگ نہیں ہے۔ لگتی ہوئی تاویل وہی ہے جو جمہور علماء امت نے اختیار کی ہے کہ ہر لحاظ سے بندر بنا دیے گئے تاکہ یہ گرد و پیش کی یہودی بستیوں کے لیے نمونہ عبرت اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے داستان عبرت نہیں۔ اگر احساس اور عقل و شعور انسانی باقی رکھا جاتا تو توبہ کرنے کا موقع بھی دینا ضرور تھا دوسری بات یہ کہ ان کی بندر سازی دوسروں کے لیے آس پاس کی یہودی بستیوں کے لیے عبرت انگیز سزا (نکال) بنی، نہ کہ ان کے لیے، قرآن کے الفاظ یہ ہیں۔ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا (ہم نے ان کو گرد و پیش کی یہودی بستیوں کے لیے عبرت انگیز سزا بنا دیا)

بقرہ آیت ۱۲۹ (یَسْئَلُوْنَكَ ـــــ تُفْلِحُوْنَ ٥) کا اصلاحی ترجمہ یہ ہے :۔

وہ تم سے محترم مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو یہ لوگوں کے فوائد اور حج کے اوقات ہیں اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو بلکہ تقویٰ ان کا تقویٰ ہے جو حدود الٰہی کا احترام ملحوظ رکھیں۔ گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔　　(تدبر اول صفحہ ۴۲۴)

مولانا نے آیت کے تیسرے جملہ۔ ولیس البر ـــــ کی تفسیر کرتے ہوئے اصل مفہوم یہ بتایا ہے کہ :

از ان جملہ انھوں نے یہ حج کے سلسلے میں بدعت ایجاد کرلی تھی کہ حج کے لیے احرام باندھ چکنے کے بعد اگر انھیں گھروں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی یا حج کے بعد جب گھروں کو واپس ہوتے تو ان دروازوں سے گھر میں داخل نہ ہوتے جن دروازوں سے نکلتے، بلکہ مکانوں کے پچھواڑوں سے یا کسی دوسرے راستے سے داخل ہوتے۔ اس عجیب و غریب حرکت کا محرک یہ وہم رہا ہوگا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں، پاک ہو جانے کے بعد انہی دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا خلاف تقویٰ ہوگا۔

(تدبر جلد اول صفحہ ۴۲۹)۔

مولانا نے عرب جاہلیت کی جس رسم کا ذکر کیا ہے اس کا ذکر دوسرے لوگ مختلف نوعیت سے کرتے ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ، سچی بات یہ ہے کہ عربوں نے اس طرح کی کوئی رسم ایجاد نہیں کی تھی اور مولانا نے اس بدعت کے جس محرک کا پتہ دیا ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جن گھروں میں وہ گناہوں کا بوجھ لادے رہتے تھے، حج سے پاک ہو کر پھر کبھی اپنے پرانے گھروں میں نہ داخل ہوتے نہ اس میں رہتے بلکہ نئے گھر بناتے اور اس میں رہتے۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ احرام تو اپنے میقات پر باندھتے وہاں سے احرام باندھ کر گھروں میں داخل ہونے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی؟ یہ سب کچھ نہیں۔ یہ جملہ حج سے متعلق آیتوں میں آیا ہے اور معلوم ہے کہ حج کی آیتوں میں بار بار تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے۔ مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب خدا کا گھر تمہاری تولیت میں آئے تو ایسی عظیم عبادت کو میلہ نہ بنانا۔ جیسا کہ موجودہ متولیوں نے اسے میلہ بنا رکھا ہے۔ ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے اسی دروازے سے لوگ گھر میں آتے اور نکلتے ہیں۔ خدا کے گھر کا بھی ایک دروازہ ہے جس کا نام تقویٰ ہے۔ پس جو کوئی حج کے ارادے سے نکلے اسے تقویٰ کا زادِ راہ لیکر نکلنا چاہیے اور حج کے ایام میں بھی یہ زاد اپنے پاس رکھے اور حج سے فارغ ہو کر جب واپس ہو تو یہ زادِ راہ ساتھ رہے۔ اگر کوئی شخص اس زادِ راہ کے بغیر سفرِ حج پر نکلتا ہے تو اس کی مثال اس نادان کی سی ہے جو گھر میں اس کے دروازے سے داخل ہونے کے بجائے چھت پھاڑ کر اندر پھاندے یا پچھواڑے نقب لگا کر اندر آئے۔ عرب جاہلیت نے حج کی عبادت کو بالکل الٹ کر رکھ دیا تھا۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۷۷ (لیس البر ـــــ ھم المتقون) کا پہلے ترجمہ پڑھیے:۔
خدا کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف اپنا رخ کر لو، بلکہ وفاداری ان کی وفاداری جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدق دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال، اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ

ادا کریں۔ جب معاہدہ کر بیٹھیں تو وہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے
راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں۔ (۳۷۷)

یہاں اہم ترین سوال مخاطب کی تعیین کا ہے۔ بہت سے لوگوں نے مسلمانوں کو مخاطب مانا ہے اور تقریر یہ کی ہے کہ مسلمانوں کو مخاطب مانا ہے اور تقریر یہ کی ہے کہ مسلمانوں کو آگاہی دینا ہے کہ تم لوگ یہود و نصاریٰ کی طرح چند رسوم و ظواہر کے غلام بنکر نہ رہ جانا بلکہ دین کی اصل حقیقتوں کو اپناؤ جو یہ ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے مخاطبین کی تعیین صراحت کے ساتھ تو نہیں کی۔ البتہ جس ڈھنگ سے تفسیر آیت سے پہلے تمہیدی تقریر کی ہے (صفحہ ۳۷۶) اور بعد میں جس انداز سے تفسیر کی ہے اس سے بھی مستفاد یہ ہوتا ہے کہ وہ مخاطب مسلمانوں کو مانتے ہیں اور اسی انداز سے ترجمہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے مخاطب یہود ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تم خدا کے ابرار (وفادار) بندوں میں کیسے شامل ہو سکتے ہو۔ تم خدا کے محبوب اور محب ہونے کے حق دار کیونکر ہو سکتے ہو۔ تم وفادار بندوں کے گھر میں کس طرح بسائے جا سکتے ہو۔ تم تو سمتوں اور جہتوں کے غلام بنے ہوئے ہو۔ چند ظاہری رسوم کو اختیار کیے ہوئے اور دعوے تمہارے یہ ہیں، نہ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو، نہ آخرت پر، تم تو تمام فرشتوں سے کٹ گئے۔ تم تو ساری آسمانی کتابوں بشمول تورات کے منکر، اور تم کسی رسول پر ایمان نہیں رکھتے حتیٰ کہ حضرت موسیٰ کو بھی تم نہیں مانتے (یہ سب باتیں اب تک کی آیتوں میں ثابت کی جا چکی ہے) اور تم نے نماز ضائع کر دی، زکوٰۃ کا نظام بالکل معطل کر رکھا ہے، وغیرہ وغیرہ یعنی نہ تمہارے پاس ایمان ہے نہ عمل صالح! پھر تم ابرار بندے کیسے ہو سکتے ہو۔ البتہ ہمارے سچے اور پرہیزگار و وفادار بندے یہ ہیں جو نبی اور قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کے جملہ تقاضے پورے کر رہے ہیں۔ تمام اوامر پر عمل کر رہے اور تمام ممانعتوں سے بچنے والے ہیں۔ ایسے لوگ عہدِ بندگی پر قائم رہنے والے سچے متقی بندے ہیں۔ تم تو ایمان سے بھی محروم تقویٰ سے بھی خالی۔

اس آیت میں صفات کا تقابل صفات سے اور موصوفین سے ہو رہا ہے۔ یہی اسلوب سورۂ توبہ آیت میں بھی ہے۔ اگر پوری طرح تقابلی عبارت لائی جاتی تو بہت لمبی عبارت ہوتی۔ مختصر طور پر عبارت یوں ہوگی۔ ولکن البر الایمان باللّٰہ والیوم الاٰخر ..... وایتاء المال ..... واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والایفاء بالعھد والصابر ..... یہ تو صفات

کا تقابل صفات سے ہوا، اب دوسری عبارت بنا لیجیے تو عبارت یہ بنے گی ولکن البر من آمن باللہ الی آخرہ۔ اب مخاطب کی تعیین کو سامنے رکھتے ہوئے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا۔ خدا کے ساتھ وفاداری یہ ہے ہی نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف کرلو، بلکہ وفادار وہ لوگ ہیں جو اللہ پر، یوم آخرت، فرشتوں پر، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے ہیں۔ اور اپنا مال اس کی محبت کے باوجود ــــ قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، سائلوں اور غلاموں کو آزاد کرنے میں لگاتے ہیں۔ نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جب معاہدہ کر لیتے ہیں تو اسے پوری طرح نباہتے ہیں اور خاص کر وہ لوگ جو فقر و فاقہ اور جسمانی تکالیف اور جنگ کے وقت جمنے والے ہیں۔ ایسے ہی صفات کے لوگ خدا ترس اور متقی ہیں (اور ایسے ہی لوگ کامیاب و کامراں ہوں گے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)

مولانا نے فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ (بقرہ آیت ۱۹۸) کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :-

پس جب عرفات سے چلو تو خدا کو یاد کرو مشعرِ حرام میں ٹھہر کر، اور اس کو اس طرح یاد کرو جس طرح خدا نے تم کو ہدایت کی ہے، اس سے پہلے بلا شبہہ تم گمراہوں میں سے تھے۔"
(تدبر اول صفحہ ۴۴۲)

اور تشریح یہ کی ہے :-

اور وہاں اللہ کو یاد کرنے کا حکم ہے۔ اس یاد کرنے کے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ یہ اس طریقہ پر ہو جو اللہ نے تمہیں بتایا اور سکھایا ہے۔ (تدبر اول ص۴۴۲)

اس تاویل کی رو سے کاف برائے تشبیہ اور ما موصولہ بنتا ہے۔ عربی میں عبارت اس طرح ہوگی واذکروہ کالطریقۃ التی ھدٰکم الیھا۔ اس پر یہ مناقشہ ہم نہیں کرنا چاہتے کہ قرآن میں ذکر کا کیا طریقہ بتایا ہے اور کہاں بتایا ہے، بلکہ ایک دوسری تاویل جو ہمارے نزدیک بہتر ہے پیش کرتے ہیں۔ اس تاویل کی رو سے کاف برائے تعلیل ہے اور ما مصدریہ۔ مطلب یہ کہ اللہ کو یاد کرو۔ اس لیے کہ اس نے تم کو ہدایت سے ــ جو سب سے بڑا احسان ہے ــ نوازا ہے، اور تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے کہ خدا کی راہ کیا ہے۔ اس کی مرضی اور نامرضی کا تمہیں کچھ بھی علم نہ تھا لیکن اس نے تم پر کرم فرمایا، نبی بھیجا، کتاب اتاری اور اس طرح تم خدا آشنا ہوئے تو خدا یاد کرو۔ جذبۂ شکر و امتنان سے سرشار ہو کر! ـــــ

یہ بات کہ کاف علت اور سبب بتانے کے لیے بھی آتا ہے تمام لغت کی کتابوں میں ملے گا۔ بالخصوص ان مصنفین کے یہاں جنہوں نے حروف کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

مولانا نے کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (البقرہ آیت ۲۱۳) کے تحت لکھا ہے کہ کان تامہ ہے اور دوام کے مفہوم میں اور مثال ہے ہے۔ کَانَ اللّٰہُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا کی، حالانکہ دونوں جگہ کان ناقصہ ہے۔ یہاں خبر دونوں جگہ موجود ہے۔ کان تامہ وہاں ہوتا ہے جہاں خبر ہوتی ہی نہیں، کان ناقصہ ہی کبھی دوام کے معنے دیتا ہے کہیں اس کا ترجمہ "تھا" سے کہا جاتا ہے اور کہیں "ہے" سے کرتے ہیں۔ کان تامہ دوام کے معنے نہیں دیتا۔ وہ تو کسی مکمل فعل کے معنے دیتا ہے۔ مثلاً وقع۔ ثبت۔ وجد وغیرہ۔

توجہ دیجئے

(۱) مضامین، رسائل، اخبارات اور کتابیں بھیجنے کا پتہ یہ ہے:۔

سید احمد قادری، مدیر زندگی۔ محلہ گھیر سیف الدین خاں اونچی مسجد کے قریب۔ رامپور ۲۴۴۹۰۱ (یوپی)

---

(۲) روپیہ بھیجنے اور رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع اور حسابات جاننے کے لیے پتہ یہ ہے:۔

منیجر ماہنامہ زندگی۔ ۱۵۲۵ سوئی والان نئی دہلی ۲

درخواست

جو حضرات اپنے سوالات کے جوابات ڈاک سے منگوانا چاہتے ہوں وہ جواب کے لیے ٹکٹ بھیجنا نہ بھولیں

کیا کوئی انسان تاریخ کو دُہرا سکتا ہے

(ڈاکٹر محمد ذکی شعبۂ تاریخ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی)

دنیا کا کوئی بھی انسان بالارادہ کسی تاریخی واقعہ یا شخصیت کے رول کو نہیں دہرا سکتا۔ مثلاً معرکہ بدر اسلامی تاریخ کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ آج اگر کوئی چاہے کہ اسے دُہرا دے، تو ناممکن ہے۔ یعنی بالکل اسی انداز اور انہی حالات میں، کہ ایک طرف ایک عظیم الشان اسلامی رہنما اور فرماں روا ہو۔ اس کے ساتھ بہت قلیل تعداد میں اہل اسلام ہوں۔ دوسری جانب تقریباً تگنی تعداد میں دشمن صف آرا ہوں اور پھر اہل اسلام ایک شاندار فتح حاصل کریں۔ نیز اس معرکے کے وہی نتائج بھی برآمد ہوں جو بدر کی جنگ کے بعد رونما ہوئے تھے اور یہ سب کچھ پہلے سے ایک اعلان کے مطابق ظہور میں آئے۔

یا مثلاً اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں حضرت عمر رضؓ کا رول ادا کر کے دکھا دوں تو بھی ناممکن ہے۔ کیا اس کے لیے جو شرائط درکار ہیں وہ کوئی انسان پوری کر سکتا ہے؟ مثلاً ایک عظیم الشان رہنما کے قتل کے ارادے سے نکلے لیکن اس پر ایمان لے آئے۔ پھر اس کا جانشین ہو اور اتنی ہی بڑی سلطنت قائم کر کے دکھا دے جتنی بڑی حضرت عمر رضؓ نے قائم کی تھی۔

اس کام کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے وہ انسان کی دسترس سے باہر ہیں۔ کسی گذرے ہوئے دور کو زندہ کرنے کے لیے اسی زمانے کے مخصوص حالات کو دوبارہ لے آنا، اسی ماحول کی سی پروردہ شخصیات کو مخصوص سانچوں میں ڈھال دینا اور اپنے پلان اور مرضی کے مطابق پورے ماحول اور حالات کو بدل دینا انسان کی طاقت سے باہر کی چیزیں ہیں۔ یہ قدرت بلا شبہ اللہ رب العالمین ہی کو ہے کہ وہ گردشِ ایام کو جب اور جس طرح چاہے حرکت میں لائے۔ وہ جس طرح کے حالات اور انسان چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ نہ ہی

اگر چاہے تو کسی بھی تاریخی واقعہ کو دہرا دے جس دور کو چاہے پھر سے زندہ کر دے۔

اس مختصر سی تمہید کو ذہن میں رکھتے ہوئے قرآن کے اس اعلان پر غور فرمائیے :۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ (المزمل ۷۳/۱۵)

تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا۔

اس آیت اور اس سے متصل آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے مخاطبین قرآن! حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو تمہاری طرف اسی طرح رسول بنا کر بھیجا گیا ہے جس طرح حضرت موسےؑ کو فرعون مصر کی طرف بھیجا گیا تھا۔ فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہیں مانی۔ بالآخر اللہ نے اس کی گرفت فرمائی۔ یہی صورت حال آج بھی ہے۔ جو حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی بات نہیں مانے گا اس کی گرفت اسی طرح ہوگی جس طرح فرعون کی ہوئی تھی اور جو اس دنیا میں اس انجام سے دوچار نہیں ہوا اس کی آخرت میں یقیناً پکڑ ہوگی۔ یہ ایک نصیحت ہے جو کر دی گئی۔ اب جس کا جی چاہے رسول کی بات مان کر راہ راست اختیار کرے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کی راہ اختیار کر کے اسی انجام سے دوچار ہو جانے کے لئے تیار ہو جائے جس سے فرعون اور اس کے ہم نوا ہوئے تھے۔

قرآن ہی کی دوسری سورتوں میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انکار کرتے ہی فرعون کی پکڑ نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک طویل کش مکش برپا ہوئی۔ افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہا۔ مدتوں تک اچھے اور برے حالات سے گزارا گیا اور مخالفین کو ہر طرح کی دلیلوں اور نشانیوں سے سمجھایا گیا اور جب جام بھر گیا تو چھلک گیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کیا گیا تو مکہ کے ماحول اور اس کے ارد گرد بھی حالات رونما ہونے لگیں گے جو تقریباً دو ہزار سال پہلے ملک مصر میں رونما ہوئے تھے وہی دور پھر زندہ ہو جائے گا۔ اسی نوعیت کی کش مکش برپا ہو جائے گی جس میں حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا کردار وہی ہوگا جو حضرت موسےؑ کا تھا اور مخالفین کا رول وہی ہوگا جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کا تھا

کہاں سرزمین حجاز اور کہاں مصر، دو ہزار سال کا فاصلہ، دونوں معاشروں میں ہر جہت سے واضح فرق۔ حالات میں کوئی مناسبت نہیں، اللہ کے رسول کے ساتھ چند مسلمان، کوئی فوج نہیں کسی جنگ کے آثار نہیں لیکن ان حالات میں دو ہزار سال پہلے کے تاریخی واقعات کو دہرا دینے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اس وقت مخالفین کے نزدیک اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن کیا یہ ناممکن بات ممکن، بلکہ حقیقت میں رونما ہوئی؟ یہی آپ کو دیکھنا ہے۔

(۱) اعلانِ رسالت[۱]

حضرت موسےٰؑ اور ان کے ساتھ حضرت ہارونؑ کو حکم ہوا تھا کہ فرعون کے سامنے جا کر اپنی رسالت کا اعلان کریں۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ۔ (طٰہٰ، ۲۰/۴۷)	تم اس کے پاس (بے دھڑک) جاؤ اور کہو۔ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔

چنانچہ فرعون سے خطاب کرتے ہوئے:۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؀ (الاعراف ۷/۱۰۴)	موسےٰ نے کہا "اے فرعون! میں اس کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

ٹھیک یہی حکم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہوا، اور آپ نے بھی یہی اعلان فرمایا:۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف ۷/۱۵۸)	اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہو "اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اسی

[۱] حضرت موسےٰؑ کن حالات میں اور کس طرح رسول بنائے گئے تھے اور اس معاملہ میں حضرت موسےٰؑ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کس حد تک مشابہت ہے۔ یہ ہم گذشتہ مضمون میں دکھا چکے ہیں اس کے بعد کی چند کڑیاں چھوڑ کر بیان قصہ کی ابتدا حضرت موسےٰ کے اعلان رسالت سے کی جا رہی ہے۔

(۲) بعثت کا مقصد لوگوں کی ہدایت، پاکیزگی اور خشیت الٰہی

حضرت موسیٰ ؑ کی دعوت کی چند اہم خصوصیات کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ارشاد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ فرعون سے کہیں۔

هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى — کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری رہنمائی کروں تو (اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو؟

(النازعات ۷۹ / ۱۸-۱۹)

یہی دعوت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی دے رہے تھے۔ یعنی :۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ — فلاح پا گیا جس نے پاکیزگی اختیار کی

وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ — جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے ۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ (طٰہٰ ۲۰ / ۳) — یہ تو اس لیے نازل ہوا ہے کہ جو دل (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈر رہا ہو اس کے لیے نصیحت ہو۔

اور یہ کہ آپ بھی لوگوں کو صحیح اللہ کی طرف بلا رہے تھے ۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ ۴۲ / ۵۲) یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو۔

(۳) **حق گوئی اور اتباعِ وحی** حضرت موسیٰ ؑ نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کی دعوت کسی ذاتی یا ذہنی مفاد پر مبنی نہیں تھی اور وہ کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے تھے بلکہ انہیں اللہ کا جو حکم مل رہا تھا اسی کو بلا کم و کاست پہنچا رہے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے فرعون سے کہا :۔

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (الاعراف ۷ / ۱۰۵) — میرا فرضِ منصبی ہے کہ خدا کے نام سے کوئی بات نہ کہوں مگر یہ کہ سچ ہو۔

یعنی جو بات بھی میں اللہ کی طرف منسوب کر کے کہوں گا اس میں میری طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی بلکہ وہی بات ہوگی جو اللہ کی طرف سے وحی ہوگی ۔

یہی بات آپ سے بھی کہلائی جا رہی تھی کہ :۔

قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ (الاعراف ۲۰۳)

تم کہہ دو حقیقت حال اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جو کچھ میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی کرتا ہوں

اتنا ہی نہیں بلکہ یہاں تک فرما دیا :۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم ۵۳ : ۳-۴)

وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے

یعنی آپ کی زبان سے (وحی کے علاوہ بھی) کوئی بات غلط نہیں نکلتی جس کی خود آپ ہی سے انہی الفاظ میں وضاحت منقول ہے جو حضرت موسیٰؑ نے کہے تھے کہ " اِنِّیْ لَا اَقُوْلُ اِلَّا حَقًّا (میں کبھی حق کے سوا کوئی بات نہیں کہتا)[1]

[1] مسند احمد، ابو داؤد (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفہیم القرآن متعلقہ تشریحی نوٹ

یہاں ایک اور بات بھی لائق توجہ ہے، بالخصوص اہل کتاب کے لیے۔ وہ یہ کہ موجودہ تورات کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰؑ نے جس نبی کی آمد کی خبر دی تھی اس کی ایک نمایاں صفت یہ بیان کی گئی ہے۔

خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ میں اس نبی کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ (استثنا ۱۸: ۱۸)

مذکورہ بالا آیت میں تورات کے اسی قول کا اعادہ کیا گیا ہے یہ صرف حقیقت کا اعلان ہی نہیں بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بہت بڑا ثبوت بھی ہے۔ اس کسوٹی پر اہل کتاب اس وقت بھی آپ کے دعوے کو پرکھ سکتے تھے اور آج بھی اسی معیار کو سامنے رکھ کر آپ کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں، وہ اس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف منسوب کر کے ہزاروں باتیں بیان فرما رہے تھے۔ ماضی کے بارے میں، اس دور کے بارے میں اور مستقبل کے بارے میں بھی۔ ان میں سے ایک بات بھی غلط ثابت ہونے کا مطلب یہ تھا اور آج بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غلط بات وحی نہیں ہو سکتی اور اس صورت میں رسالت کی تردید ہو جاتی ہے۔ قرآن آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ سخت سے سخت کسوٹی پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اس کی کوئی بات بھی خلاف واقعہ ثابت ہوئی؟ ایسی کسی بات کی آپ نے اللہ کی طرف منسوب کر کے اطلاع دی جو اسی طرح ظاہر نہیں ہوئی؟

یہاں تورات کے "استثناء، باب ۱۸" کا مطالعہ کر لینا چاہیے۔

(۴) دلیل روشن کے ساتھ بعثت

اپنے دعوے کے ثبوت میں حضرت موسےٰؑ نے یہ اعلان بھی کیا تھا:۔

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ	میں تمہارے پروردگار کی طرف سے (سچائی کی) روشن دلیلیں لایا ہوں
(الاعراف ۷/۱۰۵)

اور یہی بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کہلوائی جا رہی تھی ۔

فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ	سو دیکھو تمہارے پاس بھی تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل اور ہدایت اور رحمت آگئی ۔
(الانعام ۶/۱۵۷)

مکہ کے لوگوں نے ــــ جو یہ باتیں سُن رہے تھے ۔ اتنا تو محسوس کرلیا ہی ہوگا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نرالی بات نہیں کہہ رہے تھے، وہی باتیں پیش کر رہے تھے جو موسےٰ علیہ السلام نے دو ہزار سال پہلے پیش کی تھیں ۔ اس معاملہ میں اس دور کے اہل کتاب کو بھی شبہ نہیں ہوگا ، اور نہ اب ہو سکتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور موسےٰ علیہ السلام کی ایک ہی دعوت تھی ۔ یعنی اسلام کی دعوت ــ توحید و رسالت اور آخرت کی دعوت ۔

اب آپ کے مخاطبین کے سامنے دو ہی راستے تھے ۔ یا تو دلائل و براہین کی بنیاد پر آپ کے دعوائے رسالت کو تسلیم کر لیتے ، اسلام قبول کر لیتے ۔ آپ کی تصدیق کر کے آپ کی پیروی اختیار کر لیتے ۔ اس صورت میں نہ اختلافات ہوتے ، نہ جھگڑے اور کشمکش ۔

دوسرا رستہ یہ تھا کہ آپ کی دعوت کو قبول نہ کرتے ہوئے اپنے آبائی دین پر قائم رہتے لیکن اس صورت میں اعلان مشابہت والی آیت کی رو سے انہیں دو چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا ۔ ایک تو یہ کہ انکار کی صورت میں انہیں فرعون کے انجام سے دوچار ہونے کی پیشین گوئی کی جا رہی تھی ۔ اب اگر واقعی ایسا ہوا تو اس صورت میں بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ثابت ہو جائے گی کہ ان کا انجام وہی ہوا جس کی آپ نے خبر دی تھی ۔

دوسرا چیلنج یہ تھا کہ بہ صورت انکار مکے کے ماحول میں دو ہزار سال قبل کی تاریخ دہرا دی جائے گی

یعنی وہی حالات و واقعات رونما ہونے لگیں گے جو دو ہزار سال پہلے ہوئے تھے۔ مخاطبین اللہ پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں تھے، اور آپ کی رسالت کے منکر تھے۔ اب اگر تاریخ دہرائی جانے لگی تو انہیں یہ طے کرنا ہوگا کہ یہ کام کون کر رہا ہے۔ اللہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم؟

ممکن ہے ابتدا میں مسئلہ کے تمام پہلو مخاطبین کے ذہن میں واضح طور پر نہ ابھرے ہوں، یا انھوں نے اس کو اتنی اہمیت نہ دی ہو ۔۔۔ بہرحال انکار کی روش اختیار کرتے ہی تاریخ دہرائے جانے کا عمل شروع ہوگیا۔ یعنی شعوری یا لاشعوری طور پر اُن کے منہ سے وہی الفاظ نکلنے لگے جو فرعون اور اس کے ہم نواؤں نے ادا کیے تھے۔ مثلاً

(۵) فرعون کی طرح رب کے بارے میں سوال

حضرت موسیٰ ؑ کے اعلانِ رسالت کو سنکر لاعلمی کی بنا پر یا یونہی ٹالنے اور الجھانے کی نیت سے فرعون نے یہ سوال کیا تھا:۔

فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ○ قَالَ رَبُّنَا الَّذِىْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَىْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○ (طٰہٰ ۲۰ ۔ ۴۹-۵۰)	اگر ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ! موسیٰ نے کہا، ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس پر (زندگی وعمل کی) راہ کھول دی۔

متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف اہل مکہ بلکہ مختلف لوگوں نے مختلف مواقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی سوال کیا کہ آپ کا رب کون ہے اور کیسا ہے؟ ان کو جہاں یہ جواب دیا گیا۔

کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ (الاخلاص ۔ ۱۱۲)[1]

وہاں ان ہی الفاظ میں تعریف بیان کی گئی ہے جن میں موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ○ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ○ وَالَّذِىْ	(اے نبی!) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو۔ جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر سورۂ الاخلاص ۔ تفہیم القرآن ۔

قَدَّرَ فَهَدٰى (الاعلیٰ ۸۷/۳) جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی

سائلین کو معلوم ہوگیا کہ حضرت موسیٰؑ، حضرت محمد صلے اللہ علیہ السلام اور سب کا رب کون ہے، وہی جو کائنات کا خالق ہے اور جس نے ہر شے ایک اندازہ کے مطابق پیدا کی اور اس کے لیے راہ عمل کھول دی۔

(۶) رب العٰلمین اور رحمٰن کے بارے میں سوال

لیکن اس جواب سے گویا مطمئن نہ ہوتے ہوئے فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا تھا:۔

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ (الشعراء ۲۶/۲۳-۲۴)	اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا "آسمانوں اور زمین کا رب اور ان چیزوں کا رب جو آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے اگر تم یقین لانے والے ہو"

ٹھیک اسی لب ولہجہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی نے کہہ ہی دیا:۔

وَمَا الرَّحْمٰنُ ۝ (الفرقان ۲۵/۶۰) اور یہ رحمٰن کیسا ہوتا ہے؟

یہ بھی اللہ ہی کا نام ہے۔ لہذا اس کی تعریف بھی اسی طرح کی گئی ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی:۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ (الدخان ۴۴/۷)	آسمانوں اور زمین کا رب اور ہر اس چیز کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہے اگر تم لوگ واقعی یقین رکھنے والے ہو۔

شک کی بنا پر یا محض مذاق میں اڑانے کے لیے فرعون نے جو حرکت کی وہ یہ ہے:۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (الشعراء ۲۶/۲۵-۲۶)	فرعون نے اپنے گرد وپیش کے لوگوں سے کہا "سنتے ہو؟" موسیٰ نے کہا "تمہارا رب بھی اور تمہارے ان آباء واجداد کا رب بھی جو گزر چکے ہیں۔

آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی ذہنی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی تھی جس کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے یہی الفاظ دہرائے گئے ہیں:۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ — تمہارا رب اور تمہارے ان اسلاف کا رب جو
الْاَوَّلِيْنَ ○ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ — پہلے گذر چکے ہیں (مگر فی الواقع ان لوگوں کو یقین
يَّلْعَبُوْنَ ○ (الدخان ۴۴) — نہیں ہے) بلکہ یہ اپنے شک میں پڑے کھیل رہے ہیں

توحید کا یہ تصور اتنا فطری اور واضح ہے کہ کوئی شخص بھی اس کی تردید نہیں کر سکتا۔ بھلا کوئی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ میرا کوئی پالنے والا ہے ہی نہیں، انسان قدم قدم پر خود کو پرورش کا محتاج پاتا ہے یہ ساری کائنات اور اس کا حکیمانہ نظام بنی نوع انسان کی ضروریات پوری کرنے میں سرگرم عمل ہے، یہ ہر انسان کا مشاہدہ ہے، اور اس مشاہدہ کا انکار ممکن نہیں۔ یہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نہ تو اللہ کی ربوبیت کا انکار کر سکے نہ تو اس کے سوا کسی دوسری ہستی کی نشان دہی کر سکے جو سارے جہان کی پرورش کر رہی ہو۔ لیکن حقیقت کو حقیقت مان لینے کی بجائے یہ بحث چھیڑ دی کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے آبا و اجداد گمراہ تھے۔ احمق اور بے دین تھے کہ سیکڑوں معبودوں کے قائل تھے[1] ان کا یہ انداز بحث وہی تھا جو فرعون نے اختیار کیا تھا۔

(۷) گزری ہوئی نسلوں کے بارے میں سوال اس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:-

فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ — پھر ان لوگوں کا کیا حال ہوتا ہے جو پچھلے زمانوں
الْاُوْلٰى ○ — میں گزر چکے ہیں؟ (یعنی انہیں تو تمہارے اس
(طٰہٰ ۲۰/۵۱) — پروردگار کی خبر بھی نہ تھی۔

فرعون اپنے سوال کی نوعیت بھی سمجھ رہا تھا اور اس کا جواب بھی جانتا تھا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موسیٰ خود یہ کہدیں کہ وہ سب لوگ اللہ کی الوہیت کے منکر یا مشرک تھے۔ گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ اپنے آبا و اجداد کو گمراہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ بلکہ بھڑک جائیں گے اور اصل موضوع سے ہٹ جائیں گے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے اس طرح جواب دیا کہ وہ اپنے اس

[1] دیکھیے سیرت ابن ہشام (اردو) ۲۸۰، ۲۷۸، ۲۸۲، ۲۸۶

مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ	موسےٰ نے کہا اس کا علم میرے رب کے
لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ○	پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب نہ
(طٰہٰ)	چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

اسی نوعیت کا جواب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے بھی دے دیا گیا:۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ	جو کچھ انھوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں
وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ	میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی
مُّسْتَطَرٌ ○ (القمر ۵۴/۵۲-۵۳)	ہوئی موجود ہے۔
وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ○ (مریم ۱۹/۶۴)	اور تمہارا پروردگار ایسا نہیں جو بھول جانے والا ہو۔

(۸) الزام جنون

اس کا معقول جواب دینے کی بجائے فرعون نے حضرت موسےٰؑ کے بارے میں جو کچھ کہا اسے قرآن نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:۔

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ	تمہارے یہ رسول صاحب جو تمہاری طرف بھیجے
اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (الشعراء ۲۶/۲۷)	گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔

ٹھیک اسی طنزیہ انداز میں منکرین حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہہ رہے تھے:۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ	اور (اے پیغمبر!) ان لوگوں نے تم سے کہا
الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ	اے وہ آدمی کہ تجھ پر نصیحت اتری ہے تو
(الحجر ۱۵/۶)	(ہمارے خیال میں) یقیناً دیوانہ ہے۔

آپ نے دیکھا انکار کی روش اختیار کرتے ہی مخالفین فرعون کا رول ادا کرنے لگے۔ مکہ میں وہی ماحول پیدا ہو گیا جو حضرت موسےٰؑ کے عہد میں مصر کا تھا۔ اللہ کو رب العلمین اور اسی کو معبود ماننے کو پاگل کہا جانے لگا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک سنگین جرم قرار دے دیا گیا۔

(۹) ایمان باللہ کی "سزا" قید

اس "جرم" کی سزا سناتے ہوئے فرعون نے کہا تھا:۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلٰهًا غَيْرِي	بولا اگر تو نے ٹھیرایا کوئی اور حاکم میرے
لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ (الشعراء)	سوائے تو ضرور ڈالوں گا تجھ کو قید میں

جس بات کو فرعون نے جرم قرار دیا تھا اسی کو سردارانِ قریش بھی جرم قرار دے رہے تھے اور ان کے نزدیک بھی وہی سزا تھی جو فرعونی قانون میں تھی۔ یعنی قید ــــ جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا	وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ
لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ	منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے
يُخْرِجُوكَ	تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں یا تجھے
(الانفال ۳۰)	جلا وطن کر دیں۔

اس کو ایک حد تک قریش کے لوگ عملی جامہ بھی پہنا چکے تھے انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ اہل ایمان کو شعب ابو طالب میں محصور کر دیا تھا[1]

(آیات کا مشاہدہ اور تمسخر

مصری تاریخ کا اگلا ورق ــــ اس دھمکی کے جواب میں حضرت موسے نے کہا تھا:۔

أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُبِينٍ قَالَ	اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح
فَأْتِ بِهِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ	چیز بھی۔ فرعون نے کہا اچھا تو لے آ۔ اگر تو
فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ	سچا ہے۔ (اس کی زبان سے یہ بات نکلتے
مُبِينٌ ٥ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا	ہی) موسے نے اپنا عصا پھینکا اور یکایک
هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ٥	وہ ایک صریح اژدہا تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ
	بغل سے کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے
(الشعراء)	سامنے چمک رہا تھا۔
فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ	پھر جب اس نے ہماری نشانیاں ان کے

[1] سیرت ابن ہشام میں اس کا تفصیلی ذکر ہے۔

مِنْهَا يَضْحَكُوْنَ ٥ (الزخرف) سامنے پیش کیں تو وہ ٹھٹھے مارنے لگے۔
اور یہی حرکت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین بھی کر رہے تھے:۔
وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ٥ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اسے ٹھٹھوں میں
(الصّٰفّٰت ۳۷/۱۴) اڑاتے ہیں۔ (الصّٰفّٰت ۳۷/۱۴)

(۱۱) الزامِ سحر

تسخر پر اکتفا نہ کرتے ہوئے جس طرح فرعون اور اس کے ہمنواؤں نے حق کو جادو کہہ دیا تھا۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا پھر جب ہماری جانب سے سچائی ان پر
قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ نمودار ہوگئی تو کہنے لگے "یہ" اس کے سوا
مُّبِيْنٌ ٥ یونس ۱۰/۷۶ کچھ نہیں ہے۔ صریح جادو۔

ٹھیک اسی طرح مشرکین مکہ نے حق کو "سحر مبین" سے تعبیر کر دیا۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا سنائی جاتی ہیں اور حق ان کے سامنے آجاتا
جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ہے تو یہ کافر لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ
(الاحقاف ۴۶/۷) یہ تو کھلا جادو ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا مگر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں
هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ٥ (الصف ۶۱/۶) لیکر آیا تو انھوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے

پھر جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰ کو "ساحر کذاب" (المومن ۴۰/۲۴) کہا تھا اسی طرح اس کی پیروی میں کفار مکہ نے آپ کے بارے میں "ساحر کذاب" (ص ۳۸/۴) کہہ ہی دیا۔ اور ایک ایک کرکے وہ سارے الزامات لگا دیے جو فرعون نے لگائے تھے۔

(۱۲) افترا کا الزام

فرعون نے اگر حضرت موسیٰ کی پیش کردہ آیات کے بارے میں کہا تھا:۔

مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى (القصص ۲۸/۳۶) یہ کچھ نہیں ہے مگر بناوٹی جادو۔

تو منکرین نے آپ کے بارے میں بھی یہی بات کہہ ڈالی۔

مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى (القصص ۳۶/۲۸) یہ محض جھوٹ سے گھڑا ہوا

اس کا حضرت موسےٰ ؑ نے یہ جواب دیا تھا:۔

اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ	تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہو گئی
اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ	ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟
السّٰحِرُوْنَ (یونس ۷۷/۱۰)	حالانکہ جادوگر تو کبھی کامیابی نہیں پا سکتے

اور آپ سے فرمایا:۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَي	کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے
اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝	ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے

یعنی عنقریب یہ حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی کہ یہ جادو اور افترا ہے یا سچائی؟

(۱۳) حصولِ اقتدار کا الزام

حضرت موسےٰ ؑ کے بارے میں فرعون نے اس بدگمانی کا اظہار کیا تھا۔

"اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال باہر کرے؟ (طٰہٰ)

اور قوم کے لوگوں نے کہا:۔

"تم اس لیے آئے ہو کہ ہمیں باپ دادا کی روش سے ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لیے سرداری ہو جائے (یونس ۷۸/۱۰)

فرعون کی یہ بھی عجیب منطق تھی کہ حضرت موسےٰ ؑ تو یہ کہہ رہے تھے کہ تم لوگ اپنے پروردگار اور حاکم کی فرماں برداری کرو اور ہمیں اپنے "ملک سے نکل جانے دو۔ اور فرعون اور اس کے سردار یہ کہہ رہے تھے کہ تم اس ملک کے حاکم بننا چاہتے ہو۔ اسی منطق کی بنا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین بھی کہہ رہے تھے کہ اس دعوت کا مقصد اور ہی کچھ ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۝ (صٓ ۶/۳۸) یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے

چنانچہ قریش کے ایک نامور سردار عتبہ بن ربیعہ نے مخالفین کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ سے کہا تھا کہ اگر آپ کا

مقصد مالدار بننا ہے تو ہم بے شمار دولت پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ سرداری چاہتے ہیں تو سردار اور بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو فرماں روا ماننے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس دعوت کو ترک کر دیجیے[1]

(۱۴) آبائی دین کے مقابلہ میں "نیا دین" قبول کرنے سے انکار

ایمان لانے کی راہ میں ایک رکاوٹ یہ بھی تھی کہ حضرت موسےٰ کے مخالفین کا کہنا تھا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کی روش کو چھوڑ دیں، اور ایک ایسا دین قبول کریں جس کے بارے میں ماضی قریب میں ہم نے سنا تک نہیں۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (یونس)	انہوں نے (جواب میں کہا) کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو؟ (یونس)
وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ (القصص)	اور یہ باتیں تو ہم نے باپ دادا کے زمانے میں کبھی سنی نہیں۔

اب دیکھیے آل فرعون کی پیروی میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کے اقوال:۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (سبا ۔ ۳۴/۴۳)	ان لوگوں کو جب ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم کو ان معبودوں سے برگشتہ کر دے جن کی عبادت تمہارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔
مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (ص ۳۸/۷)	یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی ملت میں کسی سے نہیں سنی۔

(۱۵) تکذیب و انکار کی روش

مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیے جاتے رہے شبہات دور کرنے کی کوشش کی گئیں لیکن فرعون اور آل فرعون نے حضرت موسےٰ کی تکذیب کی اور انکار کیا۔

[1] دیکھیے سیرت ابن ہشام

وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا	اور (دیکھو) یہ واقعہ ہے کہ ہم نے فرعون کو
فَكَذَّبَ وَاَبٰى	اپنی ساری نشانیاں دکھائیں مگر اس پر
(طٰہٰ)	بھی اس نے جھٹلایا اور انکار کیا

یہی "تکذیب" و ابیٰ" کی روش اکثر قریش کے لوگوں نے اختیار کر رکھی تھی :۔

قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ	تم کہو بلاشبہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے
رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ	روشنی اور حجت پر ہوں (یعنی اس نے حقیقت
	ولیقین کی راہ مجھے دکھا دی ہے) اور تم
(الانعام ۶/۵۷)	نے اسے جھٹلایا ہے۔

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار پر ہی جمے رہے (بنی اسرائیل)

(۱۶) ایمان نہ لانے کا فیصلہ

گویا خوب سوچ سمجھ کر مخالفین نے اپنا فیصلہ سنایا کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ سرداران فرعون کا اعلان :۔

وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ (یونس ۱۰/۷۸)	ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں۔

اور بیشتر مخاطبین قرآن کا فیصلہ :۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ	یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم ہرگز اس قرآن کو نہیں
نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ (سبا ۳۴/۳۱)	مانیں گے۔

بلاشبہ کافر لوگ قرآن کو کلام الٰہی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم نہیں کر رہے تھے اور زبان سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ مانیں گے بھی نہیں لیکن اپنے قول اور عمل سے دونوں ہی باتوں کی تصدیق بھی کر رہے ہیں۔ کیونکہ :۔

(۱) اپنے رویے یعنی انکار سے خود ہی وہ حالات پیدا کر رہے تھے جن کی قرآن نے اور بقول منکر بن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے اطلاع دے دی تھی یعنی وہی صورت حال جو حضرت موسےٰ کے زمانے میں فرعون کے انکار سے پیدا ہو گئی تھی۔ جو سوالات اور اعتراضات فرعون اور اس کے ساتھیوں نے کیے تھے۔ ٹھیک وہی سوالات اور اعتراضات مخالفین مکہ بھی کر رہے تھے اور بتدریج اُن کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے درمیان کش مکش میں وہی رنگ پیدا ہوتا جا رہا تھا جو تقریباً دو ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ اور اُن کے مخالفین کے درمیان برپا کش مکش کا تھا۔ اس طرح وہ خود ہی اس مشابہت کی تصدیق کرنے پر خود کو مجبور پا رہے تھے جس کا اعلان خود قرآن نے کیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح رسول بنا کر بھیجا گیا تھا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔

(۲) وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کا انکار کر ہی نہیں سکتے تھے کہ مکہ میں مصر کی تاریخ دُہرائی جا رہی تھی۔ آخر اُن سے کس نے کہا تھا اور کون مجبور کر رہا تھا کہ تم فرعون اور اس کے ہم نواؤں کا کردار ادا کرو لیکن وہ کر رہے تھے۔ کیا وہ کہہ سکتے تھے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے اندر اتنی طاقت تھی کہ وہ مصر کی تاریخ کو دُہرا دیں ؟ پھر کون یہ سب کچھ کر رہا تھا ؟ اسی کا جواب ان سے بن نہیں پڑ رہا تھا۔

(۳) مختصر الفاظ میں یوں کہیے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے دعوئ رسالت کی تردید کرنے کے لیے اُن کے پاس ایک ہی حربہ تھا وہ یہ کہ آپ کی رسالت کا انکار کر کے وہ حالات نہ پیدا ہونے دیں جو فرعون کے انکار سے پیدا ہوئے تھے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور مصر کی تاریخ کا ایک کے بعد دوسرا ورق اُن کے سامنے آتا رہا اور وہ دیکھتے رہے۔

یہ ہے صداقت اور آپ کی سیرت کا اعجاز جس کی گرفت میں مخالفین خود کو مجبور پا رہے تھے کہ فرعون کی مخالفت کرتے تو آپ پر ایمان لانے پر مجبور تھے لیکن وہ اپنے آپ کو آپ کی مخالفت میں فرعون کی پیروی پر مجبور پا رہے تھے اور اس صورت میں انھیں اس بات کے لیے تیار رہنا تھا کہ اسی انجام سے دوچار ہو جائیں جس سے فرعون ہوا تھا۔ راستہ تو انھوں نے دوسرا ہی اختیار کر رکھا تھا لیکن یہ سمجھ کر کہ ان کا وہ انجام نہیں ہوگا جو فرعون کا ہوا تھا۔ اور یہ کہ فرعون کی تاریخ ان پر نہیں دہرائی جا سکے گی۔

لیکن مصر کی تاریخ بتا رہی تھی کہ فیصلہ انکار کے فوراً بعد ہی فرعون مصر ہلاک نہیں ہوا تھا۔ ابھی کش مکش کو چند اور مراحل سے گزرنا تھا، اس کا مخالفین کو انتظار رہے گا۔ آپ بھی دیکھیے کہ بعد کے حالات میں یہ مشابہت کس حد تک نظر آتی ہے اور قریش مکہ سے وہ کون ہے جو ابھر کر فرعون کا کردار پوری طرح نباہتے ہوئے اپنے چیدہ لشکر کے ساتھ موت کے آغوش میں جاتا ہے اور پھر کس طرح اس کا "لہو" اس قصہ کو "رنگین" کر جاتا ہے۔

قرآن اور تفتیش کائنات

سید احمد قادری

علی گڈھ میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار کے لیے یہ مقالہ تیار کیا گیا تھا لیکن مجھے اس میں شرکت کا موقع نہیں ملا۔ یہ مقالہ مسودے کی شکل میں پڑا تھا اب اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

کائنات کی تلاش و تفتیش (اکسپلوریشن) کے بارے میں قرآن کا موقف کیا ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا حد ضروری ہے کہ قرآن کریم کس نوعیت کی کتاب ہے، اس کا موضوع کیا ہے اور اس کو نازل کرنے کا اصل مقصد و مدعا کیا ہے؟ یہ باتیں نہ جاننے کی وجہ سے کچھ لوگ یا تو اسے نعوذ باللہ ایک ناقص کتاب سمجھتے ہیں یا پھر بہت سے لوگ اس سے عجیب عجیب باتیں نکالتے ہیں جن کا نہ صرف یہ کہ اس کتاب کے مقصد نزول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ ان کی تحقیقات اس کے بالکل برعکس ہو جاتی ہیں۔

قرآن کتاب ہدایت ہے

سب سے پہلی بات یہ کہ قرآن انسانوں کے مرتب کردہ علوم و فنون میں سے کسی علم و فن کی کتاب نہیں ہے۔ نہ سائنس کی نہ جغرافیہ کی نہ تاریخ کی، نہ معاشیات کی۔ قرآن اس طرح کی تمام چیزوں سے صرف اتنا ہی تعرض کرتا ہے جتنا اس کے موضوع اور مقصد و مدعا سے اس کا تعلق ہو۔

"وہ زمین و آسمان کی ساخت پر، انسان کی خلقت پر، آثار کائنات کے مشاہدات اور گزری ہوئی قوموں پر گفتگو کرتا ہے۔ مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید

کرتا ہے ۔ مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح کرتا ہے اور بہت سی دوسری چیزوں کا بھی ذکر
کرتا ہے مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبعیات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے بلکہ
اس لیے کہ اسے حقیقت نفس الامری کے متعلق انسان کی غلط فہمیاں دور کرنی ہیں ۔ اصل حقیقت
لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے ۔ خلاف حقیقت رویہ کی غلطی و بدانجامی واضح کرنی ہے اور
اس رویہ کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابق حقیقت اور خوش انجام ہے ۔ یہی وجہ ہے
کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اس حد تک اور اس انداز میں کرتا ہے جو اس مدعا کے لیے ضروری
ہے ۔ (مقدمہ تفہیم القرآن ص۲)

دراصل یہ کتاب تمام انسانوں کی پوری زندگی کے لیے ایک کتاب ہدایت ہے ۔ قرآن تمام انسانوں
کو دعوت دیتا ہے لیکن عملاً اس کی ہدایت سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے
ہوں اور اس کتاب ہدایت پر ایمان لے آئیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو ھدًی للمتقین بھی کہا گیا ہے
اور ھدی للناس بھی ۔ سورۂ فاتحہ کے بعد سب سے پہلی سورہ البقرہ کی پہلی آیت یہ ہے :۔

الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝	یہ الٓمٓ یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے

اور اسی سورہ کی آیت ۱۸۵ میں کہا گیا ہے :۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ (البقرۃ)	رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں

قرآن کا موضوع

قرآن کا موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور

اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔

پورے قرآن کو پڑھ جایئے وہ اپنے موضوع سے کہیں نہیں ہٹتا۔ اس کے تمام مباحث، واقعات اور معلومات اسی موضوع کے محور پر گھومتے ہیں وہ پوری تفصیل سے بتاتا ہے کہ انسان کی فلاح دنیا اور فلاح آخرت کس چیز میں ہے اور اس کا دنیوی و اخروی نقصان و خسران کس چیز میں ہے۔

نزول قرآن کا مقصد و مدعا

اس کا مقصد و مدعا انسان کو اس کائنات میں اس کی حیثیت بتا کر اس صحیح رویہ زندگی کی طرف دعوت دینا ہے جسے بھول کر وہ گمرہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے یا اپنی شرارت سے اسے مسخ کرکے خود بھی تباہ ہوتا اور دوسروں کو بھی تباہ کرتا ہے

سوال کا جواب

محض اشارات میں جو یہ چند باتیں عرض کی گئیں ان کو سامنے رکھا جائے تو اس سوال کا جواب جان لینا . . . . جو اس مقالے کی ابتدا میں قائم کیا گیا ہے، دشوار نہیں ہے۔

سائنس دان تفتیش کائنات کے سلسلے میں اب تک جو کچھ کر چکے ہیں یا آئندہ زمین کا سینہ چیر کر اور ہمارے سروں پر پھیلی ہوئی وسیع کائنات میں گھس کر جو کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں قرآن کریم میں ان کا نہ کوئی حکم موجود ہے اور نہ ممانعت۔

قرآن میں تسخیر کائنات سے متعلق جو آیتیں آئی ہیں ان سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ان آیتوں کا منشا یہ ہے کہ انسان کائنات کو مسخر کرکے اس کو فتح کرے لیکن ان کا یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے نہ عربی لغت کے لحاظ سے نہ سیاق و سباق کے اعتبار سے اور نہ قرآن کے مدعا و مقصد کے لحاظ سے۔ کسی لحاظ سے بھی ان کی یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں اس موضوع سے متعلق جس میں تسخیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ۱۵-۱۶ آیتیں مختلف سورتوں میں آئی ہیں ان میں یا تو "سخرنا" کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "ہم نے مسخر کر دیا ہے" یا مسخر اور مسخرات کے الفاظ آئے ہیں جس کے معنی ہیں وہ چیز جو مسخر کر دی گئی ہو

ان آیتوں میں کسی ایک میں بھی اس کا اشارہ تک موجود نہیں ہے کہ انسان نماؤں کے طور پر سورج، چاند اور ستاروں کو مسخر کرے۔ ان آیتوں کے سیاق و سباق میں بھی کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ نزول قرآن کے مقصد و مدعا سے بھی اس کا تعلق نہیں ہے۔

اگر اس مقالے کے طویل ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ان تمام آیتوں کو نقل کر کے ان کی تشریح کرتا۔ میں یہاں صرف دو آیتوں کے ترجمے پیش کرتا ہوں جن کے تحت دو ماہرین قرآن کی تفسیریں نقل کروں گا۔

تسخیر کا مفہوم

(۱) سورۃ البقرہ آیت ۱۶۴ کا ترجمہ یہ ہے :۔

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لیے سمندر میں نفع بخش سامان لیکر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مامور ہیں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اس آیت میں وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ کا ٹکڑا ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں :۔

تسخیر کا مفہوم

تسخیر کے معنے ہیں کسی کو مطیع و فرماں بردار بنا کر بلا کسی اجرت و معاوضہ کے کسی کی خدمت میں لگا دینا۔ بادلوں کے آسمان و زمین کے درمیان مسخر کرنے کے معنے یہ ہیں کہ خدا کے امر و حکم کے تحت بالکل مقہور و مجبور ہر لحظہ و ہر آن بالکل تیار کھڑے ہیں کہ جب اور جس جگہ کے لیے اور جس شکل میں ان کو حکم ہو وہ اس حکم کی تعمیل کریں۔ یہ مسخر خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی اپنی ربوبیت اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت ان کو رحمت یا عذاب کی جس شکل میں چاہتا ہے۔ استعمال کرتا ہے۔ قرآن میں انسانوں کی نسبت کے ساتھ جب ابر و ہوا کی تسخیر کا ذکر آتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ابر یا ہوا یا سورج یا چاند انسان کے ہاتھ میں مسخر ہیں یا وہ ان کو مسخر کر سکتا ہے

بلکہ اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ پروردگار عالم نے ان چیزوں کو مسخر کر کے ان کو انسان کی نفع رسانی اور اس کی خدمت میں لگا دیا ہے اور یہ رات دن خدمت میں لگے رہنے کے باوجود انسان سے کسی اجرت یا صلہ کے طالب نہیں بنتے۔ اسی وجہ سے جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے وہاں سخر لکم آیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خدا نے ان کو تمہاری نفع رسانی میں لگا دیا ہے۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ تابع فرمان یہ صرف خدا ہی کے ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ خدا نے ان کو جن طبعی قوانین کے ماتحت رکھا ہے ان میں سے بعض کو اپنی سائنس کی زور سے دریافت کر لے اور ان سے فائدہ اٹھا سکے لیکن ان تمام قوانین کا اصل رشتہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان اس رشتہ پر کبھی قابو نہیں پا سکتا

(تدبر قرآن ج ۱)

(۲) سورۂ ابراہیم آیت ۳۲-۳۳ کا ترجمہ یہ ہے

اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندروں میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا جس نے وہ سب کچھ دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

ان دو آیتوں میں چار بار "سَخَّرَ لَکُمْ" کے الفاظ آئے ہیں۔ مولانا مودودی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔

"تمہارے لیے مسخر کر دیا" کو عام طور پر لوگ غلطی سے "تمہارے تابع کر دیا" کے معنے میں لے لیتے ہیں اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے کہ ان آیات کی رو سے تسخیر سماوات و ارض انسان کا منتہائے مقصود ہے حالانکہ انسان کے لیے ان چیزوں کو مسخر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لیے نافع ہو گئی ہیں۔ کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کر سکتا۔ دریا

اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی ان سے نہریں نہ نکالی جا سکتیں۔ سورج اور چاند اور روز و شب اگر ضابطوں میں کسے ہوئے نہ ہوتے تو یہاں زندگی ہی ممکن نہ ہوتی کجا کہ ایک پھلتا پھولتا انسانی تمدن وجود میں آ سکتا۔ (تفہیم القرآن ج ۲)

نظامِ کائنات پر غور و فکر کی دعوت اور اس کا مقصد

قرآن اور تفتیش کائنات کے موضوع کا حق صرف اس جواب سے ادا نہیں ہوگا کہ قرآن نے کائنات کی تفتیش و تسخیر کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ خود قرآن نظامِ کائنات کے بارے میں انسان سے کیا چاہتا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف و متنوع اسالیب میں اپنے بندوں کو آفاق و انفس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے کبھی حکم کے طور پر، کبھی سوال کے انداز میں، کبھی ترغیب کے پیرائے میں اور کبھی خبر کے طور پر، اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ پر اور نظامِ کائنات پر غور و فکر کر کے ان حقائق تک پہنچے جن کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی، بے مقصد اور بد انجام ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ حقائق وہ عقائد ہیں جس کی قرآن تعلیم دیتا ہے یعنی توحید، رسالت اور آخرت —— قرآن نظامِ کائنات سے کبھی توحید پر استدلال کرتا ہے کبھی رسالت پر اور کبھی آخرت پر اور کبھی بیک وقت ان تینوں پر۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اپنے موضوع اور مقصد نزول کے پیش نظر تفتیش کائنات کا نہیں بلکہ مطالعہ کائنات کا حکم دیتا ہے۔

اگر انسان تعصبات اور ذہن و دماغ میں جمے ہوئے غلط نظریات و خیالات سے الگ ہو کر کھلے دل سے ان آیتوں کو پڑھے تو اس کی چشم بصیرت وا ہو جاتی اور اس کے چاروں طرف ہدایت کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے لیے بصائر کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، اس کو نور بھی کہا گیا ہے اور وحی الٰہی کے لیے روح کا لفظ بھی آیا ہے۔

اس مقالے میں اس طرح کی تمام آیتوں کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ میں نمونے کے طور پر چند آیتوں کے ترجمے پیش کروں گا۔

(۱) ان سے کہو زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو اور جو لوگ ایمان لاتا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں۔ (یونس ۱۰۱)

مشرکین مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی ایسی خارق عادت نشانی کا مطالبہ کرتے تھے جو آپ کی نبوت و

رسالت اور آپ کے پیغام کی صداقت کے لیے ناقابل انکار ثبوت بن جائے۔ اس آیت میں ان کے اسی مطالبے کا جواب دیا گیا ہے اور "انظروا" (دیکھو) امر کے صیغے میں انہیں کائنات کے مشاہدے اور اس پر غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ:۔

"اگر تمہارے اندر حق کی طلب اور قبول حق کی آمادگی ہو تو وہ بے حد و حساب نشانیاں جو زمین و آسمان میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں تمہیں پیغام محمدی کی صداقت کا اطمینان دلانے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔ صرف آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے کی ضرورت ہے لیکن اگر یہ طلب اور یہ آمادگی ہی تمہارے اندر موجود نہیں ہے تو پھر کوئی نشانی بھی خواہ وہ کیسی ہی خارق عادت اور عجیب وغریب ہو تم کو نعمت ایمان سے بہرہ ور نہیں کر سکتی ہر معجزے کو دیکھ کر تم فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرح کہوگے کہ یہ تو جادوگری ہے اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان کی آنکھیں صرف اس وقت کھلا کرتی ہیں جب خدا کا قہر وغضب اپنی ہولناک سخت گیری کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑتا ہے جس طرح فرعون کی آنکھیں ڈوبتے وقت کھلی تھیں مگر عین گرفتاری کے موقع پر جو توبہ کی جائے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ (تفہیم القرآن ج ۲)

اس آیت میں نظام کائنات اور اس میں پھیلی ہوئی نشانیوں سے بیک وقت توحید، رسالت اور آخرت تینوں پر استدلال کیا گیا ہے۔ کیونکہ پیغام محمدی میں یہ تینوں عقائد شامل تھے۔

(۲) اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جلا اٹھاتا ہے۔ یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(الروم: ۴۸ تا ۵۰)

آیت ۴۸ میں فتری الودق ہے (تو بارش کے قطروں کو دیکھتا ہے) اور آیت ۵۰ شروع

ہوئی ہے فَانظُرْ اِلٰی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ ہے (دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات) اس آیت میں بارش کس طرح ہوتی ہے اس کا ایک نقشہ کھینچ دیا گیا ہے اور بارش کے اثر سے مردہ زمین کے جی اٹھنے کا منظر پیش کرکے مردوں کی دوبارہ زندگی پر استدلال کیا گیا ہے

یہاں جس انداز سے نبوت اور بارش کا ذکر یکے بعد دیگرے کیا گیا ہے اس میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف بھی ہے کہ نبی کی آمد بھی انسان کی اخلاقی زندگی کے لیے ویسی ہی رحمت ہے جیسی بارش کی آمد اس کی مادی زندگی کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے جس طرح آسمانی بارش کے نزول سے وہ مردہ پڑی ہوئی زمین یکا یک جی اٹھتی ہے اور اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اسی طرح آسمانی وحی کا نزول اخلاق و روحانیت کی ویران پڑی ہوئی دنیا کو جلا اٹھاتا ہے اور اس میں فضائل و محامد کے گلزار لہلہانے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کفار کی اپنی بدقسمتی ہے کہ خدا کی طرف سے یہ نعمت جب ان کے یہاں آتی ہے تو وہ اس کا کفران کرتے ہیں اور اس کو اپنے لیے مژدہ رحمت سمجھنے کے بجائے پیام موت سمجھ لیتے ہیں۔

(تفہیم القرآن ج ۳)

(۳) وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو ایسے سہارے کے بغیر قائم کیا جو تم کو نظر آتے ہوں پھر وہ اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا۔ اس سارے نظام کی ہر چیز ایک وقت مقرر تک کے لیے چل رہی ہے اور اللہ ہی اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے۔ وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو۔ اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے۔ اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیے ہیں۔ اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں (الرعد: ۲-۳)

آیت ۳ کے آخر میں" اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ" ہے۔ (ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں) اس میں بطور خبر یہ بات کہی گئی ہے کہ جو لوگ نظام کائنات میں غور و فکر کرتے ہیں انہیں کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔ یہ ترغیب ہے اس بات کی

کہ عقل والوں کو اس نظام میں غور و فکر کرنا چاہیے۔ ان دونوں آیتوں میں توحید اور آخرت پر دلائل پیش کیے گئے ہیں۔

توحید کا سارا استدلال اس بنیاد پر قائم ہے کہ زمین سے لیکر آسمانوں تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت اور بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار جس طرح اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کے بہت سے فرماں روا نہیں ہیں۔ اس طرح اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کا فرماں روا ہے۔ نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصور ایک حکمراں کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ہٹ دھرم ہو یا پھر وہ جس کی عقل ماری گئی ہو۔ (تفہیم القرآن ج ۲)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ توحید کے دلائل ہی اللہ تعالیٰ کے وجود کے دلائل بھی پوشیدہ ہیں اس لیے اس پر الگ سے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان آیتوں میں جو نشانیاں پیش کی گئی ہیں وہ توحید کے ساتھ آخرت کی دلیل بھی ہیں۔ مذکورہ بالا نشانیوں سے آخرت کا ثبوت دو طرح سے ملتا ہے۔

ایک یہ کہ جب ہم آسمانوں کی ساخت اور شمس و قمر کی تسخیر پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان اجرام فلکی پیدا کیے ہیں اور جس کی قدرت سے یہ بڑے بڑے کرات کو فضا میں گردش دے رہی ہے اس کے لیے نوع انسانی کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اسی نظام فلکی سے ہم کو یہ شہادت ملتی ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا کمال درجہ کا حکیم ہے اور اس کی حکمت سے یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے کہ وہ نوع انسانی کو ایک ذی عقل و شعور اور صاحب اختیار و ارادہ مخلوق بنانے کے بعد اور اپنی زمین کی بے شمار چیزوں پر تصرف کی قدرت عطا کرنے کے بعد، اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب نہ لے، اس کے ظالموں سے باز پرس اور اس کے مظلوموں کی داد رسی نہ کرے، اس کے نیکوکاروں کو جزا اور اس کے بدکاروں کو سزا نہ دے اور اس سے کبھی یہ پوچھے ہی نہیں کہ جو بیش قیمت امانتیں میں نے تیرے سپرد کی تھیں ان کے ساتھ تو نے کیا معاملہ کیا۔ ایک

اندھا راجہ تو بے شک اپنی سلطنت کے معاملات اپنے کارپردازوں کے حوالے کرکے خوابِ غفلت میں سرشار ہو سکتا ہے لیکن ایک حکیم و دانا سے اس غلط بخشی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس طرح آسمانوں کا مشاہدہ ہم کو نہ صرف آخرت کے امکان کو قائل کرتا ہے بلکہ اس کے وقوع کا یقین بھی دلاتا ہے۔ (ایضاح ۲)

آیت ۲ میں اجرامِ فلکی سے استدلال ہے اور آیت ۳ میں عالمِ ارضی سے استدلال ہے۔ اس سے بھی توحید اور آخرت دونوں ثابت ہوتے ہیں

(۱) اجرامِ فلکی کے ساتھ زمین کا تعلق، زمین کے ساتھ سورج اور چاند کا تعلق۔ زمین کی بے شمار مخلوقات کی ضرورتوں سے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق ــــ یہ ساری چیزیں اس بات کی کھلی شہادت دیتی ہیں کہ ان کو نہ تو الگ الگ خداؤں نے بنایا ہے اور نہ مختلف با اختیار خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان سب چیزوں میں باہم اتنی مناسبتیں اور ہم آہنگیاں اور موافقتیں نہ پیدا ہو سکتی تھیں اور نہ مسلسل قائم رہ سکتی تھیں۔ الگ الگ خداؤں کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مل کر پوری کائنات کے لیے تخلیق و تدبیر کا ایسا منصوبہ بنا لیتے جس کی ہر چیز زمین سے لیکر آسمانوں تک ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کھاتی چلی جائے اور کبھی ان کی مصلحتوں کے درمیان تصادم واقع نہ ہونے پائے۔

(۲) زمین کے اس عظیم الشان کرے کا فضائے بسیط میں معلق ہونا اس کی سطح پر اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا ابھرنا، اس کے سینے پر ایسے ایسے زبردست دریاؤں کا جاری ہونا، اس کی گود میں طرح طرح کے بے حساب درختوں کا پھلنا اور پیہم انتہائی باقاعدگی کے ساتھ رات اور دن کے حیرت انگیز آثار کا طاری ہونا یہ سب چیزیں اس خدا کی قدرت پر گواہ ہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ ایسے قادرِ مطلق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا، عقل و دانش کی نہیں حماقت و بلادت کی دلیل ہے (ایضاً)

(باقی آئندہ)

جنوبی افریقہ کے سپریم کورٹ میں

مرزائیوں کے ایک مقدمہ کا فیصلہ

مجلہ صراط مستقیم برمنگھم (لندن) کے نمائندہ جناب مسعود ساحر نے جناب سید ریاض الحسن گیلانی سے ملاقات کرکے اس مقدمہ کی روداد مرتب کی تھی۔ ہم معاصر ترجمان دہلی کے شکریہ کے ساتھ اس کو "زندگی" میں شائع کر رہے ہیں۔ سید ریاض الحسن گیلانی پاکستان کے معروف قانون داں ہیں۔ جواں عمری کے باوجود اسلامی قانون اور فقہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے متعدد مضامین ترجمان القرآن لاہور میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اسلامی قانون اور فقہ پر اردو اور انگریزی زبان میں متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ علماء اور فقہاء کے اس وفد میں شریک تھے جو مرزائیوں کے دائر کردہ مقدمہ کی پیروی کے لیے کیپ ٹاؤن گیا تھا۔ (زندگی)

جنوبی افریقہ کے مرزائیوں نے وہاں کی سپریم کورٹ میں جو مقدمہ دائر کیا تھا احمدیہ انجمن اشاعت اسلام اسی میں مدعی تھی۔ مقدمہ میں تین نکات کو بنیاد بنایا گیا تھا۔

(۱) ہم باقاعدہ مسلمان ہیں۔ لیکن مسلمان ہمیں کافر قرار دیتے ہیں۔ مسلمان ہمیں مرزا غلام احمد کے پیرو کار ہونے کی وجہ سے کافر کہتے ہیں۔ اس سے جذبات مجروح ہوتے اور ہتک عزت ہوتی ہے۔ ہمیں دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنے کے لیے مسلمانوں کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں۔ عام قانون (کامن لا) اور عدالتی نظام

کے تحت کئی دفعہ یہ بات عدالتوں میں گئی ۔ ہمارا اسلام زیر بحث آیا ۔ عدالتوں نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا ۔ ان فیصلوں کو غیر موثر قرار دینے کے لیے پاکستان کی سنی اکثریت نے پارلیمنٹ کے ذریعے ہمیں غیر مسلم قرار دلوایا ۔ یہاں کے سنی مسلمان ہمیں کافر کہہ کر ہماری ہتک کرتے ہیں ۔ ایک تو اس کا ہرجانہ دلوایا جائے ۔ دوسرے انہیں مستقل طور پر منع کیا جائے کہ اپنی تقریر یا تحریر میں ہمیں کافر نہ کہیں ۔

(۲) مسلمان یہاں اپنی مساجد میں ہمیں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں ۔ مسجد مسلمانوں کی عبادت گاہ کا نام ہے ہر مسلمان کا حق ہے کہ مسجد میں نماز پڑھے ۔ کوئی شخص کسی مسلمان کو مسجد میں نماز پڑھنے سے نہیں روک سکتا ۔ ہم بھی مسلمان ہیں ۔ یہاں سنی علماء اور مسلمانوں کو پابند کیا جائے کہ ہمیں مسجد میں نماز پڑھنے سے نہ روکیں ۔

(۳) مسلمانوں کے مخصوص قبرستانوں میں یہ سنی مسلمان ہمیں اپنے مردے دفن کرنے سے روکتے ہیں انھیں مستقل طور پر پابند کیا جائے کہ ہمیں مسلمانوں کے لیے مخصوص قبرستانوں میں مردے دفن کرنے سے نہ روکا جائے ۔ مرزائیوں نے وہاں کی اسلامی تنظیموں کے سربراہ مسلم علماء کی تنظیم جس کا نام جوڈیشل کونسل ہے مختلف مساجد کے امام صاحبان، مسلم قبرستان کے نگران سمیت کل نو افراد کو فریق بنایا ۔

مرزائیوں نے حکم امتناعی عارضی مانگا ۔ عدالت نے درخواست منظور کرتے ہوئے عارضی حکم امتناعی جاری کر دیا ۔

جنوبی افریقہ کی مسلم تنظیموں نے رابطہ عالم اسلامی اور مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان سے رابطہ قائم کیا اور اس دوران مرزائیوں کے دعوے کا جواب داخل کر دیا ۔

رابطہ عالم اسلامی اور مجلس تحفظ نبوت پاکستان نے ایک ہوتے ہوئے مشترکہ وفد تشکیل دیا ۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے تین وکلاء اور تین علماء تھے ۔ وکلاء میں میرے علاوہ سابق اٹارنی جنرل پاکستان حاجی غیاث محمد اور انوار الحق قادری ایڈوکیٹ تھے ۔

علماء میں ملتان کے مولانا عبدالرحیم اشعر، فیصل آباد کے مولانا عبدالرحیم اشرف نہیں ہیں فیصل آباد کے مفتی زین العابدین اور سپریم کورٹ شریعت اپیلٹ بنچ کے جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی تھے ۔ رابطہ عالم اسلامی کی طرف سے مولانا ظفر احمد انصاری اور جسٹس ریٹائرڈ محمد افضل چیمہ تھے ۔ پروفیسر خورشید احمد کو لندن سے جنوبی افریقہ پہنچ کر وفد میں شامل ہونا تھا ۔

۵ ستمبر کو نماز مغرب کے بعد ہم کراچی سے نیروبی کینیا روانہ ہوئے ۔ نیروبی سے ہم نے جنوبی افریقہ کے

مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا بذریعہ فون جسٹس محمد تقی عثمانی اور مفتی زین العابدین تبلیغ کے لیے بھی جنوبی افریقہ جاتے رہے ہیں وہاں کے مسلمانوں سے ان کے ذاتی مراسم ہیں ان سے ہمارا رابطہ ہوا تو ان کو بے حد مسرت ہوئی اور انہی وزارت داخلہ سے دو گھنٹے کے اندر ہمارے لیے اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

نیروبی کے مسلمانوں کو جب معلوم ہوا کہ غلامان محمد کا وفد جنوبی افریقہ میں تحفظ ختم نبوت کے پروانوں کی قانونی امداد کے لیے آیا ہے تو انھوں نے دیدہ و دل فرش راہ کیے اس موضوع پر کھل کر باتیں ہوئیں علاوہ ازیں معلوم ہوا کہ نیروبی میں مسلمانوں کی حالت بڑی مخدوش ہے ہمارے جانے سے ایک ہفتہ پہلے وہاں کی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوشش ہوئی تھی اسی دوران حکومت کی ذرا گرفت ڈھیلی پڑی تھی حبشی النسل لوگوں نے ایشائیوں کو بری طرح لوٹا۔ ان کے کاروباری مراکز پر حملے کیے۔ عورتوں سے غیر انسانی سلوک کیے مسلمان اس پر سہمے ہوئے تھے۔

نیروبی سے ہم جوہنسبرگ پہنچے۔ مسلمانوں نے بڑی گرمجوشی دکھائی اور بڑے خلوص سے ہمارا استقبال کیا وہاں دار العلوم اعلیٰ درجہ کی دینی درس گاہ ہے۔ شاندار لائبریری مفید کتابوں سے بھری ہوئی ہے مسلمان بچوں کو یہاں دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی دار العلوم کے بورڈنگ میں ہمارے قیام کا انتظام ہوا۔ مقامی وکلاء سے ملاقات ہوئی۔ ہمیں مقامی قانونی ضابطے اور مقدمے کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔ مقدمہ سپریم کورٹ کیپ ٹاؤن میں زیر سماعت تھا۔ تاریخ سماعت ۹ ستمبر تھی۔ ہم وہاں ۷ ستمبر کو پہنچ گئے۔ کیپ ٹاؤن کے مسلمانوں نے ایئرپورٹ پر ہمارا شاندار استقبال کیا۔ مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

سب سے پہلے ان وکلاء سے ملاقات ہوئی جو مرزائیوں کے دعوے کا جواب دائر کر چکے تھے۔ یہ وکیل مسلمان تھے۔ وکلاء کی ٹیم مقدمہ کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ ہم نے جن خطوط پر کیس چلانے کی تجویز دیا میں مسلمانوں کے مقامی وکیل جناب محمد اسمٰعیل ایڈوکیٹ نے وہ تجاویز پسند اور منظور کیں طے کیا گیا کہ تحریری بحث تیار کر کے عدالت میں پیش کر دی جائے اس کی روشنی میں وضاحت طلب باتیں عدالت میں کی جائیں۔ یہ طے ہوا کہ تحریری بحث کی روشنی میں بحث مقامی وکیل ہی کریں گے۔ یہ ۸ ستمبر کا دن تھا۔ اسی شام لندن سے پروفیسر خورشید احمد بھی پہنچ گئے۔ اگلی صبح ہم عدالت میں پہنچے تو کمرہ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سامعین کے تعداد کے پیش نظر سماعت بڑے کورٹ روم میں ہو رہی تھی۔ سپریم کورٹ کے سنگل بنچ نے مقدمہ کی سماعت

کی جو تیس ہیفر پر مشتمل تھی۔ جنوبی افریقہ کا عدالتی نظام اور طریقہ ہم سے ملتا جلتا ہے کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔ ہمارے لیے ماحول اجنبی نہیں تھا۔

جنوبی افریقہ میں عدلیہ کی تنظیم اس صورت میں ہے کہ پورے ملک کی اعلیٰ عدالت کا نام سپریم کورٹ ہے۔ یہ ملک چار صوبوں پر مشتمل ہے جن کے نام یہ ہیں :۔

(۱) ٹرانسوال (۲) آرینج فری اسٹیٹ (۳) نیٹال اور کیپ ٹاؤن۔ ہر صوبہ میں سپریم کورٹ کی ایک بنچ ہے ہمارا کیس کیپ ٹاؤن میں تھا۔ پارلیمنٹ کیپ ٹاؤن میں ہے انتظامیہ کے سربراہ پری ٹوریا میں بیٹھتے ہیں جو صوبہ ٹرانسوال کا ایک شہر ہے۔ سپریم کورٹ کی اپیل بنچ آرینج فری اسٹیٹ میں واقع ہے :۔

قادیانیوں کی طرف سے مشہور اور ممتاز بیلیر وکلا کی ایک ٹیم تھی۔ یہ تمام وکلا یہودی تھے ان کی معاونت قادیانی کر رہے تھے ان کی معاونت قادیانی کر رہے تھے یہودی وکلا کی ٹیم کے قائد سپریم کورٹ کے ایک سابق جج مسٹر بینگ تھے۔ ہم دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہودی اس مقصد میں مرزائیوں سے بھی زیادہ سرگرم تھے وہ اپنی سرگرمی اور تائید و معاونت کے حوالے سے اسے اپنا مقدمہ سمجھے ہوئے تھے۔

جنوبی افریقہ بڑا امیر ملک ہے سونے ہیرے جواہرات، لوہے اور کوئلے کی کانیں نجی ملکیت ہیں اور تمام مالکان یہودی ہیں۔ وہاں کا پریس بھی یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔ یہودی اثر و رسوخ کی وجہ سے اخبارات میں مقدمہ کی رپورٹنگ کا جھکاؤ قادیانیوں کے حق میں تھا اور اخبارات مقدمہ کے حقائق کو مسخ کر رہے تھے کورٹ روم میں باقاعدہ پریس گیلری تھی وہاں بڑی دلچسپ صورت حال دیکھنے میں آئی۔ اخبار نویسوں کے ساتھ الشیشن نژاد جوان قادیانی لڑکیاں میک اپ سے لدی بھی اور خوشبو سے مہکی ملکی بیٹھی تھیں۔

مسٹر بینگ نے بحث کا آغاز کیا۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں نصف گھنٹہ باقی تھا کہ اس کی بحث ختم ہوئی۔

مسلمانوں کے وکیل جناب اسمٰعیل محمد نے اپنی تحریری بحث دائر کر کے جوابی بحث کا آغاز کیا۔ تحریری بحث کا خاکہ بتایا ساتھ ہی ہمارا تعارف کرایا کہ پاکستان کے ماہر وکلا اور جید علماء کی ٹیم پیروی کے لیے آئی ہوئی ہے

(۱) کسی نبی کی امت میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا بنیادی معیار اس نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ان کو آخری نبی بھی ماننا ہے اور آخری نبی ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے جس طرح کہ عیسائی حضرت

عیسےٰ کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ان کو آخری نبی بھی مانتے ہیں اور جو عیسائی نبی اکرم حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو وہ عیسائیت سے خارج ہو کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہو جاتا ہے ۔ جو عیسائی حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو آخری نبی مانتا ہے عیسائی رہتا ہے ۔

اسی طرح حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی امت میں شامل ہونے کے لیے بھی دو ہی امور لازم ہیں ۔

(الف) آپ کی نبوت پر ایمان لانا ۔

(ب) آپ کو آخری نبی تسلیم کرنا ۔

جو شخص آپ کی نبوت کے بعد کسی اور پر ایمان لاتا ہے تو وہ امت مسلمہ سے خارج ہو جائے گا۔ یہ وہ اصول ہے جس کو کسی صورت میں بھی کوئی معقول آدمی جھٹلا نہیں سکتا ۔

(۲) مرزا غلام احمد کی اپنی شائع شدہ کتابیں موجود ہیں جن میں واضح اور غیر مبہم وصاف سیدھے الفاظ میں اس نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے ۔ اس پر وحی کی بارش ہوتی ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے جو شخص اس پر ایمان نہیں لاتا کافر ہے ۔ اس کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھنا چاہیے ۔ لہٰذا مرزا غلام احمد کے اپنے موقف کے مطابق مرزائی مسلمانوں سے بالکل الگ اور مختلف لوگ اور ان کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں وہ خود مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں ۔ اسلام کا مسلمہ حکم، اصول اور فرمان ہے کہ جو کوئی کسی مسلمان کو کافر قرار دے وہ مسلمان نہیں رہ سکتا ۔

(۳) مرزائیوں کے دونوں گروپ میں اس بات پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کو کافر قرار دینے والے والے کافر ہیں ۔ دونوں گروپوں کے سربراہ خصوصاً لاہوری گروپ کے سربراہ مولوی محمد علی کی کتاب "ردّ تکفیر اہل قبلہ" میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ غلام احمد کو کافر قرار دینے والے یقیناً کافر ہیں ۔ مسلمان مرزا غلام احمد کو مدعی نبوت اور کافر قرار دینے میں متفق ہیں ۔ اس لیے مرزائیوں کے دونوں نقطہ نظر سے مسلمان کافر ہیں ۔ اس طرح بھی مرزائیوں کے اپنے موقف کے مطابق وہ مسلمانوں سے الگ گروہ ہیں ۔

(۴) حکم امتناعی کا مطلب صورت حال کو جوں کا توں رکھنا ہوتا ہے ۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ صورت حالات کو بدل دیا جائے ۔ اس عدالت سے جو انھوں نے حکم امتناعی حاصل کیا اس سے صورت حال جوں کی توں رہنے کی بجائے بالکل تبدیل ہو جاتی ہے ۔ مسلمان ایک صدی سے مرزائیوں کو کافر قرار دیتے آئے ہیں مسلمانوں نے انھیں کبھی بھی مسجدوں میں داخل ہونے نہیں دیا ۔ اپنے قبرستانوں میں مرزائیوں کے مردے

دفن کرنے کی اجازت نہیں دی لہذا اس مقدمہ میں حکم امتناعی حاصل کرتے وقت انھوں نے عدالت کے سامنے صحیح صورت حال پیش نہیں کی ورنہ فاضل عدالت سے حکم امتناعی حاصل نہ کر سکتے ۔

(۵) حکم امتناعی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ اگر حکم امتناعی نہ جاری کیا گیا تو درخواست گذار کو ناقابل تلافی نقصان ہوگا جیسے جلنے اور مر جانے کی صورت میں اس کی تلافی نہیں کی جاسکے گی ۔ یہاں مرزائیوں کو مسجد میں اگر نماز نہ پڑھنے دی جائے تو یہ مسجد سے باہر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں ۔ اگر مسلمانوں کے قبرستان میں مخصوص مردے دفن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے تو یہ کہیں اور دفن ہو سکتے ہیں ۔ ان کے خرچ میں تھوڑا سا فرق پڑے گا ۔ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی صورت میں سا ٹھ رینڈ (ایک رینڈ مساوی ایک ڈالر) اور حکومت کی اجازت سے کسی اور جگہ دفن کرنے کی صورت میں ۴۲ رینڈ خرچ کرنا پڑیں گے ۔ ظاہر ہے ناقابل تلافی نقصان نہیں ہے ۔

مرزائیوں کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ مرزا نے انبیائے کرام بالخصوص حضرت عیسیٰؑ کی شان میں بڑی بیہودہ دہری سے گستاخیاں کی ہیں جو شخص جناب رسول مقبول یا کسی اور نبی کی توہین کا مرتکب ہو وہ ہرگز مسلمان نہیں ہے ۔

ابتدائی عذر کے طور پر سابق اٹارنی جنرل حاجی شیخ غیاث محمد نے یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ یہ مقدمہ ایک انجمن کی طرف سے دائر کیا گیا ہے جب کہ مقدمہ کی نوعیت صرف ایسی صورت میں از روئے قانون چلنے کے قابل ہو سکتی ہے کہ مخصوص افراد کی جانب سے دائر کیا جاتا ۔ چونکہ یہ ایک انجمن کی طرف سے دائر کیا گیا ہے لہذا اسی بنیاد پر ہی خارج کر دینے کے قابل ہے [illegible] عدالت میں پہنچے تو یہ بات ہمارے علم میں آئی کہ مرزائیوں کے یہودی وکیل اپنے دعوے میں اسی نوعیت کی ترمیم پیش کر چکے ہیں ۔

بحث کے دوران جب مرزائیوں کے جواب کی باری آئی تو انھوں نے اپنا وکیل تبدیل کر لیا تاہم نیا وکیل بھی یہودی تھا اس نے ہماری تحریری بحث کی روشنی میں فاضل عدالت کی جانب سے اٹھائے گئے نکات کا جواب دینے کی بے حد کوشش کی مگر ایک بھی تسلی بخش جواب سامنے نہ آسکا ۔ اس نے جب یہ کہا کہ میرے موکل مرزائیوں کے لاہوری گروپ سے تعلق رکھتے ہیں جو مرزا کو نبی نہیں مصلح سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں اور یوں ختم نبوت کے منکر نہیں تو فاضل جج نے کہا کہ مرزا غلام احمد موجودہ دور کا آدمی ہے اس کی اپنی کتابیں موجود ہیں جن میں [illegible] کچھ لکھا ہے تو اگر [illegible] مرزا کے دعویٰ نبوت

کو نہیں مانتے تو اس کے پیروکار نہیں ہو سکتے۔

وکلاء کی بحث ختم ہوتے ہی فاضل عدالت نے قرار دیا کہ تفصیلات بعد میں لکھی جائیں گی فیصلہ ابھی سنایا جاتا ہے کہ یہ عدالت قادیانیوں کا مقدمہ بمع خرچہ خارج کرتی ہے۔ قادیانیوں نے سپریم کورٹ کے لارجر بنچ کے سامنے اپیل کی اجازت مانگی۔ ساتھ ہی مزید حکم امتناعی مانگا۔ عدالت نے حکم امتناعی کی درخواست مسترد کر دی۔ کمرۂ عدالت نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کے کفر شکن نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمان ہمارے سامنے آئے اور اجتماعی دعا کی گئی۔

اسی دوران کچھ غیر ملکی باتیں سننے اور دیکھنے میں آئیں مثلاً یہ کہ عدالت کا آغاز ہوا تو ہمیں کمرۂ عدالت میں دیکھ کر مرزائی غصے سے بپھر گئے۔ اس سے پہلی شام کو ہمارے میزبانوں کو باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ ہم علماء اور وکلاء کے وفد پر قاتلانہ حملے کا منصوبہ بن چکا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے بحث کے آغاز سے پیشتر ہی اس منصوبے پر عمل درآمد کا امکان ہے۔ ہم نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ ہمیں یہ خوف زدہ کرنے کی ایک چال ہے تاکہ مسلمان مقدمے کی مناسب اور موثر پیروی سے باز آجائیں۔ مسلمانوں نے ہماری رہائش گاہ کمرۂ عدالت اور اس کے باہر ہمارے لیے انتہائی منظم حفاظتی انتظامات کیے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مرزائی لیڈر چودھری ظفر اللہ خاں مسلمانوں کے خلاف مقدمہ میں وکلاء کو قانونی مشورے اور ہدایات دینے کے لیے کیپ ٹاؤن پہنچ گئے ہیں۔ مرزائیوں کے یہودی وکلاء جس مقام پر اپنے مقدمہ کی تیاری کرتے رہے ظفر اللہ خاں نے وہیں قیام کیا۔ وہ کمرۂ عدالت میں نظر نہیں آئے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ قادیانیوں نے جنوبی افریقہ ہی کی عدالت میں اس ڈرامے کا اسٹیج کیوں سجایا تو عرض یہ ہے کہ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ قادیانیوں اور یہودیوں کا گٹھ جوڑ اور مفاہمت جنوبی افریقہ میں نقطۂ عروج پر ہے۔ ایک جان و قالب کی سی صورت ہے۔ ملک کے تمام وسائل یہودیوں کے جیب کی گھڑی اور ہاتھ کی چھڑی بنے ہوئے ہیں۔ اور حکومت کی نسل پرستانہ پالیسی کی وجہ سے مہذب دنیا کے بڑے حصے نے جنوبی افریقہ سے تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔ خاص طور پر مسلم دنیا کی پہنچ سے یہ ملک باہر ہے۔ مرزائیوں کا گمان تھا کہ کیپ ٹاؤن کے مسلمان ملائیشیائی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مرزائیت کے پس منظر اور کافرانہ اصلیت سے کما حقہ واقف نہیں ہیں۔ اس لیے وہ مقدمہ میں نہ تو دلچسپی کا زیادہ مظاہرہ کریں گے اور نہ ہی موثر پیروی کر سکیں گے۔ ٹرانسوال اور نیٹال میں کہیں کہیں پاک و ہند سے تعلق رکھنے والے مسلمان مل جاتے

مل جاتے ہیں اس لیے یہاں مقدمہ دائر نہ کیا گیا۔ کیپ ٹاؤن جوہانسبرگ سے ایک ہزار میل دور ہے مرزائیوں
کے خیال میں باہر سے اور خصوصاً پاکستان سے یہاں کوئی مدد قانونی یا نظریاتی کمک نہیں پہنچ سکتی تھی اور یہاں
یہودی اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاکر یہ مقدمہ جیت لیا جائے گا۔ اس طرح پاکستان میں غیر مسلم قرار دیے جانے
کے عدیم المثال فیصلے کے مقابلے میں جنوبی افریقہ کی عالی عدالت سے اپنے حق میں فیصلے لیں گے اور اسے دنیا
بھر میں پبلسٹی کے لیے استعمال کریں گے۔

وہاں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ مسلمانوں کا مذہبی اور نظریاتی جذبہ اور ولولہ پورے شباب پر ہے ایسا
دیکھ کر ہم گناہ گاروں کو جینے کا حوصلہ ملتا ہے اور طبیعت خوش ہوجاتی ہے۔ اہل ثروت مسلمان خدا اور اس کے رسول
کے راستے میں روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی سچی تصویر ہیں بڑی بڑی اسلامی درسگاہیں
چلاتے دار العلوم قائم کرنے مساجد تعمیر کرانے اور انہیں آباد رکھنے میں بے حد فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پکے نمازی
اسلامی معلومات اور ضروری دینی تعلیم و شعور سے بہرہ ور ہیں۔ گھروں کا ماحول اسلامی ہے۔ اس دور میں ان
روایات اور جذبات پر ہم نے خوش گوار حیرت و مسرت کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا کہ ہمارے آباء و اجداد کی
قربانیاں ہر وقت ہمارے سامنے رہتی ہیں۔ قربانیاں جو انھوں نے یہاں اسلام کو زندہ رکھنے کے لیے دی ہیں۔

ابتدا میں اس علاقہ میں ولندیزیوں کی حکومت تھی وہ ملائشیا میں برسر اقتدار تھے جو مسلمان ملائشیا میں اعلان
جنگ کر کے کفر کا تسلط ختم کرنا چاہتے تھے ولندیزی انہیں گرفتار کر کے کیپ ٹاؤن لے آتے اور انہیں غلام بنا لیا جاتا
انھیں نہ مسجد بنانے کی اجازت تھی اور نہ نماز پڑھنے کی۔ مگر اسلام کے ساتھ ان کا رشتہ اسی قدر مضبوط تھا کہ وہ
چوری چھپے تہہ خانوں میں جاکر نماز پڑھتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ انگریزوں اور ولندیزیوں میں جنگ چھڑ گئی
انگریزوں نے مسلمانوں سے تعاون چاہا۔ مسلمانوں نے اس شرط پر انگریزوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا
کہ انگریزوں کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کو کیپ ٹاؤن میں ایک مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ہوگی۔
علی الاعلان نماز پڑھنے اور کلمہ طیبہ کی آزادی حاصل ہوگی۔ انگریز اس شرط پر رضامند ہوگئے۔ اس جنگ میں
انگریز کامیاب ہوگئے تو مسلمانوں نے کیپ ٹاؤن میں مسجد تعمیر کی وہ مسجد تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اسی صورت
میں موجود ہے جس میں مولانا تقی عثمانی اور میں نے اس میں عشاء کی نماز ادا کی۔

نشانِ عبرت

مولانا عبدالحفیظ مکہ معظمہ نے "حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کی جامعیت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ خدام الدین لاہور میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا وہ حصہ جس میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور تحریک اسلامی کے بارے میں شیخ الحدیث مرحوم و مغفور کے کارنامے کا ذکر ہے۔ معاصر ایشیا لاہور نے "بلاتبصرہ" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ ہم معاصر کے شکریہ کے ساتھ اس کو "نشانِ عبرت" کے عنوان سے شائع کر رہے ہیں۔

(زندگی)

"اسی طرح فتنۂ مودودیت کی سرکوبی میں حضرت کا بہت وافر حصہ ہے۔ حضرت کی معرکۃ الآراء تصنیف "فتنۂ مودودیت" سے علماء حق و محققین راسخین کے سینے اس فتنۂ عظیمہ کے بطلان کے بارے میں منشرح ہوگئے۔ اور پھر ہر ایک نے اپنے حسب مذاق اس فتنہ کی بیخ کنی میں حصہ لیا۔ اس کی اشاعت سے قبل یہ فتنہ خوب سر اٹھا رہا تھا۔ مودودی صاحب خود تو زندہ تھے اور بیعت زور دار پر تھے۔ ہر طرف سے ان کی آؤ بھگت تھی اور ان کی "جماعت اسلامی" رائی کا پہاڑ بنا کر ان کی پیش کر رہی تھی اور پاکستانی علماء حق میں سے ایک کثیر تعداد مختلف وجوہ دینیہ و سیاسیہ کی بنا پر ان کے بارے میں بعض بصر یا نرم رویہ کی قائل تھی جس کی وجہ سے عوام کے سامنے اس فتنہ کی صحیح حقیقت نہیں آ رہی تھی۔ اسی بنا پر عوام تو عوام بہت سے نئے فارغ التحصیل علماء اور اکثر صحیح العقیدہ کالجوں کے تعلیم یافتہ ان کی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہے تھے۔ حضرت کے رسالہ "فتنۂ مودودیت" نے مطلع کو بالکل صاف کر دیا اور خاص و عام کے دل میں یہ بات اتر گئی کہ مودودیت ایک خطرناک قسم کا عقائدی فتنہ ہے۔ ان میں اگر کچھ منافع نظر آتے ہیں یا وہ بتائے جاتے ہیں اور بعض واقعۃً ہیں بھی۔ مگر یہ ان کے خطرناک بدعقیدگیوں اور تحریفات دینیہ و نظریات باطلہ کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس رسالہ کے چھپنے کے بعد ایک فاضل و

محترم بزرگ کا خط حضرت قدس سرہٗ کے نام موصول ہوا کہ رسالہ تو بہت اچھا ہے۔ جیسا چاہیے ہے۔ مگر اس کا نام سخت ہے جس سے لوگوں کو وحشت ہوتی ہے۔ لہٰذا حضرت نے مولانا محمد شاہد صاحب سہارنپوری کو لکھ دیا کہ آئندہ ان بزرگ کے تجویز کردہ نام "جماعت اسلامی — ایک لمحہ فکریہ" سے ایک دوسرا اڈیشن چھپنا چاہیے۔ اور ہندوستان میں ایسا ہی ہوا مگر پاکستان میں کئی اڈیشن اسی نام سے چھپے۔ اسی اثنا میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نور اللہ مرقدہٗ جب تشریف لائے اور یہ سیاہ کار اُن سے ملنے گیا تو "فتنہ مودودیت" کا تذکرہ آیا تو اس سیاہ کار نے ان بزرگ کی رائے مذکورہ بالا کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کی تو حضرت مولانا نے بہت جوش میں فرمایا ہے "نہیں نام نہیں بدلنا چاہیے" پھر سنایا کہ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری نے جب "اکفار الملحدین" تحریر فرمائی تو کسی نے یہی کہا کہ حضرت نام سخت ہے، تو حضرت شاہ صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں! ایسا ہی ہونا چاہیے۔ چونکہ یہ کتاب کتنے لوگ پڑھیں گے اور جو لوگ پڑھیں گے اور ان میں سے کتنے سمجھیں گے۔ مگر نام ہر شخص دیکھے گا۔ اور ہم لوگوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں ان قادیانیوں کے لیے کتنا بغض ہے" پھر حضرت بنوری نے فرمایا: اس کا بھی یہی حال لوگوں کو اس نام سے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ والوں کے دلوں میں اس مودودیت کے بارے میں کتنا بغض ہے۔ پھر فرمایا — اس نام میں سختی ہی کیا ہے۔ اس میں صرف اتنا ہی تو لکھا ہے کہ یہ فتنہ ہے اور فتنہ اسے کہتے ہیں کہ اس میں حق اور باطل خلط ملط ہو جائے۔ پتہ نہ چلے کہ حق کہاں ہے اور باطل کہاں ہے اور اس کا بھی یہی حال ہے کہ حق بات کرتے کرتے باطل لے آتا ہے "الخ اور پھر یہ سب باتیں میں نے جا کر حضرت شیخ قدس سرہٗ کو من و عن سنا دیں۔ حضرت قدس سرہٗ یہ سب سنکر بہت خوش ہوئے اور تائید فرمائی۔ پھر جب شریعت و طریقت کا وقت آیا تو اس کے بعض مواد کو تلاش کرتے ہوئے "مشاجرات صحابہ" کے عنوان کے ذیل میں ایک حدیث آئی جس کا مضمون یہ تھا کہ صحابہ کو گالی دینے والے پر اللہ اور اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو" تو حضرت نے یہ حدیث سنکر غصہ میں فرمایا۔ ہاں ہاں ضرور ایسی حدیثیں لاؤ تاکہ مودودی صاحب پر لعنت پڑے۔ جو صحابہ کی تنقیص کرے، توہین کرے اور ان کو گالیاں دے اس پر جتنی بھی گالیاں پڑیں کم ہیں — نیز اس کے بعد حضرت نے نجی خطوط میں جن حضرات سے بھی خط و کتابت کی اور اس مسئلہ سے ان کا ذرا بھی واسطہ ہوتا تو ان کو ضرور اس فتنہ کے رد اور سدباب کے لیے تحریر فرماتے حتیٰ کہ حضرت نے بیعت مولانا محمد عابد صاحب جو الجامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ میں پڑھ رہے تھے انھوں نے ایک مضمون بی بی سی کا مودودی صاحب کی تفسیر کے رد میں لکھا تو حضرت نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا۔ ان کے لیے ہمیشہ بہت

دعائیں فرماتے اور جب مضمون پاس ہوگیا تو ان کو مبارک باد دی اور بہت دعاؤں اور توجہات سے نوازا اور خوش ہوکر کچھ کتابیں بھی ہدیۃً مرحمت فرمائیں۔

حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی مدظلہ کے خلیفہ مولانا حکیم محمد اختر صاحب نے ایک رسالہ "مودودی صاحب اکابر کی نظر میں" تحریر فرمایا تو حضرت نے سیکڑوں کی تعداد میں خرید فرماکر مفت تقسیم کروایا اور سہارنپور سے کئی ہزار کا مستقل ایڈیشن شائع کروایا۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا کی جامعیت از مولانا عبدالحفیظ مکہ معظمہ، خدام الدین لاہور

(بقیہ صفحہ ۵۶)

ماہنامہ "زندگی" میں بھی ان کے متعدد مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم دین سے بھی نوازا ہے اور ادب وشعر کا ذوق بھی دیا ہے اور یہ جسمانی امراض کا بھی علاج کرتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ ماہنامہ "الصدیق" پبلی کیشنز کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اس ماہنامہ کے اجرا کے مقاصد حسب ذیل ہیں:-

- نئی نسلوں کو صحیح اور تعمیری رخ پر ڈالنا۔
- ان کے اندر دینی جذبہ پیدا کرنا۔
- عصر حاضر کے تقاضوں کے تحت ان میں صحت کی حفاظت
- صحیح طور پر ذہن وفکر کی تعمیر اور سائنس وٹکنولوجی سے دلچسپی لینے اور اپنی انفرادی زندگی کی تعمیر اور ملت کی ترقی کے لیے کام کرنے کا شعور پیدا کرنا ہماری اصل غایت ہے۔

تبصرہ نگار کے سامنے اپریل مئی جون کا مشترک شمارہ ہے۔ ٹائٹل، کاغذ، طباعت اور مضامین سب بہتر اور عمدہ ہیں۔

سال بھر کے لیے تیس روپیہ ـــــ

پتہ

ماہنامہ "الصدیق" الصدیق پبلی کیشنز۔ جامع کامپلکس، سری نرسمہا راجہ روڈ بنگلور ۲ کرناٹک

تنقید و تبصرہ

اسلامی نظام ایک نظر میں جناب وصی اقبال رامپور۔ صفحات ۸۸۔ آفسٹ کی طباعت قیمت پانچ روپیہ۔ ناشر:۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶

اسلامی نظام ایک ہمہ گیر نظام ہے جس کے دائرے میں انسان کے جسمانی و روحانی، مادی و اخلاقی، انفرادی و اجتماعی غرض اس کی پوری زندگی اپنے تمام شعبوں کے ساتھ داخل ہے۔ اس کی یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ یہ نظام صرف دنیوی زندگی کے معاملات سے بحث نہیں کرتا بلکہ اخروی زندگی کو بھی اپنے سامنے رکھتا ہے اور حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیوی زندگی کے تمام معاملات کو اخروی زندگی کی کامیابی و ناکامیابی کی میزان میں تول کر ہی طے کرتا ہے۔

ایک ایسے بے کراں نظام کی تفصیلات ایک چھوٹی سی کتاب میں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ اس کے ہر جز پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن کسی نظام کو اجمال کے ساتھ جاننا بھی ایک ضروری مرحلہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اجمالی علم، تفصیلی علم کی راہ ہموار کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ لوگ وقت کی کمی کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مختصر وقت میں کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں۔ اس نقطہ نظر سے وصی اقبال صاحب کی یہ کتاب اسلامی نظام کے اجمالی علم کے لیے نقش اول ہے۔ اس کتاب کی فہرست مضامین پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اختصار کے ساتھ اسلامی نظام کے ہر پہلو پر گفتگو کی ہے۔

اختصار کے ساتھ اسلامی نظام پر ایک نظر ڈالنے کے لیے یہ کتاب مفید ہے۔

ماہنامہ "الصدیق" بنگلور مدیر ڈاکٹر سید جمال احمد امین آبادی

ڈاکٹر سید جمال احمد امین آبادی ہمارے حلقے کے ایک معروف ادیب ہیں (باقی ص۵۵ پر)

MONTHLY ZINDAGI

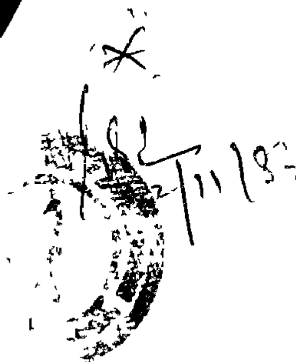
R.N.I./2188/57
MRD. 66

صرف ٹائٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

ماہنامہ

زندگی

رامپور



سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
بذریعہ ہوائی جہاز -/۱۰۰
بذریعہ بحری جہاز -/۵۰

ماہنامہ
زندگی رامپور
مدیر: سید احمد قادری

سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/۳۰
ششماہی
ہندوستان سے -/۱۵
قیمت فی پرچہ -/۳

جلد: ۱۷ | اکتوبر ۱۹۸۳ء مطابق ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ | شمارہ: ۴

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی مدت خریداری اس شمارہ کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے چندہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ انشاءاللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

منیجر زندگی نئی دہلی ۲

مالک دعوت ٹرسٹ، ایڈیٹر سید احمد عروج قادری پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶
مقام اشاعت [illegible]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

گزشتہ شمارے کے اشارات میں اس سوال کے جواب میں کہ سچے اور پکے مسلمان کون لوگ ہیں سورۂ البقرہ کی آیت ۱۷۷ پیش کی گئی تھی۔ جو لوگ قرآن کریم کا سمجھ کر مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ واقف ہیں کہ اس طرح کے سوالات کے جوابات قرآن میں اس وقت دیے جاتے ہیں جب کسی غلط خیال کی اصلاح مقصود ہوتی ہے یا مسلمانوں کی طرف سے کسی کمزوری کا ظہور ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں بھی یہود و نصاریٰ کی ظاہر پرستی کی اصلاح کے لیے یہ بتایا گیا تھا کہ حقیقی نیکی کیا ہے اور سچے مسلمان کون لوگ ہیں۔

سورۂ انفال کی ابتدائی آیات بھی اس سوال کا براہ راست جواب دیتی ہیں۔ غزوۂ بدر میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا اس کے بارے میں یہ بحث اٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ اس کے حق دار کون لوگ ہیں؟ لڑنے والے دعویٰ کر رہے تھے کہ مال غنیمت کے حق دار ہم لوگ ہیں۔ دشمنوں کی شکست کے بعد ان کا تعاقب کرنے والے مدعی تھے کہ حق دار ہم ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے والوں کا خیال تھا کہ حق دار ہم ہیں۔ حالانکہ سچے اور پکے ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ باہمی بحث و نزاع کے بجائے اس معاملہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس موقع پر ایک مشفقانہ عتاب کے انداز میں پیدا شدہ سوال کا دو ٹوک جواب ایک جملہ میں دے کر یہ واضح کیا گیا کہ سچے اور حقیقی ایمان کا تقاضا کیا ہے اور حقیقی مومنوں کی صفات کیا ہیں۔ آیات کا ترجمہ یہ ہے:۔

"تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو، یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول کے ہیں پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ سچے اہل ایمان تو وہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سنکر

لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا ہے وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے۔

(الانفال آیات ۱تا۴)

یہاں اموال غنیمت کے لیے انفال کا لفظ یہ احساس دلانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مال غنیمت نہ جہاد کا مقصد ہے اور نہ اس کا اصل اجر و صلہ ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا مزید فضل ہے جو تم پر کیا گیا ہے اس مال کا مالک اللہ تعالیٰ اور اس کے قاسم اللہ کے رسول ہیں۔ اس مختصر جواب نے بحث و نزاع کی پوری بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ اس کے بعد ایک مشفقانہ انداز عتاب کے ساتھ یہ بتایا گیا کہ اگر تم سچے مومن ہو تو اس کا تقاضا یہ ہے۔ اللہ کا تقویٰ۔ اصلاح ذات البین۔ اللہ و رسول کی کامل اطاعت

ایمان باللہ کا اصلی اور جامع تقاضا یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت کسی تنقعا کے بغیر کی جائے۔ ان کے ہر حکم کو مانا جائے اور انشراح و انبساط کے ساتھ اس پر عمل کیا جائے۔ ایسی اطاعت تقویٰ کے بغیر وجود میں نہیں آتی اس لیے پہلے اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد موقع و محل کے لحاظ سے اصلاح ذات البین یعنی باہمی تعلقات کی اصلاح کا حکم دیا گیا اور پھر بتایا گیا کہ سچے ایمان کا تقاضا صرف یہی نہیں کہ ان دو حکموں کو مانا جائے بلکہ اللہ اور اس کے رسول جو حکم بھی دیں اس کو مانا جائے اور ان کی کامل اطاعت کی جائے۔ یہاں مخاطب وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں اولین اور فیصلہ کن جنگ میں حصہ لے چکے تھے اس لیے جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ضروری نہ تھا۔ ان کنتم مومنین (اگر تم سچے مومن ہو) یہ وہ ٹکڑا ہے جس میں مشفقانہ عتاب کا انداز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان محض ایمان کے دعوے سے ثابت نہیں ہوتا جب تک اس کے تقاضے پورے نہ کیے جائیں۔ اس آیت میں تقویٰ اور اصلاح ذات البین کو مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی فوج کے سپاہیوں کے درمیان اگر باہمی تعلقات اچھے اور استوار نہ ہوں وہ دنیوی مفاد کی خاطر ایک دوسرے سے الجھ گئے ہوں تو وہ کسی دشمن کے لشکر کو شکست کیا دیں گے جب کہ خود ان کی اجتماعیت معرض خطر میں پڑی ہوئی ہو اور جہاں تک اسلامی جہاد کا تعلق ہے وہ تو اس صورت حال میں اسلامی جہاد ہو ہی نہیں سکتا (باقی آئندہ)

سلام وجواب سلام

(آخری قسط)

(سید احمد قادری)

سلام اسلامی شعار

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا

اے ایمان والو جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کر لیا کرو اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں

جس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے بعض ضمنی مباحث قرآن کریم میں ہیں اس لیے ان کو بھی یہاں لے لیا گیا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۸۶ کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات مروج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد آپس میں ملتے جلتے وقت ابتدائی تعارف، اظہار محبت و اعتماد، نشان اخوت و مودت اور علامت وحدت فکر و عقیدہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی استحکام و ارتباط کے نقطہ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے کے افراد خواہ ان کے اندر کتنی ہی دوری و بیگانگی ہو آمنے سامنے ہوتے ہی ان کے واسطے سے اس طرح باہم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں گویا ان کے اندر کوئی اجنبیت و بیگانگی تھی ہی نہیں۔ عربوں میں اس مقصد کے لیے بہت سے الفاظ اور فقرے معروف تھے۔ مثلاً حیاک اللہ (اللہ تمہاری عمر دراز کرے) اہلاً و سہلاً، مرحبا وغیرہ۔ سلام کا لفظ بھی معروف تھا۔ جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو بجز ان کلمات کے جن میں شرک کی کوئی آلائش تھی باقی تمام پاکیزہ کلمات باقی رہے البتہ السلام علیکم کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہے۔

ہوگئی۔ یہ کلمہ گویا مومن و کافر کے درمیان ایک علامت فارقہ بن گیا۔ جب ایک شخص نے دوسرے کے سامنے السلام علیکم کہہ دیا اور اس نے وعلیکم السلام سے اس کا جواب دے دیا تو گویا من و تو کا فرق اٹھ گیا اور دونوں دو قالب ایک جان ہوگئے اور جواب نہ دیا تو اس کے معنے صرف یہی نہیں ہوتے تھے کہ اس نے ان کا سلام قبول نہیں کیا بلکہ اس کے معنے یہ بھی ہوتے تھے کہ اس نے اس کے اسلام کو بھی تسلیم نہیں کیا۔"

آگے اس بحث کو ختم کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:۔

الغرض یہ سلام اور جواب کا معاملہ کوئی رسمی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اسلامی معاشرے میں یہ وصل و فصل کی بنیاد تھا۔ (۱)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے اسلامی شعار رہنے میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ یہ آج بھی اسلامی شعار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلا ضرورت اشارے سے سلام کرنا غلط ہے۔ البتہ اگر کوئی مسلمان دور ہو اور سلام کی آواز وہاں تک پہنچانا دشوار ہو تو اشارے سے سلام اور اشارے سے جواب کی گنجائش ہے لیکن اگر سلام کرنے والا اور جواب دینے والا ایک دوسرے سے قریب ہوں تو اشارے سے سلام اور جواب سلام اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ اسی طرح اگر قریب کا کوئی شخص صرف گردن ہلا کر جواب دے تو سلام کا جواب ادا نہیں ہوگا اور واجب اس کے ذمہ رہ جائے گا۔ بعض لوگ تو کسی گھمنڈ کی بنا پر صرف گردن ہلا کر رہ جاتے ہیں ایسے لوگ اسلامی نقطہ نظر سے ذلیل انسان ہوتے ہیں وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ نہایت حقیر ہوتے ہیں

نماز میں سلام

دین اسلام میں سلام کی اہمیت کا عالم یہ ہے کہ نماز جو افضل ترین و بہترین عبادت ہے اس کی ہر دو رکعت میں تشہد کی تعلیم دی گئی ہے اور اس میں بہت ہی واضح سلام کے الفاظ موجود ہیں۔ تشہد کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی۔ متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اس طرح تشہد کی تعلیم دیتے تھے جس طرح قرآن کی کسی سورہ کی تعلیم دیتے تھے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے "ہم لوگ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں بیٹھتے تو کہتے السلام علی اللہ قبل عبادہ (اللہ پر

(۱) تدبر قرآن ج ۲ ص

اس کے بندوں سے پہلے سلام) پھر فرشتوں کے نام لے کر ان کو سلام کہتے، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "السلام علی اللہ نہ کہا کرو۔ اس لیے کہ اللہ تو سراپا سلام ہے۔" ابن مسعود ہی کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لیکر تشہد کی اسی طرح تعلیم دی جس طرح آپ مجھے قرآن کی کسی سورۃ کی تعلیم دیتے تھے (۲) تشہد میں سلام کے یہ الفاظ سکھلائے گئے ہیں۔

السلام علیک ایها النبی	اے نبی آپ پر سلام اور اللہ کی رحمت اور
ورحمۃ اللہ وبرکاتہ السلام	اس کی برکتیں۔ ہم پر سلام اور اللہ کے
علینا وعلی عباد اللہ الصّٰلحین	نیک بندوں پر سلام

اس کے بارے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فانکم اذا قلتم ذالک اصاب	جب تم یہ الفاظ کہوگے تو ہر نیک بندے
کل عبد صالح فی السماء و	کو پہنچے گا جو آسمان اور آسمان و زمین
ما بین السماء والارض	کے درمیان ہو

یہ "عباد اللہ الصالحین" کی تشریح ہے اس میں صرف نیک انسانوں ہی پر نہیں بلکہ آسمان و زمین میں پھیلے ہوئے تمام فرشتوں پر سلام پہنچ جاتا ہے۔ پھر نماز سے باہر آنے کا ذریعہ بھی سلام ہی کو بنایا گیا ہے۔ دہنے بائیں السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس سلام میں بھی نہ صرف انسان مقتدی داخل ہیں بلکہ فرشتے بھی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ تنہا نماز پڑھنے کے لیے بھی نماز سے باہر آنے کا کلمہ یہی ہے۔ اس صورت میں تو فرشتے ہی مراد ہوتے ہیں۔

جنت میں سلام

جنت کی سب سے بڑی نعمت اللہ رب العزت کا دیدار اور اسی کا سلام ہوگا۔ سلام کی صراحت سورہ یٰس میں ہے:۔

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ	ان کے لیے سلام ہوگا پروردگار رحیم کی
(یٰس: ۵۸)	طرف سے

اس آیت کی تفسیر مولانا امین احسن اصلاحی نے یہ کی ہے:۔

---

(۲) بخاری و مسلم کتاب التشہد

یہ اس سب سے بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کو جنت میں حاصل ہوگی کہ رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہلایا جائے گا ..... سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا ہے : تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ (۴۴) اور ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے، سلام سے ہوگا۔"

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہوں گے اور اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اہلِ جنت کی اس سرفرازی کا کہ ان کو رب رحیم و کریم کی طرف سے سلام و پیغام موصول ہوں گے۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست (۳)

اس حقیر کا رجحان یہ ہے کہ جنت میں اللہ تعالیٰ اپنے فرماں بردار بندوں کو بلاواسطہ براہ راست اپنے سلام کا انمول تحفہ بھیجے گا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھا ہے :۔

یعنی اس مہربان پروردگار کی طرف سے جنتیوں کو سلام بولا جائے گا، خواہ فرشتوں کے ذریعے سے یا جیسا کہ ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے۔ "بلاواسطہ خود رب کریم سلام ارشاد فرمائیں گے۔ اس وقت کی عزت و لذت کا کیا کہنا" (۴)

تفسیر مظہری میں اس آیت کے تحت، ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا اور دارقطنی کے حوالے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جنت میں اللہ تعالیٰ بلاواسطہ السلام علیکم یا اہل الجنۃ کہے گا۔ پھر آپؐ نے سورۂ یٰس کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (۵) جب اللہ تعالیٰ کی رویت، قرآن کریم کے اشارات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ثابت ہے تو بلاواسطہ سلام کو تسلیم کرنے سے کیا چیز مانع ہو سکتی ہے۔ فرشتے بھی جنتیوں کو سلام کریں گے اس کا ذکر متعدد آیتوں میں ہے۔ میں صرف دو آیتوں کے ترجمے یہاں نقل کرتا ہوں

ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں گے ان کے آباء و اجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس جائیں گے اور کہیں گے آپ لوگوں پر سلامتی ہو بوجہ اس کے کہ آپ لوگ ثابت قدم رہے۔ پس کیا ہی خوب ہے انجام کار کی کامیابی۔　　　(الرعد۔ ۲۳۔ ۲۴)

(۳) تدبر قرآن ج ۵ ص ۴۳۲ (۴) مولانا شبیر احمد عثمانی مطبوعہ مدینہ پریس۔ بجنور۔ (۵) تفسیر مظہری ج ۸

جنت میں دنیا کی طرح اہل جنت کے آپس کا تحیہ بھی سلام ہی ہوگا۔

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس-۱۰)

اس میں ان کا ترانہ ہوگا۔ اے اللہ تو پاک ہے اور اس میں ان کی آپس کی تحیت سلام ہوگی اور ان کا آخری کلمہ الحمد للہ رب العلمین (شکر ہے اللہ رب العلمین کے لیے) ہوگا۔

جنت کے ناموں میں سے ایک نام دار السلام بھی ہے۔

یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ آخرت میں بھی نغمۂ سلام اسی طرح گونجے گا جس طرح دنیا میں گونج رہا ہے۔ قرآن کریم میں سلام سے متعلق جتنی باتیں ہیں ان سب پر کوئی مضمون مرتب کرنا مقصود نہیں ہے۔

سلام مفارقت ومتارکت

او پر سلام کی تین قسموں کا ذکر آیا ہے۔ اس کی چوتھی قسم بھی ہے۔ اس کو سلام مفارقت ومتارکت کہا جاسکتا ہے۔ یہ جاہلوں کی جہالت کے وقت شائستگی کے ساتھ ان سے الگ ہونے کے لیے کیا جاتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت توحید کے جواب میں جب ان کے والد نے ان کو سنگسار کر دینے اور گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی تو انھوں نے فرمایا:۔

"قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ (مریم رکوع ۳) ابراہیم نے کہا۔ اچھا میرا سلام "

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:۔

"یہ رخصت اور متارکت کا سلام ہے جیسے ہمارے محاورات میں ایسے موقع پر کہہ دیتے ہیں کہ "فلاں بات یوں ہے تو ہمارا سلام لو..... حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: "معلوم ہوا اگر دین کی بات سے ماں باپ ناخوش ہوں اور گھر سے نکالنے لگیں اور بیٹا ماں باپ کو میٹھی بات کہہ کر نکل جائے وہ بیٹا عاق نہیں"

آگے سورۂ قصص میں ہے:۔

"اور جب یہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال۔ بس ہمارا سلام لو۔ ہم جاہلوں سے الجھنا پسند نہیں کرتے (قصص-۵۵)

اس آیت کے تحت مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:۔

" یہ سلام مفارقت کے مفہوم میں ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو سلام کیا تھا۔ کسی سے پیچھا چھڑانے کا ایک نہایت شائستہ طریقہ ہے۔" لا نبتغی الجاھلین یہ ان کے طرز عمل کی تعبیر ہے کہ وہ دل میں خیال کرکے کہ جاہلوں سے الجھنے سے کچھ فائدہ نہیں ان کو سلام کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔ اس طریقہ تعبیر کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ بسا اوقات آدمی کا طرز عمل ہی اس کے قول کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ (۶)

سلام وسیلۂ محبت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق سلام، باہمی محبت کا بھی ایک وسیلہ و ذریعہ ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تدخلون الجنۃ حتی تؤمنوا ولا تؤمنوا حتی تحابوا الا ادلکم علی شیئ اذا فعلتموہ تحاببتم افشوا السلام بینکم (۷)	حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم جنت میں داخل نہیں ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ اور تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں وہ کام نہ بتاؤں کہ جب تم وہ کرو تو تمہارے درمیان محبت پیدا ہو گی اپنے درمیان سلام کو خوب رواج دو۔

کاش ہم مسلمان اس حدیث پر عامل رہے ہوتے۔ اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ باہمی محبت کے بغیر کامل ایمان نصیب نہیں ہو سکتا اور یہ کتنی بڑی بات ہے؟ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ مسلم معاشرے میں سلام کی کثرت، باہمی محبت کی پیدائش و افزائش کا ذریعہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ باہمی محبت اس سلام سے پیدا ہوتی اور بڑھتی ہے جو مخلصانہ ہو اور اس کا مفہوم سلام کرنے والے کے سامنے رہے۔ محض رسمی یا منافقانہ سلام سے محبت پیدا نہیں ہوتی۔

سلام وسیلۂ سلامتی

عن البراء رضی اللہ عنہ عن	حضرت براء سے روایت ہے کہ رسول اللہ

(۶) تدبر قرآن ج ۴ ص ۸۲۳　(۷) الترغیب والترہیب ج ۳ بحوالہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال افشوا السلام تسلموا (۸)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سلام کو پھیلاؤ، سلامت رہوگے۔

سلام بلندی اخلاق کا وسیلہ

عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم افشوا السلام کی تعلوا (۹)

ابو الدرداءؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلام پھیلاؤ تاکہ بلندی حاصل کرو۔

ان دو مختصر حدیثوں نے سلام کی تمام خوبیوں کو سمیٹ لیا ہے۔ السلام علیکم درحقیقت اظہار ہے اس جذبۂ امن وسلام کا جو ہر انسان کے دل میں ہر انسان کے لیے اور کسی مسلمان کے دل میں ہر مسلمان کے لیے ہوتا ہے۔ یہ چیز خود سلام کرنے والے کو نقصانات سے محفوظ رکھتی اور اس کے اخلاق وکردار کو بلندی عطا کرتی ہے۔

افشائے سلام میں صحابہ کرام کی روش

سلام کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا جو اثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے قبول کیا تھا اس کی بعض جھلکیاں ان احادیث میں نظر آتی ہیں۔

(۱) اغر مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے انصار کے ایک شخص سے کھجور کی ایک بڑی مقدار حاصل کرنے کا حکم دیا تھا لیکن وہ شخص ٹال مٹول کر رہے تھے میں نے اس کا ذکر آپ سے کیا تو آپؐ نے حضرت ابوبکر سے فرمایا کہ تم صبح جاکر کھجور ان کو دلوا دو۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ نماز صبح کے وقت میں مسجد نبوی میں تمھیں ملوں گا۔ جب ہم نے صبح کی نماز پڑھی تو حسب وعدہ وہ مسجد میں موجود تھے۔ ہم مسجد سے روانہ ہوئے۔ جب جب کوئی شخص دور سے حضرت ابوبکر کو دیکھتا تو ان کو دور ہی سے سلام کرتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ لوگ کس طرح تم پر فضیلت کا درجہ حاصل کر رہے ہیں۔ دیکھو کوئی شخص تم پر سلام میں سبقت نہ کرنے پائے اس کے بعد ہماری روش یہ ہو گئی تھی کہ جیسے ہی کوئی شخص دور سے نظر آتا تو اس کے سلام کرنے سے پہلے ہی

(۸) ایضاً رواہ ابن حبان فی صحیحہ

(۹) ایضاً رواہ الطبرانی باسناد حسن

ہم اس کو سلام کرتے۔ (۱۰) بعض روایتوں میں یہ آیا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سلام میں پہل کرتے

(۲) عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال کنا اذا کنا مع رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فتفرق بیننا شجرۃ فاذا التقینا یسلم بعضنا علی بعض (۱۱)	انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تو ہمارا طریقہ یہ تھا کہ اگر کوئی درخت ہمارے درمیان حائل ہو جاتا اس کے بعد ہم پھر ایک دوسرے کے سامنے آتے تو ایک دوسرے کو سلام کرتے۔

یعنی ایک لمحہ کے لیے بھی کسی کا نظر سے اوجھل ہو جانا اس کو پھر سلام کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کثرت سے صحابہ کرام ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ اس کی شاید وجہ یہ ہو کہ سلام میں بخل کرنے والے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بڑا بخیل قرار دیا ہے:۔

(۳) عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعجز الناس من عجز فی الدعاء والبخل الناس من بخل بالسلام (۱۲)	ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں سب سے بڑھ کر عاجز وہ ہے جو دعا میں عاجز ہو اور لوگوں میں سب سے بڑا بخیل وہ ہے جو سلام میں بخل کرے

دعا میں عاجز ہونے کے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ سے کچھ نہ مانگے اور اس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے اور سلام میں بخل کے معنے یہ ہیں کہ اس کے لیے بھی کوئی شخص اپنی زبان نہ ہلائے

ابن عمر رضی اللہ عنہ کی منفرد روش

صحابہ کرام میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اتباع سنت میں ممتاز تھے۔ سلام میں بھی ان کی ایک منفرد روش تھی۔

(۴) طفیل بن ابی بن کعب سے روایت ہے کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس آیا کرتے

---

(۱۰) ایضاً رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط واحد اسنادی الکبیر رواتہ محتج بہم فی الصحیح۔

(۱۱) ایضاً رواہ الطبرانی باسناد حسن (۱۲) ایضاً رواہ الطبرانی فی الاوسط قال الحافظ ہو اسناد جید قوی

اور شیخ کو ان کے ساتھ بازار جاتے دیکھتے ہیں کہ ہم لوگ جب بازار جاتے تو عبداللہ بن عمر ہر شخص کو سلام کرتے خواہ وہ کسی پوزیشن کا آدمی ہو اور کسی بھی پیشے سے تعلق رکھتا ہو طفیل کہتے ہیں کہ ایک دن میں عبداللہ بن عمر کے پاس آیا تو انھوں نے چاہا کہ میں بھی ان کے ساتھ بازار چلوں تو میں نے ان سے کہا کہ آپ بازار میں کیا کرنے جاتے ہیں۔ آپ نہ کچھ خریدتے ہیں، نہ کسی سامان کے بارے میں کچھ دریافت کرتے ہیں، نہ بھاؤ تاؤ کرتے ہیں، نہ بازار کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں حالانکہ میں یہ کہتا رہتا ہوں کہ یہاں بیٹھیے یہاں بیٹھیے کچھ بات چیت کریں۔ یہ سنکر انھوں نے جواب دیا۔ اے بڑے پیٹ والے اور طفیل کا پیٹ بڑا تھا۔ ہم صرف لوگوں کو سلام کرنے کے لیے بازار جاتے ہیں۔ ہم جس سے ملتے ہیں اس کو سلام کرتے ہیں[۱۳]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افشائے سلام اور سلام کا اجر حاصل کرنے کی بے حد رغبت صحابۂ کرام کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی۔

---

(۱۳) ریاض الصالحین رواہ مالک فی الموطا باسناد صحیح

تدبر قرآن پر ایک نظر

مولانا جلیل احسن ندوی رحمہ

صاحب تدبر نے بقرہ آیت ۱۱۱ (وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ ـــــ صَادِقِينَ) کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :-

"اور کہتے ہیں کہ جنت میں داخل نہیں ہو سکتے مگر وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی ہیں۔ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو" (تدبر اول ۲۴۹)

اور اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

...... اسی طرح یہ پروپیگنڈا بھی یہود و نصاریٰ دونوں کی طرف سے کیا گیا کہ نجات حاصل کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے دین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش

یہود و نصاریٰ یوں تو آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ آئے دن ان کے اندر مذہبی اختلافات کی بنا پر خون خچر ہوتا رہتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے لیے دونوں آپس میں بڑے رواداربن گئے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا تھا اور ہم زبان ہو کر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ جس کو نجات مطلوب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی۔ یہ نیا دین بھلا کیا ہے۔ یہ تو محض ایک فتنہ ہے۔ (تدبر ۲۵۶)

یہ ہے مولانا اصلاحی صاحب کی تفسیر جو انھوں نے کی ہے، یہ بات تو صحیح ہے کہ اسلام دشمنی میں مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ نے ایک متحدہ محاذ بنا لیا تھا لیکن ہر ایک دوسرے کے لیے اتنا روادار بن گیا تھا کہ اپنے عقائد سے دست برداری دے دی ہو۔ یہ بات مولانا سے دوبارہ غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہے۔ تاریخ

مذاہب میں متحدہ محاذ کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی کی مخالفت میں دو گروہ اپنے عقائد تک سے دست کش ہو گئے ہوں۔ یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ حق صرف یہودیت ہے اور بقیہ ساری دنیا باطل پرست ہے یہاں تک کہ نصاریٰ بھی اور صرف وہی جنت میں جائیں گے۔ باقی ساری دنیا جہنم میں یہاں تک کہ نصاریٰ اور مشرکین عرب بھی! اب مولانا اصلاحی کی رائے کے مطابق انھوں نے اپنے اس عقیدے کو چھوڑ کر یہ عقیدہ اپنایا کہ نہیں نصاریٰ بھی نجات پائیں گے اور اب جنت میں وہ بھی ہمارے ساتھ رہیں گے۔ پہلے ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ دین یہودیت ہی حق ہے۔ لیکن مولانا کی رائے کے مطابق حق کے علم بردار دو ہو گئے۔ مولانا سے بادب پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ متحدہ محاذ کے تیسرے فریق — مشرکین عرب — کے بارے میں یہود کا عقیدہ کیا ہے۔ رہا نصاریٰ کا جب سیلاب چل رہا ہے تو ان کا عقیدۂ اشراک بھی یہود و نصاریٰ کے نزدیک حق ہوگا۔ ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اصل قصہ وہ ہے جسے بالعموم علمائے تفسیر نے اختیار کیا اور اس اسلوب کو صاحب کشاف نے لَفّ کا نام دیا ہے — یعنی ایک لمبی عبارت کو مختصر کر دیا گیا ہے۔ ذہن سامع پر اعتماد کر کے، ورنہ اصل عبارت یوں بنتی ہے: وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا وقالت النصاریٰ لن یدخل الجنۃ الا من کان نصاریٰ (اور یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف یہود ہی جنت میں جائیں گے اور نصرانیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف نصاریٰ ہی جنت میں جائیں گے) معلوم نہیں کیوں مولانا کا ذہن لف کے اسلوب کی طرف نہیں گیا۔ اور اگر گیا اور وہ پسند نہ آیا اور اپنی الگ سے بات پیش کی تو اوپر ہم نے جو سوال اٹھایا ہے اس کا جواب چاہیے۔

آگے جہاں ابراہیم اور خانۂ کعبہ کی بحث آئی ہے وہاں ایک آیت آئی ہے وَاِذْ جَعَلْنَا —— السجود (آیت البقرہ) اس کا ترجمہ مولانا اصلاحی کے الفاظ میں:۔

> اور یاد کرو جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو
>
> (ص ۲۷۷ تا ۲۷۸)

اور آخری جملہ کی تشریح اس طرح کی ہے:۔

> یہاں اس گھر کو تین چیزوں کے لیے خاص کرنے کا حکم ہوا ہے۔ طواف، اعتکاف اور رکوع و سجود،

طواف سے مراد خانہ کعبہ کے گرد پھیرے لگانا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس کا وہ طریقہ واضح فرما دیا ہے جو اس کا اصل ابراہیمی طریقہ ہے طواف درحقیقت نماز کی ایک قسم ہے لیکن یہ نماز صرف خانہ کعبہ ہی کے پاس ادا ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کہیں اور ادا نہیں ہو سکتی ...... عاکف عکوف سے ہے جس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے کسی خاص کو پکڑ لینا ہے اسی سے اعتکاف ہے جو گیان دھیان اور ذکر و فکر کی عبادت ہے۔ بندہ ہر چیز سے کٹ کر اپنے رب کی یاد کے لیے گوشہ نشین ہو جائے، یہ اعتکاف ہے "

(تدبر اول صفحہ ۲۸۸ و ۲۸۹)

مولانا نے طائفین کے معنے طواف کرنے اور عاکفین کے اعتکاف کرنے کے لیے ہیں۔ یہاں بقرہ میں طائفین اور عاکفین کے الفاظ آئے ہیں اور سورۂ حج آیت ۲۶ میں اسی موقع پر طائفین اور قائمین کے الفاظ آئے ہیں اور اس سے اوپر آیت ۲۵ میں عاکف اور باد کے الفاظ آئے ہیں۔ ان نظائر کی روشنی میں طائفین سے مراد مکہ سے باہر کے لوگ ہیں اور عاکفین سے مراد مکہ کے باشندے۔ اور مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کا دروازہ کھلا رہنا چاہیے کسی پر بند نہ ہو۔ یہ خاص ہے اہل توحید کے لیے جس کا عملی مظہر رکوع و سجود یعنی نماز ہے والرکع میں واو تفسیر کا ہے یعنی یہ گھر تمام اہل توحید کا گھر ہے۔ وہ مکی ہوں یا غیر مکی۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اہل ایمان جاہلی مشرک متولیوں کی طرح خانہ کعبہ کا دروازہ سب کے لیے کھلا رکھیں گے اور للطائفین میں لام انتفاع کا ہے۔ طائف سے مراد مکہ کے لوگ ہیں اور عاکف سے مقیم یعنی مکی باشندے۔ سورۂ حج میں قائمین سے مراد مقیمین ہیں۔ نماز میں قیام کرنے کے معنے لیے تو جا سکتے ہیں لیکن ہمارا پسندیدہ مفہوم وہ ہے جو اوپر عرض کیا گیا۔

سورۂ البقرہ آیت ۱۱۵ (ولله المشرق ــــ عليم) کا ترجمہ تدبر میں اس طرح کیا گیا ہے "اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں۔ تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے۔ اللہ بڑی گنجائش اور علم والا ہے"

(صفحہ ۲۴۹)

اور تفسیر کے حصہ میں ایک لمبی عبارت میں بتایا کہ یہ اس وجہ نزاع و اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو یہود و نصاریٰ کے درمیان معابد و مساجد کی توہین و تخریب کا سبب ہوئی۔ یہود نے اپنا قبلہ مغرب کو اور نصاریٰ نے مشرق کو

بنا لیا اور اس کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر کرتے۔ اسی بنیاد پر آئے دن ان کے درمیان خون خچر ہوتا رہتا تو اللہ تعالیٰ یہاں مولانا کی رائے کے مطابق فرماتے ہیں :۔

> قرآن مجید نے یہاں اس سبب اختلاف و نزاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی لغویت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ مشرق ہو یا مغرب دونوں سمتیں اللہ ہی کی ہیں۔ ان میں جس سمت کا انسان رخ کرے اگر وہ خدا ہی کی طرف متوجہ ہے تو اس کا رخ خدا ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس چیز کو یہود و نصاریٰ نے سر پھٹول اور ہدم معابد و مساجد کا سبب بنایا تو یہ ان کی جہالت و حماقت ہے۔ سمتیں اور جہتوں میں سے کسی سمت و جہت کو بھی خدا کے ساتھ اختصاص نہیں ہے وہ بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر جدھر بھی رخ کرتے، خدا ہی کی طرف کرتے۔ (تدبر صفحہ ۲۵۹)

مولانا کی تاویل بالکل غلط رخ پر چلی گئی ہے۔ یہ تاویل تو یہود و نصاریٰ کو سند عطا کر رہی ہے کہ تم نے جو سمتوں کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے دونوں سمتیں اللہ ہی کی ہیں، جدھر بھی تم رخ کر کے نماز پڑھو سب ٹھیک ہے، پھر تم کاہے کو اس بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہو، ایک دوسرے کا خون بہاتے ہو، اور ایک دوسرے کے معابد کو ڈھاتے ہو؟ آیت کا یہ مطلب بالکل غلط ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ یہ بتا کر یہود و نصاریٰ کو سمجھا نہیں رہا ہے، بلکہ قبلۂ عارضی (بیت المقدس) کی جگہ قبلہ ابراہیمی (خانہ کعبہ) بننے والا ہے اور قبلہ کا مسئلہ بڑا نازک مسئلہ ہے اس لیے ما ننسخ والی آیت ۱۰۶ ہی سے آہستہ آہستہ ذہنوں کو تیار کیا جا رہا ہے، خدائے علیم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ خصوصیت سے یہود کتنا زبردست طوفان اٹھانے والے ہیں، اسی لیے قبلہ کی منسوخی کا اعلان کرنے سے پہلے مسلمانوں کو ہوشیار کیا گیا ہے کہ یہودی فتنہ باز کیا فتنہ اٹھانے والے ہیں، اس لیے یہاں قبلہ کی بنیاد پر تکفیر اور جہنمی بنانے اور ہدم و تخریب معابد کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ مشرق و مغرب یعنی پوری کائنات کا فرماں روا اور بادشاہ ہے وہ جدھر کو رخ کرنے کا حکم دے گا وہیں اللہ کی خوشنودی مرکوز ہے۔ خدا کے کسی حکم کے آنے کے بعد اگر کوئی بغاوت کرے گا کسی اور کو اپنا قبلہ بنائے گا تو وہ خدا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکے گا۔ گویا بند لفظوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اصل ابراہیمی قبلہ کے خدائی حکم آنے کے بعد رضائے الٰہی مرکوز ہوگی اس طرف رخ کرنے میں ہی! اللہ بڑا فیاض ہے اس کے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں اور اس کی فیض بخشی اہل کتاب تک ہی محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ جانتا ہے کہ کون اس کے فضل و کرم کا مستحق ہے، پہلے ہم نے تمہیں منتخب کیا تھا حق کی گواہی دینے کے لیے، حق کا اعلان کرنے کے لیے، حق کو

غالب کرنے کے لیے لیکن تم خائن اور بے ایمان ثابت ہوئے تب ہم نے اولاد اسمٰعیل (عرب قوم) کو اپنی فیض بخشی کا مستحق جانا، ان کے اندر نبی بھیجا، کتاب اتاری اور اب ان کو مرکزی قبلہ ابراہیمی سے سرفراز کرنے والے ہیں! آیت کا یہی مطلب بعض دوسرے علماء تفسیر نے بھی لکھا ہے ۔ آیت کے دوسرے جملہ کا ٹھیک ترجمہ یہ ہوگا "پس جدھر بھی (اب) اللہ کے حکم سے اپنا رخ کروگے تو وہیں اللہ کی خوشنودی ہے"۔ اور یہ ترجمہ درست نہیں ہے "تو جدھر بھی تم رخ کرو ادھر ہی اللہ ہے"۔

مولانا نے بقرہ آیت ۱۳۸ (صِبْغَةَ اللّٰهِ ۔ عَابِدُوْن) کا ترجمہ یہ کیا ہے :۔

"کہہ دو، یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں"۔ (تدبر صفحہ ۲۷۹)

اور تشریح میں فرماتے ہیں :۔

یہود و نصاریٰ کو مخاطب کرکے دعوت دی گئی ہے کہ اگر اپنے کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہو تو یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ (تدبر صفحہ ۳۰۵)

یہ ترجمہ اور تشریح ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں متکلم اہل ایمان ہیں، وہ یہود و نصاریٰ کو دعوت نہیں دے رہے ہیں بلکہ یہود و نصاریٰ (بالخصوص یہود) کی دعوت کا جواب دے رہے ہیں کہ ہم نے خدا کا رنگ اپنا لیا ہے۔ تمہارے پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں گے۔ خدا کے رنگ (توحید) سے اچھا رنگ اور کیا ہو سکتا ہے اور ہم صرف اسی کی بندگی کریں گے۔ ہم کسی حال میں نظام توحید (عبادت اللہ اپنے پورے معنے میں) سے منحرف نہ ہوں گے۔ مولانا نے آیت کے آخری جملہ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُوْنَ ﴿۰﴾ (ہم اسی کے عابد رہیں گے) پر غور نہیں فرمایا۔

سورۂ بقرہ آیت ۱۶۸ (یا ایہا الناس کلوا ۔ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۰﴾) اس آیت کا ترجمہ یہ ہے :۔

"اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال و طیب ہیں ان کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے"۔ (تدبر اول ص ۳۴۹)

اور تفسیری حصہ میں فرماتے ہیں۔ "یہ خطاب عربوں سے ہے جن کے شرک کی طرف اوپر کی آیات میں اشارہ کیا گیا تھا۔"

اوپر کی آیات سے مراد آیات ۱۶۵ تا آیت ۱۶۷ ہیں۔ ان تمام آیتوں کو مولانا نے مشرکین سے متعلق قرار دیا ہے، حالانکہ سورہ مدنی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے "اے لوگو" میں اہل کتاب آئیں گے پھر دوسرے نمبر پر مشرکین عرب۔ اور اگر مکی سورہ ہو تو سب سے پہلے مشرکین عرب اور پھر اہل کتاب لیکن مولانا نے بقرہ آیت ۲۱ میں "یا ایھا الناس" سے بنی اسمٰعیل یعنی عرب مشرکین کو مخاطب کرنا ہے اور اس پر ہم نے اپنی بات پیش کر دی ہے کہ کوئی قرینہ اس بات پر نہیں ہے کہ مخاطب مشرکین عرب ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی کوئی قرینہ صرف عربوں کو مراد لینے کا نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سورہ مدنی ہے سامنے اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں۔ اس لیے آیت ۱۶۵ سے لیکر آیت ۱۷۱ تک میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اہل کتاب بالخصوص یہود سے متعلق ہے اولین حیثیت میں اور دوسرے نمبر پر مشرکین عرب کو رکھیے۔ شرک کے مرتکب اہل کتاب اور مشرکین عرب دونوں ہیں۔ انداد (ہمسر اور مد مقابل شرکاء) دونوں نے بنائے ہیں۔ دونوں اپنے انداد سے خدا کے مقابلہ میں زیادہ محبت کرتے ہیں۔ دونوں نے قانون سازی کا خدائی حق دوسروں کو دے رکھا ہے، تو پھر صرف عربوں کو مخاطب کیوں مانیے۔ مولانا کا خیال یہ ہے کہ یہاں ایھا الناس سے مشرکین عرب مراد ہیں اور آگے آیت ۱۷۴ میں اہل کتاب کا ذکر آ رہا ہے، حالانکہ ان کا ذکر ان کی حق پوشی کا ہو رہا ہے۔ اگر وہ بات ہوتی تو واو کے ساتھ ان کا ذکر آنا چاہیے تھا۔

بقرہ آیت ۱۷۸ (یا ایھا الذین امنوا ——— عذاب الیم) کا ترجمہ تدبر یہ ہے:

"اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض ٹھیرایا گیا ہے۔ آزاد آزاد کے بدلے، غلام غلام کے بدلے، عورت عورت کے بدلے۔ پس جس کسی کے لیے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ رعایت کی گئی تو اس کے لیے دستور کی پیروی کرنا اور خوبی کے ساتھ اس کو ادا کرنا ہے یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی تخفیف اور مہربانی ہے، تو اس کے بعد جو زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (تدبر جلد اول صفحہ ۳۸۲)

گزارش یہ ہے کہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی کا یہ ترجمہ عربی زبان کے لحاظ سے صحیح

نہیں ہے۔ اگر لِلْقَتْلٰی ہوتا تو شاید کسی حد تک صحیح ہو سکتا۔ پھر جب مولانا یہاں جان کے بدلے جان کا مفہوم بنا رہے ہیں قصاص کا تو اس کو ادا کرنے کے لیے سیدھی سادی عبارت یہ ہوتی کُتِبَ عَلَیکُمُ الْقِصَاصُ مِنَ الْقَاتِلِ یا من القاتلین (تم پر فرض کیا گیا قاتل سے قصاص لینا) قصاص باب مفاعلة کا مصدر ہے جس کے معنے برابری اور مساوات کے ہیں اور اس کا استعمال زیادہ تر مالی مساوات کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ المصباح المنیر اور دیگر لغت کی کتابوں میں مذکور ہے۔ یہاں جان کے بدلے جان کا مسئلہ بیان نہیں ہو رہا ہے۔ مسئلہ تو ہجرت سے ذرا پہلے نازل ہونے والی سورہ بنی اسرائیل آیت ۳۳ میں بیان ہو چکا ہے۔ (وَلَا تَقْتُلُوا ــــ مَنْصُوْرًا) جس کا ترجمہ مولانا کے الفاظ میں پیش ہے:-

> اور جس جان کو خدا نے محترم ٹھہرایا اس کو قتل مت کرو مگر حق پر اور جو ظلماً قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کو اختیار دیا تو وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے کیونکہ اس کی مدد کی گئی ہے۔
>
> (تدبر سوم صفحہ ۲۷۷)

غرض یہاں جان کے بدلے جان کا ذکر نہیں ہو رہا ہے بلکہ دیت (خون بہا) کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ اسلامی معاشرے میں جاہلیت کی دھاندلی نہیں چلے گی۔ مقتول مقتول سب برابر ہیں اور سب کی دیت برابر ہے۔ اب ایسا نہیں ہو سکتا کہ اونچی ناک والا خاندان اور قبیلہ یہ کہے کہ میں تو اپنے غلام کا خون بہا خاندانی آدمی (حُر کے برابر لوں گا یعنی سو اونٹ جب کہ غلام کی دیت آدھی یعنی پچاس اونٹ ہو اسی طرح اونچی ناک والا یہ کہے کہ میں تو اپنے مقتول کی دیت دوگنی سہ گنی یا بار گنی اور پانچ گنی لوں گا اب یہ دھاندلی نہیں چلے گی۔ اب تو حُر (آزاد خاندانی) مقتول کی دیت سو اونٹ ہوگی۔ چاہے وہ اونچی ناک والا ہو چاہے نیچی ناک والا

مولانا کے مفہوم کے مطابق اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ والے جملے کا مطلب یہ بنتا ہے کہ حُر، حُر کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غلام کو کوئی حر قتل کر دے تو کیا وہ حر نہیں مارا جائے گا؟ یہ خرابی نتیجہ ہے اس بات کا کہ مولانا کے نزدیک عربی میں مفہوم تھا الحر یقتل بالحر (حر حر کے بدلے قتل کیا جائے گا) حالانکہ صحیح عبارت یہ ہے الحر مثل الحر (حر حر کے برابر ہے مساوی ہے) آگے فَمَنْ عُفِیَ سے لیکر آخر تک کا مفہوم دیت سے متعلق ماننے پر مولانا بھی مجبور ہیں۔ وہاں جان کے بدلے کی تقریر نہیں کی جا سکتی۔ یہاں دو بار قصاص کا لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ برابری اور مساوات کے مفہوم

میں ہے اسی طرح آگے آیت ۹۴ میں بھی آیا ہے۔ وہاں جان کے بدلے جان کے مفہوم میں لینا ممکن ہے اور سورۂ مائدہ آیت ۴۵ میں بھی قصاص کا لفظ آیا ہے وہاں بھی دیت کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے اور فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ اس کا واضح قرینہ ہے۔ یہ بالکل فَمَنْ عُفِيَ کے ہم معنی جملہ ہے۔ امید ہے کہ مولانا نظرثانی کے وقت میری معروضات کو پیش نظر رکھیں گے۔

بقرہ آیت ۱۸۳ تا ۱۸۵ (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ـــــ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ٥) کا ترجمہ یہ ہے:-

"اے ایمان والو تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو گنتی کے چند دن، اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کر دے، اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے، اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے سختی نہیں کرنا چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو (اور اللہ نے تمہیں جو ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو۔" (تدبر اول ص ۳۹۹، ۴۰۰)

مولانا اصلاحی صاحب نے "گنتی کے چند دن" سے رمضان کے روزے مراد لیے ہیں اور آگے چل کر شَهْرُ رَمَضَانَ کے تحت فرماتے ہیں "قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اوپر والی آیت کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی ہے"۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف مولانا فرماتے ہیں کہ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ سے مراد رمضان کے روزے ہیں اور دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ شَهْرُ رَمَضَانَ والی آیت کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی تو نبی اور صحابہ نے کس طرح جانا کہ گنتی کے چند دنوں سے رمضان کے روزے مراد ہیں؟ دونوں کے درمیانی وقفہ میں نبی اور صحابہ نے کتنے روزے رکھے اور کب رکھے؟ کیا رمضان کے روزے رکھے؟ یہ کس طرح جب کہ رمضان کے مہینہ والی آیت ابھی اتری ہی نہیں؟

قرآن اور تفتیش کائنات

(۲)

سید احمد قادری

انفسی دلائل

اوپر آفاقی دلائل سے متعلق چند آیتوں کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے انسان کو اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی بھی دعوت دی ہے۔ خود انسان کے اندر توحید، آخرت اور رسالت کے جو شواہد موجود ہیں انہیں کو انفسی دلائل کہا جاتا ہے۔ میں کچھ ایسی آیتیں بھی یہاں پیش کرتا ہوں۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ — اور خود تمہارے اندر بھی کیا تم دیکھتے نہیں

اس چھوٹے سے جملے میں دلائل و شواہد کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ عہد حاضر کے ایک مفسر قرآن لکھتے ہیں:-

> یہ سورۂ حٰم اور سورۂ النفس کے دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن نے جس طرح آفاق سے اپنی دعوت کے تمام بنیادی اجزا پر استدلال کیا ہے، اسی طرح انفس سے بھی تمام اصولی مطالب پر دلیل قائم کی ہے ..... قرآن نے جگہ جگہ انسان کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو خدا حقیر پانی کی ایک بوند کو مختلف ادوار و مراحل سے گزار کر ایک بھلا چنگا انسان بنا کر اٹھاتا ہے اور اس کو گوناگوں ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے آراستہ کر دیتا ہے کیا اس کے لیے یہ ناممکن خیال کرتے ہو کہ تمہارے مر کھپ جانے کے بعد تم کو از سر نو زندہ کر کے اٹھائے اور تمہارے تمام اعمال و اقوال کا حساب کرے۔ جب پہلی بار تمہارا پیدا کیا جانا اس کے لیے ناممکن نہیں ہوا تو دوبارہ یہ کام اس کے لیے کیوں ناممکن خیال کرتے ہو کہ تمہارے مر کھپ جانے کے بعد تم کو از سر نو زندہ کر کے

اٹھائے اور تمہارے اعمال واقوال کا حساب کرے۔ جب پہلی بار تمہارا پیدا کیا جانا اس کے لیے ناممکن نہیں ہوا تو دوبارہ یہی کام اس کے لیے کیوں ناممکن ہو جائے گا؟ اسی ضمن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ ہر آدمی ہر روز اپنے اندر زندگی، موت، برزخ اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے مشاہدات کو یوں ہی نہ گزر جانے دے بلکہ ان پر غور کرنے کی عادت بھی ڈالے ـــــ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل، ادراک اور علم کی جن صلاحیتوں سے آراستہ فرمایا ہے اور جن فطری قوتوں اور قابلیتوں سے اس کو مسلح کیا ہے ان کی روشنی میں یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ انسان زمین کے دوسرے جانداروں کی طرح اس زمین ہی کی مخلوق نہیں ہے بلکہ اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ایک خاص دائرے میں اختیار وارادہ کی امانت کا حامل ہو کر آیا ہے جس کی بنا پر خدا نے اس کو اپنی خلافت کے مرتبہ بلند پر سرفراز فرمایا ہے۔ امانت خلافت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ایک دن وہ اپنے رب کے آگے پیش ہو تاکہ جس نے اس امانت وخلافت کا حق ادا کیا ہو وہ اس کا ابدی انعام حاصل کرے اور جس نے امانت میں خیانت اور خلافت پاکر بغاوت کا ارتکاب کیا ہو وہ اس کی ابدی سزا بھگتے۔ گویا جزا و سزا انسان کے مرتبہ خلافت پر سرفرازی کا ایک لازمی اور بدیہی تقاضا ہے۔

تیسری اہم حقیقت جو سورہ قیامہ میں خاص اہتمام کے ساتھ واضح فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نفس لوامہ ودیعت فرمایا ہے کہ وہ اس کو جب وہ کسی برائی کا ارتکاب کرتا ہے ملامت کرتا ہے۔ اسی نفس لوامہ کی قسم کھا کر جزا و سزا کے حق ہونے پر اس کو شہادت میں پیش کیا ہے کہ اگر انسان کو وجود میں لانے والا نیکی پر انعام اور بدی پر سزا دینے والا نہ ہوتا تو انسان کے اندر وہ اس نفس لوامہ کو کیوں ودیعت فرماتا جو اس کو ہمیشہ ایک خلش میں مبتلا رکھے؟ .... یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نفس لوامہ انسان کو متنبہ کرنے کا فرض اس وقت تک برابر انجام دیتا رہتا ہے جب تک انسان اس کی مسلسل خلاف ورزی سے اس کو بالکل مردہ نہ بنا دے (تدبر قرآن ج ۶)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو حیرت انگیز صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت کی ہیں انہی کی بنا پر انسان

ایک عالم صغیر کی حیثیت رکھتا ہے اسی کے ساتھ اللہ نے نفس لوامہ کی شکل میں ہر انسان کے اندر ایک چھوٹی سی عدالت قائم کر دی ہے اور یہ عدالت بھی اپنے فیصلے دیتی رہتی ہے۔ لیکن افسوس کہ بہت سے انسان اس پر کان نہیں دھرتے۔

(۲) أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم (الروم ۸) کیا انھوں نے اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا

انسان بھی اس کائنات کا بلند مرتبہ جزہے اور مطالعۂ نفس بھی مطالعہ کائنات ہی کا ایک اندرونی رخ ہے اور اندرون کا منصفانہ مطالعہ خارج کے مطالعہ سے بڑھ کر انسان کو ان حقائق تک پہنچا سکتا ہے جن تک پہنچنے اور ان پر ایمان لانے کی قرآن دعوت دیتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ مطالعہ اس چراغ کی روشنی میں کیا جائے جو قرآن نے جلایا ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے:۔

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنزَلْنَا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝ (التغابن: ۸)

پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس روشنی پر جو ہم نے نازل کی ہے جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے

جس طرح روشنی خود نمایاں ہوتی ہے اور گرد وپیش کی ان تمام چیزوں کو نمایاں کرتی ہے جو پہلے تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں اسی طرح قرآن ایک ایسا چراغ ہے جس کا برحق ہونا بجائے خود روشن ہے اور اس کی روشنی میں انسان ہر اس مسئلے کو سمجھ سکتا ہے جسے سمجھنے کے لیے اس کے اپنے ذرائع علم وعقل کافی نہیں ہیں یہ چراغ جس شخص کے پاس ہو وہ فکر وعمل کی بے شمار پُرپیچ راہوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ صاف صاف دیکھ سکتا ہے اور عمر بھر صراط مستقیم پر اس طرح چل سکتا ہے کہ ہر قدم پر اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گمراہیوں کی طرف لے جانے والی پگڈنڈی کدھر کدھر جا رہی ہے اور ہلاکت کے گڑھے کہاں کہاں آرہے ہیں اور سلامتی کی راہ ان کے درمیان کون سی ہے“۔ (تفہیم القرآن ج ۵)

کچھ لوگوں نے سورۂ عنکبوت اور سورہ فصلت کی آیت ۵۳ سے کائنات کی تفتیش کا ثبوت پیش کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ہم ان آیتوں پر گفتگو کرتے ہیں:۔

سورۂ عنکبوت

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ

کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے پھر اس کا

يَسِيْرٌ ٥ قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ
اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ٥ (۱۹-۲۰)

يقول تعالى ذكره اولم يروا
كيف يستانف الله خلق الاشياء
طفلا صغيرا ثم غلاما يافعا
ثم رجلا مجتمعا ثم كهلا ....
ثم يعيده من بعد فنائه و
بلائه كما بدأه اول مرة خلقا جديدا
لا يتعذر عليه ذالك ان ذالك
على الله يسير سهل كما كان يسيرا عليه
قل سيروا فى الارض يقول
تعالى ذكره لمحمد صلى الله عليه
وسلم قل يا محمد للمنكرين للبعث
بعد الممات الجاحدين الثواب
والعقاب سيروا فى الارض
فانظروا كيف بدء الاشياء و
احدثها وكما احدثها ابتداء
فلم يتعذر عليه احداثها مبدئا
فكذالك لا يتعذر عليه انشائها
معيدا ثم الله ينشئ النشاة الاخرة
يقول ثم الله يبدء تلك البدائة

([illegible])

اعادہ کرتا ہے یقیناً اعادہ تو اللہ کے
لیے آسان تر ہے۔ ان سے کہو کہ زمین پر
چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی
ابتدا کی ہے۔ پھر اللہ بار دگر بھی زندگی بخشے گا
یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے
کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ کس طرح
چیزوں کی ابتدا کرتا ہے۔ مثلاً انسان پہلے
ایک چھوٹا بچہ ہوتا ہے۔ پھر نوجوان لڑکا ہو جاتا
ہے۔ پھر بھرپور قوی جوان بن جاتا ہے۔ پھر
ادھیڑ ہوتا ہے اور پھر بوڑھا ہو کر دنیا سے
گزر جاتا ہے۔ پھر مرنے کے بعد دوبارہ اس
کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ یہ اعادہ اللہ کے لیے
ویسا ہی آسان ہے جیسا آسان اس کا آغاز تھا
قُلْ سِيْرُوْا — اللہ محمد صلی اللہ
علیہ وسلم سے فرماتا ہے۔ آپ ان لوگوں سے
کہہ دیں جو مرنے کے بعد اٹھائے جانے اور ثواب
عذاب کا انکار کرتے ہیں کہ زمین میں چل پھر کر
دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح بے شمار مخلوقات
ابتداءً پیدا کی ہیں اور ان کا پیدا کرنا اس کے
لیے کچھ مشکل نہیں تھا اسی طرح ان مخلوقات کا
اعادہ بھی اس کے لیے دشوار نہیں ہے۔ وہ ان
کے فنا ہو جانے کے بعد دوبارہ انہیں پیدا
کرے گا۔

یہی بات سورۂ روم آیت ۲۷ میں پوری صراحت کے ساتھ کہی ہے :۔

وھوالذی یبدؤ الخلق ثم یعیدہ وھو اھون علیہ — وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے آسان تر ہے۔ (سورۂ روم : ۲۷)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دو آیتوں سے کائنات کی طوح کا مطلب نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہے نہ لغت کے لحاظ سے نہ سیاق و سباق کے لحاظ سے اور نہ قرآن کے موضوع و مدعا کے لحاظ سے ۔

سورۂ حٰم السجدہ کی تین آیتیں

ان سے کہو کبھی تم نے سوچا کہ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا تو اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اس کی مخالفت میں بہت دور نکل گیا۔ (۵۲)

ہم کو ان کو نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اندر بھی ۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے اور کیا تیرے رب کا ہر بات کا شاہد ہونا کافی نہیں ہے (۵۳)

آگاہ ہو کہ یہ لوگ اپنے رب کے حضور پیشی کے بارے میں شک میں ہیں ۔ آگاہ کہ وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۔ (۵۴)

آیۃ ۵۲ کی تفسیر

یہاں مکذبین سے علیٰ سبیل التنزل ایک سوال فرمایا ۔ کہ اس طنطنے کے ساتھ جو قرآن کا انکار کر رہے ہو تو اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تب کہاں جاؤ گے؟ اس صورت میں ان لوگوں سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو ایسی ضد اور مخاصمت میں مبتلا ہو کر اپنی ہلاکت کی اس منزل کو پہنچ جاتیں جہاں سے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے ۔

یہ قرآن پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت ہے ۔

آیۃ ۵۳ - قرآن کی صداقت کے آثار آفاق و انفس میں

یہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور مکذبین قرآن کے لیے تہدید و تنبیہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ قرآن کو اس کے دلائل کی بنیاد پر ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ اس کی تصدیق کے لیے ہماری نشانیاں ہی دیکھنے پر مصر ہیں تو عنقریب وہ وقت بھی آرہا ہے جب مکہ کے اطراف میں بھی اور خود مکہ میں قریش کے اندر بھی اس کی

حقانیت کی ایسی نشانیاں ظاہر ہوں گی کہ یہ لوگ پکار اٹھیں گے کہ بے شک قرآن بالکل حق ہے ۔ آیات سے مراد غلبۂ حق اور ہزیمت باطل کے وہ آثار و شواہد ہیں جن کی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے ۔ یہ پیشین گوئی اس سورہ میں بھی پیچھے تاریخی دلائل کی روشنی میں گزر چکی ہے ۔ ابتداءً تو قریش کے لیڈروں نے ان باتوں کو تعلی پر محمول کر کے ان کا مذاق اڑایا لیکن جب مدینہ میں اور خود مکے کے اندر اور اس کے اطراف میں یہاں تک کہ خود قریش کے اچھے لوگوں کے اندر بھی اسلام جڑ پکڑنے لگا تب ان کو اور ان کے پشت پناہوں کو کچھ تنبہ ہوا ۔ بالآخر ہجرت کے بعد غلبۂ اسلام کے ایسے واقعات پیش آئے کہ قریش تو درکنار عرب و عجم کسی کے لیے بھی اسلام کے مقابلے میں ٹکنا ناممکن ہو گیا ۔ یہ مضمون سورۂ نمل کی آیت ۹۳ میں بھی ہے ۔ سیریکم آیاتہ فتعرفون (اور وہ اس کی نشانیاں تم کو دکھائے گا پس تم ان کو پہچان جاؤ گے)

آیت ۵۴

یہ آخر میں ان معاندین کی اصل علت فساد سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی اصل بیماری یہ ہے کہ یہ اپنے رب کے حضور پیشی کے باب میں مشتبہ ہیں ان کے اس اشتباہ نے انہیں زندگی کے معاملات میں ناعاقبت اندیش اور حق کی مخالفت میں دلیر بنا دیا ہے ۔ انہیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے کوئی چیز بھی اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں ہے وہ جو کچھ چاہے گا اور جب چاہے گا ، کر ڈالے گا نہ کوئی اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نکل سکتا ہے اور نہ کوئی اس کے کسی ارادے میں مزاحم ہو سکتا ۔

تدبر قرآن جلد ۶

تفہیم القرآن میں بھی آیت ۵۳ کی مفصل تشریح موجود ہے ۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ آفاق و انفس کی جن نشانیوں کا اس میں وعدہ کیا گیا ہے وہ قرآن کے کتاب برحق ہونے کے دلائل ہیں ۔

خاتمہ

امریکہ، روس اور یورپ کے سائنس دان تفتیش کائنات کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اس کا محرک ایک طرف انسان کی مادی زندگی کو آرام پہنچانے کے مخفی راز دریافت کرنا ہے اور دوسری طرف اس کے ذریعے دنیا بھر اور ہو سکے تو سیاروں اور ستاروں پر بھی اپنی فتح کے جھنڈے گاڑنا ہے ۔ جہاں تک انسان کو آرام پہنچانے کی کوشش کا تعلق ہے ۔ دنیا کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن خدا اور آخرت کو نظر انداز کر کے ان کا یہ کام، نہ ان کی آخرت کی زندگی کے لیے مفید ہے اور نہ بحیثیت مجموعی دنیا کو امن و اطمینان

سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ اس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم عرصۂ دراز سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اپنے زمانۂ عروج میں مسلمان اہل دانش نے سائنس میں کافی ترقی کی تھی لیکن وہ نہ ایمان باللہ سے بے نیاز ہوئے تھے اور نہ انھوں نے اخلاقی قدروں سے بغاوت کی تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان و اخلاق کے ساتھ بھی سائنس کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں۔

ہم ان تمام سائنس دانوں سے جن کا ذکر اوپر گذرا یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس رخ سے کائنات کا مطالعہ کریں جس کی رہنمائی قرآن نے کی ہے اور ایمان و اخلاق کی دولت بے بہا حاصل کر کے سائنس کارنامے انجام دیں۔ یہ چیز دنیا کے لیے بھی مفید ہوگی اور ان کی اخروی زندگی کے لیے بھی۔

ان اُرِیدُ اِلَّا الاِصلاحَ	میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں جہاں تک
ما استطعتُ وَمَا تَوفِیقِیْ	میرا بس چلے اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں
اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیهِ تَوَکَّلتُ	اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے
وَاِلَیهِ اُنِیبُ ؕ	اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور ہر معاملہ میں
(ہود: ۸۸)	میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں

نصیحت

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عم مکرم حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے فرزند ارجمند حضرت عبداللہ کو نصیحت فرماتے ہیں: ۔

پیارے بیٹے! امیر المومنین نے انصار و مہاجرین سب میں تمہیں خصوصیت بخشی ہے، اس لیے تین باتوں کا خیال رکھنا۔

(۱) تمہارے خلاف انھیں تمہارے کسی جھوٹ کا تجربہ نہ ہو۔

(۲) ان کی موجودگی میں کسی مسلمان کی غیبت نہ کرنا۔

(۳) ان کا کوئی راز افشا نہ کرنا

اُردو تعلیم کے ساتھ ستم ظریفی

(پروفیسر عمر حیات خاں غوری)

اس ملک میں اردو زبان کی یہ بھی بڑی بدنصیبی ہے کہ یہ اس ملک میں شمال سے جنوب تک اور مغرب سے مشرق تک بولی سمجھی اور لکھی پڑھی جاتی ہے مگر اس کا اعتراف کوئی نہیں کرتا۔ یہ زبان پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے مگر ملک بدر کی جارہی ہے۔ ہر شہر میں موجود ہے مگر کوئی اس کے وجود کا معترف نہیں ہے۔ ہر علاقہ میں موجود ہے مگر کوئی علاقہ اسے اپنا نہیں کہتا۔ ہندو کہتے ہیں یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان کہتے ہیں یہ ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی سب کی مشترکہ زبان ہے۔ مگر نہ مسلمان کہتا ہے کہ یہ زبان پہلے میری ہے پھر کسی دوسرے کی۔ نہ ہندو اس کو اپنا سمجھتا ہے اور نہ سکھ و عیسائی۔ ایسی یتیمی یسیری اور بے کسی سے شاید دنیا کی کسی زبان کو آج تک واسطہ نہ پڑا ہوگا۔

اردو کی یتیمی و یسیری کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو دنیا پر بزدلی مقہوری اور مرعوبیت چھا چکی ہے۔ یہ زبان بنیادی طور پر مسلمانوں کی زبان ہے لیکن اسی کے ساتھ بالعموم سارے ملک کی زبان بھی ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ اردو زبان جس چیز کا نام ہے یہ ملک میں مختلف بولیوں کے لین دین سے پیدا ہونے والی مشترکہ بولی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ مگر اس ملک میں مسلمانوں کے آنے کے بعد اس بولی کی تشکیل صورت اور ہیئت و آہنگ متعین کرنے میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی اور ان کی علمی زبان فارسی سے خصوصی مدد ملی اور مسلمانوں نے اس کے فروغ میں دل کھول کر حصہ لیا۔ فارسی زبان کو تو اس نوخیز بولی پر اتنا پیار آیا کہ اس نے اپنا لباس ہی اس کو دے دیا اور فارسی رسم الخط کے لباس میں یہ زبان پھلتی بڑھتی اور پروان چڑھتی رہی اور رعنائی و دلکشی میں اضافہ کرتی رہی۔ اس نے فارسی و عربی سے الفاظ بھی لیے۔ اصطلاحات

بھی حاصل کیں۔ ان کے محاورات کے ترجمے بھی کیے۔ خیال اور آہنگ بھی لیا۔ قواعد و ہیئت بھی حاصل کی نیز فکر و خیال بھی اسی کے خزانے سے حاصل کیے۔ اگر مسلمان اس ملک میں نہ آئے ہوتے تو ملک میں پیدا ہونے والی بولی کی آج کوئی بھی شکل ہوتی مگر موجودہ اردو بہرحال نہ ہوتی۔

مسلمانوں کے اس ملک میں آنے کے بعد ان کی تہذیب و تمدن، معاشرت و معیشت، افکار و نظریات، رسوم و رواج اور اخلاق و ثقافت کی اقدار نے گہرا اثر ڈال دیا تھا اور اردو زبان بھی چونکہ بازاروں سے لیکر درباروں اور گلی کوچوں سے لیکر ایوان و محلات تک رسائی حاصل کر چکی تھی اس لیے اس کے مزاج اور تہذیبی پس منظر پر بھی مسلمانوں کا گہرا اثر پڑا ہے۔

اردو زبان کی اصناف پر بھی مسلمانوں کی تہذیب کا گہرا اثر ہے۔ غزل جیسی صنف سخن عربی فارسی کے علاوہ دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں ہے۔ یہ خالص مسلم تہذیب کی نمائندہ صنف ہے۔ اردو غزل کا پورا ماحول مسلم معاشرے کا ماحول ہے۔ اول تو اردو غزل فارسی کی تقلید میں وجود میں آئی جو مسلم معاشرے کی نمائندگی کر رہی تھی۔ اس لیے اس میں فارسی غزل کی امتیازی خصوصیات آج بھی موجود ہیں۔ دوسرے مسلم معاشرے میں اختلاط مرد و زن ناپسندیدہ تسلیم کیا گیا ہے اور دونوں جنس کے افراد کو آزادی سے ملنے جلنے سے بچانے کی وجہ سے عنفوان شباب ہی سے لڑکی کو پردہ کا پابند کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ آزادی سے مردوں سے ملنے جلنے نہیں پاتی۔ بلکہ اگر کبھی اتفاق سے اس پر کسی کی نظر پڑ جائے تو پھر جلائے وہ اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں اور خصوصیت سے اردو غزل میں عشق کا اظہار ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ ایک بار اتفاق سے کسی عورت کی جھلک دیکھ لیتا ہے اور پوری زندگی دوسری جھلک دیکھنے کی آرزو میں گزرتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے اردو غزل میں ہجر و فراق کے مناظر پائے جاتے ہیں وصل کا کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ پھر چونکہ مسلم معاشرے میں عورت مرد کا آزادانہ عشق کردار کی پستی اور بداخلاقی تصور کیا جاتا ہے اس لیے اردو غزل کے شعراء نے کبھی محبوب کو مونث کے صیغہ میں استعمال نہیں کیا بلکہ اس کو مرد کے طور پر ہی باندھا جاتا ہے۔ اردو معاشرے کے اس اثر نے اردو غزل میں ایجاز و اختصار اور اشارات و کنایات کو بھی فروغ دیا ہے۔ یہ احتیاط یہاں تک برتی گئی ہے کہ محبوب کی محفل آرائی بیان کرتے وقت شعراء نے طوائفوں کی محفلوں کی عکاسی کی ہے تاکہ عشق کے جذبات کا اظہار ہو سکے مگر

معیار عشق بھی برقرار رہے۔ ساتھ ہی مسلم معاشرے نے عشق کی بھی دو قسمیں کر ڈالیں اور شاعری نے بھی انہیں اپنا لیا اور عشق حقیقی و عشق مجازی کی تقسیم ہو گئی۔ ایسے معاشرے میں عشق و عاشقی کی باتیں کھلے بندوں بیان نہیں کی جا سکتیں تھیں اس لیے اردو غزل میں ایمائیت اور رمز و معنویت پیدا کی گئی اور ہزار پردوں میں مستور کر کے اشاروں اشاروں میں بات کہنے کا رواج پڑ گیا۔ لکھنؤ کے عیش پرستانہ ماحول میں البتہ اردو غزل نے کچھ کھلنے کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ہندی شاعری کی تقلید میں کوشش کی گئی کہ عشقیہ جذبات کا اظہار عورت کی جانب سے اس کی اپنی زبان میں کر دیا جائے۔ اس کے لیے ریختی نام کی ایک صنف بھی ایجاد کی گئی مگر چونکہ وہ معاشرے کے عام مزاج اور مسلم تہذیب کی اخلاقی قدروں کے خلاف تھی اس لیے اسے قبولیت عام نصیب نہیں ہو سکی یہی وجہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی اردو غزل کو ہماری تہذیب کہتے ہیں اور ہماری تہذیب کو اردو غزل

رباعیات کو لیجیے زیادہ تر مضامین اسلامی تعلیمات یا تصوف سے متعلق ملیں گے۔ قصائد میں بھی زیادہ تر مسلم بادشاہوں کی شان میں کہے گئے ہیں یا بزرگان دین ائمہ اربعہ یا بزرگ صوفیا کی شان میں حمد اور نعت میں بھی مسلمانوں کی عقیدت کا اظہار ہی ملتا ہے۔ صنف مرثیہ بھی شہدائے کربلا کے لیے وضع کی گئی ہے۔ مضامین سرسید کو دیکھیے یا شبلی، حالی، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کو ہر جگہ مسلم تہذیب کے نقوش ابھرے ہوئے دکھتے ہیں اور اس زبان پر مسلم تہذیب کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔

اردو زبان و ادب کا یہی جرم ہے جس کی وجہ سے آزادی کے بعد سے مسلسل اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہندوستان کو عربی اور فارسی زبانوں کا ممنون ہونا چاہیے تھا کہ ان ترقی یافتہ زبانوں نے اپنے علمی خزانوں سے ہندوستان کی اسی بے مایہ زبان کو مالا مال کر کے عالمی حیثیت دلوا دی ورنہ آریوں کی علمی زبان سنسکرت نے تو "دیو بانی" بنکر سب کو محروم ہی کر دیا تھا مگر حالات کی ستم ظریفی کہ اب یہی اردو کا جرم بھی بن گیا۔ چنانچہ اکثریت تو اکثریت ہی ہے ملک کی مرکزی حکومت بھی اسی جرم کی وجہ سے اردو کو ہندوستانی تسلیم کرنے میں تکلف کرتی ہے

عجیب حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب اس کو مسلمانوں کی زبان کہا جاتا ہے تو مسلمان فوراً ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ نہیں نہیں حضور یہ ہماری تنہا زبان نہیں بلکہ ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی سب کی مشترکہ زبان ہے ہندو اسے اپنی زبان کہتا نہیں، مسلمان اپنی سمجھتا ہے مگر کہنے کی ہمت نہیں رکھتا، سکھ اور عیسائی کو اس سے

دلچسپی نہیں، پورے ملک کی یہ زبان نہیں (اس لیے کہ اس کی بہن نے اس کی مملکت پر شب خون مار دیا ہے) کوئی علاقہ اسے اپنی کہتا نہیں اور کسی فرقہ کا اس پر دعویٰ نہیں تو آخر اس زبان کو زندہ کیوں رہنا چاہیے زبانیں انسانوں کے لیے ذریعہ ابلاغ ہوتی ہیں اور جب یہ اپنے اس فرض کو ادا نہیں کرتیں تو ختم ہو جاتی ہیں مگر اسے ختم کیا جاتا ہے تو درد صرف مسلمان کے دل میں اٹھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنا کہنے کی ہمت نہیں کرتا۔

خدا جانے مسلمانوں نے ساری دنیا کو بے عقل اور احمق کیوں سمجھ لیا ہے کہ وہ اس کے ایسے بے اصل دعووں کو تسلیم کرلے گی۔ حالانکہ ان کا کام تھا کہ وہ جرأت سے کام لیتے اور اردو کی ان امتیازی خصوصیات کی موجودگی میں اعلان کردیتے کہ خواہ یہ کسی دوسرے ہندوستانی کی مادری زبان ہو یا نہ ہو۔ البتہ یہ ہماری مادری زبان ضرور ہے اور یہ کہ یہ پہلے ہماری زبان ہے اور بعد میں کسی دوسرے کی۔ اگر یہ کسی دوسرے کی زبان بھی ہے تو اس لیے ہے کہ یہ ہماری زبان ہے اور ہم نے خون جگر پلا پلا کر اس کو پالا ہے۔ دوسرے ابنائے وطن نے بھی اس کو اپنایا اور اس کی خدمت کی ہے۔ ہم اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور احسان بھی مانتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ ہماری تہذیب و ثقافت علم و ادب اور دین و مذہب کی امین ہے۔

اگر مسلمان اتنی جرأت سے کام لیتے تو ہوسکتا ہے کہ اقلیتوں کی زبان کی حفاظت کی جو یقین دہانی دستور ہند میں کرائی گئی ہے اس کا فائدہ اس زبان کو مل جاتا اور دنیا بھی یہ سمجھنے کے لیے مجبور ہوجاتی کہ یہ زبان جس قوم کی ہے وہ زندہ قوم ہے اور اخلاقی جرأت اور رسائی ہمت سے متصف ہے اور اس کے بعد کم از کم اردو کے مفادات کے تو وہ مستحق تسلیم کرلیے جاتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو دنیا پر خوف و دہشت، مصلحت اندیشی، مرعوبیت اور شکست خوردگی کے بادل گھرے ہوئے ہیں۔ وہ ملک کے فرقہ وارانہ فسادات سے خوف زدہ ہیں یا پھر اردو دنیا پر ایسے افراد چھاگئے ہیں جو اردو کے نام پر فائدہ تو اٹھانا چاہتے ہیں مگر اس کے لیے کچھ کرنا نہیں چاہتے اور اس لیے اس طرح چبا چبا کر بات کرنے ہی میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسی بزدل مصلحت اندیش اور مرعوب و شکست خوردہ قوم کا زبان وادب ہی نہیں بلکہ اس کی کوئی چیز بھی دنیا میں زندگی کا حق حاصل نہیں کرپاتی اور آہستہ آہستہ اس کی ہر چیز مٹتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کا وجود ہی ختم ہوجاتا ہے۔ دنیا کی متعدد قوموں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

اس مرعوبیت نے اردو دنیا میں عجیب عجیب گل کھلانا شروع کر دیا تھا جب ملک میں ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا تھا تو اس کی مقبولیت کو بڑھانا ضروری تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں اردو کا مسئلہ چل رہا تھا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ہندی کی مقبولیت کو بڑھانے کے لیے اردو کو دبایا جائے اور اس کو بدنام کر کے اس کے خلاف بددلی پیدا کی جائے چنانچہ اس زمانے میں اردو پر کئی الزامات لگائے گئے۔ جب کہا گیا کہ اردو پر فارسی و عربی کا بہت زیادہ اثر ہے تو ذہنی مرعوبیت کے ساتھ وہ اثر کم کرنے کی کوشش میں لگ گئے جب اعتراض ہوا کہ اس کی تہذیب ایرانی تہذیب ہے (کیونکہ مسلم تہذیب کہنے سے مذہبی جذبات بھڑک سکتے تھے اور پیش نظر یہ تھا کہ اس زبان کو اپنوں ہی کے ہاتھوں قتل کر دیا جائے) تو یہ فوراً وطنی نظموں کی دہائی دینے لگے۔ جب ہندی کا امتیاز ثابت کرنے کے لیے اردو املا کے مشکل ہونے کو بہانہ بنایا گیا تو یہ بڑی سعادت مندی سے فوراً اس میں اصلاح کرنے لگے۔ جب اعتراض کیا گیا کہ اردو کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے بلکہ عربی فارسی سے لے کر یہ زبان زندگی گزار رہی ہے تو فوراً اردو کے عربی الفاظ کا بھارتی کرن شروع کر دیا گیا۔ جب یار شاطر نے دیکھا کہ یہ تو بڑی خود غرض، خوشامدی اور مرعوب قوم ہے تو اردو کو قومی زبان کے دھارے میں بہانے کے لیے اس کے رسم الخط کو مشکل کہہ دیا گیا اور ہمدرد غمگسار بن کر اردو کے لیے بھی دیوناگری رسم الخط کی سفارش کر دی اور اردو دنیا میں اس کی گونج بھی سنائی دینے لگی اور کسی کو خیال نہیں آیا کہ جس زبان کا رسم الخط ہزاروں سال سے چلا آ رہا ہے اور کبھی مشکل تصور نہیں کیا گیا آخر آج ان لوگوں کو مشکل کیسے نظر آنے لگا جن کے دل میں نہ صرف یہ کہ اس زبان سے کوئی ہمدردی نہیں ہے بلکہ جو اس کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔

ذہنی مرعوبیت، شکست خوردگی، احساس کمتری اور ابن الوقتی و مفاد پرستی کی یہ وہ پستی ہے جہاں تک اردو دنیا گر چکی تھی۔ اخلاقی پستی کی انتہا احسان فراموشی اور محسن کشی ہے اور اردو دنیا کے بعض اکابر وہاں تک جانے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے اردو کے املا کی اصلاح کی چنداں کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اس کے کسی لفظ سے یہ معلوم نہ ہو سکے کہ اس زبان نے عربی و فارسی کے خزانوں سے بھی فیض حاصل کیا ہے اور اسی دولت نے اسے مالدار بنا رکھا ہے۔

ملک میں تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے بھی اردو کے ساتھ بڑی ستم ظریفی کی۔ جیسا کہ گذر چکا ہے

انگریزوں نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ضروری سمجھا کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات اور نفرت کی خلیج بڑھتی رہے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے اردو اور ہندی کو خوب خوب استعمال کیا۔ اس سلسلے میں پروفیسر مسیح الزماں رقمطراز ہیں۔

"مگر سرانٹونی میکڈانل کے گورنر ہونے کے بعد ۱۸۹۵ء میں اردو کی مخالفت شروع ہوگئی میکڈانل خود ہندی کے حامیوں میں سے تھا اس لیے وہ ان تمام لوگوں کے خلاف تھا جو اردو کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ نواب محسن الملک نے اردو کے سلسلے میں زبردست کوششیں کیں اور ایک انجمن بھی بنائی لیکن میکڈانل نے ان پر بہت سختی کی اور دہ کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کی مخالفت پر اتر آیا۔ لہٰذا مجبوراً محسن الملک کو اس میدان سے الگ ہونا پڑا۔" (جدید اردو تنقید۔ اصول و نظریات صفحہ ۱۳)

یہاں سے اردو ہندی کے باقاعدہ محاذ وجود میں آگئے اور انگریز ان کو ہوا دیتے رہے اس لسانی مخالفت کو اس وقت اور بڑھاوا ملا جب مسلم لیگ نے اردو کے حق میں اور کانگریس نے ہندی کے حق میں قراردادیں منظور کر ڈالیں۔ اس کے بعد لسانی محاذ سیاسی محاذ میں بدل کر رہ گیا۔ اردو دشمنی کے اس رجحان کو بڑھانے میں اس بات کو بھی کافی دخل ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد مسلم لیگ نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دے دیا۔ ابھی تک تو یہ سیاسی مخالفین کی زبان گردانی جا رہی تھی مگر اب ملک کے دشمنوں کی زبان بنا دی گئی اور اردو کا نام لینا پاکستان کی حمایت اور پاکستانیت بن کر رہ گیا حالانکہ اس میں اردو کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ پاکستان کی تہی دامنی کی علامت تھی۔ پاکستان کے پاس کوئی ایک زبان بھی ایسی نہیں تھی جسے وہ قومی زبان قرار دے سکتا۔ سندھ میں سندھی، پنجاب میں پنجابی، سرحد میں پشتو اور بنگال میں بنگلہ زبان کا سکہ چل رہا تھا۔ اس لیے پاکستان مجبور تھا کہ دہلی اور لکھنؤ میں پرورش پانے والی اردو کو قومی زبان کا درجہ دے کر ملک کے ان مختلف لسانی ٹکڑوں کو اردو کے سمنٹ سے جوڑ دے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی کہ اردو کی یہ مقبولیت اور اس کا اعجاز سیاسی عصبیت کی عینک نے اس کا جرم بنا دیا اور اردو کا یہ اتنا اہم اور سنگین جرم تسلیم کر لیا گیا کہ اس کے بعد اس پر کیے جانے والے ہر جرم کو جواز کا فتوی حاصل ہوگیا اور پھر ہر طرح اس امر کی کوشش شروع ہوگئی کہ کسی طرح اسے دیس نکالا ہی دے دیا جائے۔ مگر یہ اردو کی سخت جانی ہی ہے کہ

آج تک یہ زبان اپنی داخلی قوت اور عوامی مقبولیت کے بل بوتے پر زندہ ہے جس کا اعتراف مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات و نشریات نے حال ہی میں کیا ہے۔

"But Urdu has flourished in India not only because of official support. It has done so because of its own inherent beauty & popularity"

[Indian Muslim - Proud citizens of a secular country]

مگر اردو کا وہ جرم آج بھی ویسے کا ویسا ہی باقی ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر اردو کے اس جرم کا اعادہ کرتے رہتے ہیں بلکہ مرکزی حکومت کو بھی ابھی تک اس کا یہ جرم یاد ہے چنانچہ اس کتابچہ میں تحریر ہے۔

"Though officially declared the national language of Pakistan, Urdu in India continues to produce poets and writers of distinction among both Muslims and non-Muslims"

حالانکہ اگر غور کیجیے تو یہ ہندوستان کے لیے باعث افتخار ہے کہ وہ پاکستان جو نفرت کی بنیاد پر کٹ کر ملک سے علیحدہ ہو گیا ہے اتنا بے بس تھا کہ اگر ہم نے اس کو زبان نہ دی ہوتی تو اس کے پاس قومی زبان نام کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ضروری تھا کہ ہندوستان میں اردو کے فروغ کے لیے ایسا سازگار ماحول پیدا کیا جاتا کہ پاکستان ہمیشہ کے لیے اپنی قومی زبان کے بارے میں ہمارا محتاج رہتا۔ اس لیے کہ اردو ادب کی تاریخ میں لاہور کراچی یا راولپنڈی کبھی بھی اہل زبان کے علاقے میں تسلیم نہیں کیے گئے ہیں اور آج بھی پاکستان سند کے لیے دہلی اور لکھنؤ کا محتاج ہے جو خوش قسمتی سے ہندوستان ہی میں موجود ہیں۔ مگر اہل ملک کو یہ سب بتاتا کون؟ حکومت کی آنکھوں پر سیاسی دشمنی کی عینک چڑھی ہوئی تھی اکثریت مسلمانوں سے تقسیم کے انتقام میں مصروف تھی اور مسلمان اپنی جانیں بچانے میں لگے ہوئے تھے۔

ان ناگفتہ بہ طوفانی حالات میں جب جسم و جان کا رشتہ ہی معرض خطر میں پڑ گیا ہو، زبان و ادب کے مسائل کی طرف توجہ دینے کی سکت کس میں تھی۔ چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اردو کے تخت اقتدار پر

وہ گروہ مسلط ہوگیا جس کو نہ زبان وادب سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ملکی افتخار سے بلکہ جس کے سامنے اصل مقصد اردو کے نام سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا تھا اور اس بات کی کوشش کرنا تھا کہ اگر اردو زبان اپنی خود داری اور انانیت کی وجہ سے انگریزی اقتدار کی لونڈی نہ بن سکی تو کم از کم اس دور ابتلا میں بارگاہ مارکس کی جبہ سائی ہی کرنے لگے اور روسی نظریات پر ایمان لاکر غلامی کے معاہدہ پر دستخط ہی کردے۔ ظاہر ہے جن لوگوں کے سامنے یہ مقاصد ہوں ان سے کیسے امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ تحریک آزادی کے سلسلے میں اور ملک کی ذہنی وفکری تعمیر میں اردو کے کارناموں کو یاد دلاتے۔

کم از کم اردو دنیا کو اس جانب توجہ دینی چاہیے اور تحقیق کرکے بتانا چاہیے کہ ملک کی تعمیر میں اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں اردو نے کتنے اہم کارنامے انجام دیے ہیں ہندی، ہندوا اور ہندوستانی کے نام اسی نے رکھے ہیں اور وہی اجنبی بنائی جارہی ہے۔ انقلاب اور آزادی کے نعرے اس نے مرتب کیے ہیں اور اسی کا گلا کاٹا جارہا ہے اور آزادی سے محروم کیا جارہا ہے۔ اسی نے آزادی کی محفلوں کو گرمایا اور اسی کو زہریلے انجکشنوں سے ٹھنڈا کیا جارہا ہے۔ اسی نے آزادی کے متوالوں کے خون میں جوش پیدا کیا اور اسی کے خون کو منجمد کیا جارہا ہے۔ اسی نے ملک کو غلامی سے نجات دلائی اور اسی کے گلے میں طوق غلامی ڈال دیا گیا۔ مگر یہ سب اس لیے ہوا کہ اردو دنیا پر خوف بزدلی مرعوبیت اور احساس کمتری چھاتی چلی گئی۔ خود غرض لوگ اس کے خزانے کو لوٹتے رہے اور اردو نزع کی حالت میں تڑپتی رہی۔

اردو زبان پر اس ملک میں ایک ستم ظریفی یہ بھی ہوئی کہ اس کا رشتہ معاش سے بالکل کاٹ دیا گیا ایک طرف تو انگریزوں کے زمانے ہی سے منصوبہ بند طریقے سے مسلمانوں کو معاشی پستی میں ڈھکیلا جارہا تھا اس نئے فیصلے نے مسلمانوں میں اور بے توجہی پیدا ہونے لگی اور ملازمت کی امید میں لوگ ملک میں جاری دوسرے مضامین اور ہندی ذریعہ تعلیم کو منتخب کرنے لگے۔ مگر گھروں پر پھر بھی اس کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا مگر یہ اہتمام زیادہ کامیاب نہیں رہا اور مسلمانوں کی نئی نسل اردو سے بے بہرہ ہوتی چلی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر جن لوگوں نے اردو میں تعلیم حاصل کی تھی ان کی ملازمت کے دروازے بند ہونے لگے اس لیے کہ اسکولوں میں بچوں نے اردو لینا ہی کم کردیا تھا۔ پھر ملازمتوں میں ایسے لوگ رکھے جارہے تھے جن کو اردو سے دور کا واسطے کا بیر تھا جن کا فکر و ذہن مسلم دشمنی کے سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے بھی منصوبہ

طریقہ سے ہر سکول اور کالج سے مختلف بہانوں کے تحت اور خصوصیت سے ملازمت کا لالچ دے دے کر بچوں کو اردو چھوڑنے پر آمادہ کرتے رہے اور اس طرح اردو کی تعلیم کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ ادھر مسلمانوں کے متمول طبقہ پر عیش پرستی اور آرام طلبی چھا چکی تھی نیز حکومت کی خوشنودی بھی اس کے سامنے تھی اس لیے اس نے مالی تعاون دے کر اردو مدارس کے قیام کی کوشش نہیں کی۔

لیکن اتنی ساری قربانیوں اور ملازمت کے لالچ میں اپنی مادری زبان سے محروم رہنے کے باوجود مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں بھی محرومی ہی رہی اور پورے ملک میں سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب دو فی صد بھی نہیں ہو پایا۔ جہاں تک ملازمت کا تعلق ہے اس کا انحصار زبان پر نہیں بلکہ مسلمان ہونے سے ہے اس لیے مادری زبان کی قربانی دینے کے بعد بھی وہ ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ رہا قومی زبان کا معاملہ تو ایک مضمون کی حیثیت سے اس کی تعلیم بھی ہو سکتی تھی اور اس کی مدد سے سرکاری کام کاج بھی آسانی سے کیا جا سکتا تھا مگر اس کو ہوّا اس لیے بنایا گیا تاکہ ملک میں اردو کی مقبولیت کو متاثر کیا جا سکے اور اردو دنیا یہ سب تماشہ دیکھتی رہی۔

اس ملک میں اردو پر خود اردو دنیا نے بھی کم ظلم نہیں کیا ہے۔ ملک میں پہلی مردم شماری (آزادی کے بعد) ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی۔ مردم شماری کا کام عام طور سے اسکول کے اساتذہ سے لیا جاتا ہے۔ اس وقت تک اسکول کی ملازمت میں فرقہ پرست اساتذہ (جن کی تربیت یا تو آر ایس ایس کے ہاتھوں ہوئی تھی یا پھر ان کے ذہن ان سے متاثر تھے یا ملک کے فرقہ وارانہ فسادات نے انہیں متاثر کر رکھا تھا) کثرت سے داخل ہو چکے تھے خدا جانے انہیں حکام بالا نے احکامات دیئے تھے یا پھر ان کے ذہن کی کرشمہ سازی کہ اول تو مردم شماری کرتے وقت مسلمانوں کے محلے کے محلے نظر انداز کر دیئے گئے یا پھر مشترکہ خاندانوں میں سے صرف چند افراد کے نام تحریر کیے اور زبان کے خانے میں یا تو ہندی لکھ دیا یا پھر ہندوستانی جس کا مطلب بعد کو ہندی بنا لیا گیا۔ اس کے علاوہ ملک کے غیر مسلموں کی کثیر تعداد اردو بولتی ہے مگر انھوں نے جان بوجھ کر ہندی لکھوا دیا اور اس طرح ملک کے وہ علاقے بھی جس میں اردو بولنے والوں کی اکثریت تھی ہندی کے علاقے بنا دیے گئے۔ ورنہ اس ملک کے غیر مسلم بھی اپنی روزمرہ کی بول چال میں کنتو، پرنتو کے بجائے اگر مگر بولتے ہیں۔ مگر لسانی عصبیت نے اسے بھی ہندی کہلوا دیا۔ اس موقع پر اردو دنیا کو چاہیے تھا کہ وہ حرکت میں آتی اور مردم شماری کرنے والوں کی نگرانی کرتی کہ اردو بولنے والا کوئی گھر مردم شماری میں شامل ہونے سے نہ رہ جائے اور کسی

اردو بولنے والے شخص کی مادری زبان کو ہندوستانی یا ہندی نہ لکھا جائے۔ اگر وہ اس وقت حرکت میں آگئے ہوتے تو ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد اتنی کم نہ ہو پاتی جتنی کہ اس وقت بتائی جا رہی ہے۔ یہی غلط اور نامکمل اعداد و شمار ہیں جن کی وجہ سے حکومت ہند کو بھی ملک میں اردو بولنے والوں کی صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہے اور وہ اس غلط فہمی میں ملک کے شمالی اور جنوبی دونوں حصوں کے بارے میں اس کی رائے بڑی ناقص اور نامکمل ہے۔ جنوب کے بارے میں اس کی رائے ہے کہ

Muslims of Indian southern and eastern states, for instance, do not know Urdu: They speak the language of the regions to which they belong

حالانکہ صرف کرناٹک اسٹیٹ میں ہزاروں اردو میڈیم پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول موجود ہیں اور ریاست کی ساری یونیورسٹیوں اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس ریاست میں 34000 اردو اساتذہ گیسوئے اردو کی مشاطگی اور اس کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں۔ آندھرا پردیش میں بھی مسلمان اردو بولتے پڑھتے اور لکھتے ہیں تمل ناڈو میں بھی اردو تعلیم کا انتظام ہے اور مسلمان اس زبان کو سمجھتے اور بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ کیرالا تک میں اردو اسکول موجود ہیں۔ البتہ جنوب کے مسلمان کسی قسم کی لسانی عصبیت میں مبتلا نہیں ہیں اس لیے وہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کی زبان بھی سیکھتے اور پڑھتے ہیں خواہ وہ ان کی زبان پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

شمالی ہند کے بارے میں بھی حکومت اعداد و شمار کے فریب میں مبتلا ہے اس لیے کہ وہاں بھی مردم شماری کرتے وقت ہمارے اردو بولنے والوں کو ہندی والوں میں شمار کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو تھوڑی تعداد اردو بولنے والوں کی نظر آتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اس فریب سے واقف تھے۔ یہ اعداد و شمار کا یہی فریب ہے جس کی وجہ سے حکومت کی رائے ہے کہ:-

Urdu is the language of all communities - Muslims, Hindus and others - in certain regions of northern India where Mughal influence was most pervasive.

گویا کہ اردو زبان شمال میں بھی کہیں نہیں بولی جاتی سوائے ان چند علاقوں کے جہاں مغلوں کا زیادہ اثر رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اعداد و شمار میں دیانت کو ملحوظ نہ رکھنے کا۔ اعداد و شمار کے اس فریب کی ذمہ داری جہاں فرقہ پرست مسلم دشمن کارندوں کے رہ جاتی ہے وہیں ہندوستان کی اردو دنیا بالعموم اور مسلمان بالخصوص اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس سب کے باوجود آج تک خود اردو دنیا نے اپنے طور پر ملک کے اردو بولنے والوں کا سروے نہیں کرایا ہے تاکہ کم از کم جو لوگ اپنی زبان کو اردو کہتے ہیں ان کی اصلی تعداد سے تو حکومت کو آگاہ کر دیں۔

یہ ہیں ملک میں وہ حالات جو اردو زبان کو درپیش ہیں۔ دوسروں سے شکوہ شکایت کرنا بہت آسان کام ہے کسی نقصان کی ذمہ داری بھی دوسروں پر ڈالی جاسکتی ہے۔ یہ بھی آسان کام ہے مگر ملک کے ان حالات سے اردو دنیا کی مرعوبیت اور مصلحت اندیشی سے، اکثریت کی لسانی عداوت سے اور حکومت کی بے مہری سے اردو کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی تلافی تو نہیں ہوتی۔

اس لیے اردو دنیا کو چاہیے کہ وہ عزم و حوصلے کے ساتھ اٹھے اور اردو دنیا کو ایک قوت بنا کر دوسروں پہ اعتراض کرنے سے زیادہ خود اپنے وسائل کو علم و ادب کی خدمت میں لگا دے اور اردو دنیا میں لسانی غیرت بیدار کرکے حکومت کو باور کرا دے کہ اردو اب بھی زندوں کی زبان ہے جسے ملک بدر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اردو دنیا اس طرح بیدار نہ ہوسکی تو اس زبان پر جاری ان ستم ظریفیوں کا کوئی تدارک ممکن نہیں ہوسکے گا اور ملک میں اردو کا مستقبل تاریک تر ہوتا چلا جائے گا۔

نوٹ: اس مضمون کے انگریزی اقتباسات مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات و نشریات کے کتابچے Indian muslim proud citizens of a secular country سے لیے گئے ہیں۔

کارکنوں کی ہمہ جہتی تربیت کا فطری طریقہ

قرآن و سنّت اور حالات حاضرہ کی روشنی میں

(جناب اشرف علی صاحب (سیوہارہ ضلع بجنور)

دفتر حلقہ اترپردیش سے ہمارے پاس دو مضامین بھیجے گئے ہیں کہ ہیں ان کو ماہنامہ زندگی میں شائع کر دوں۔ مناسب معلوم ہوا کہ ارکان کے اجتماعات یا تربیتی اجتماعات میں جو مضامین پڑھے جاتے ہیں ان میں سے وہ مضامین جو امیر حلقہ کی طرف سے ہمارے پاس آئیں انہیں کچھ حذف و اضافے کے ساتھ شائع کر دیا جائے اس طرح رفقاء کے خیالات اور ان کی پیش کردہ تدابیر سے دوسرے رفقاء واقف ہوں گے اور مضامین لکھنے والوں کو آئندہ کچھ اور زیادہ بہتر انداز میں مضامین مرتب کرنے کی ترغیب حاصل ہوگی۔ اسی نقطۂ نظر سے اس شمارہ میں ایک مختصر مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارۂ زندگی)

کارکنوں کی تربیت کے سلسلے میں قرآن اور سنت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روشنی میں جب ہم دورِ نبوی کو دیکھتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ رسولِ خدا کس طرح اپنے اصحابؓ کی ہمہ جہتی تربیت فرماتے تھے اس مثالی دور میں اور اس کے بعد خلافت راشدہ کے دورِ مبارک میں کارکنوں کو کوئی مصنوعی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ قرآن حکیم اور سنت رسول کے ایک ایک حکم کا صحابۂ کرام کو حکمت کے ساتھ پابند بنایا جاتا تھا اس دورِ مبارک میں لوگوں پر احکامات جبراً تھوپے نہیں جاتے تھے بلکہ غیر محسوس طریقہ تعلیم سے پابندی احکام کی تربیت دی جاتی تھی مثلاً جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اب شراب نوشی پر پابندی عائد کی جائے تو سورۂ نساء کی وہ آیت نازل فرمائی گئی جس میں نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صحابہ کرام نے یہ آیت پاک سنی اور منشاءِ الٰہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے معلوم کیا اس کے مطابق عمل شروع ہو گیا۔ شراب نوشی کے اوقات بدل گئے احتیاط شروع ہو گئی کہ نشے کی حالت میں وقت نماز نہ آنے پائے۔ زیرک اور اونچی صلاحیتوں کے صحابہ کرامؓ نے سمجھ لیا کہ منشاءِ الٰہی شراب کو حرام قرار دینا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ آیت نازل ہوئی جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں مضرت اور نفع کے دونوں پہلو ہیں۔ مگر مضرت کا پہلو نفع سے کہیں زیادہ ہی ہے۔ اس آیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا گیا اور اس کے منشاء کو سمجھا گیا نتیجۃً یہ شراب نوشی میں اور زیادہ کمی واقع ہوئی۔ اب مسلمانوں کی نہایت قلیل تعداد کے سوا کوئی شراب نوشی کی طرف راغب نہ ہوتا تھا اس کے بعد سورۂ مائدہ میں وہ آخری حکم نازل ہوا جس میں شراب کو نجس اور حرام قرار دیا گیا ہے اس آیت کے نزول کے بعد شراب نوشی مسلم معاشرے میں کلیۃً بند ہو گئی یہ اسی حکیمانہ تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج ۱۴۰۰ سو سال گزر جانے کے بعد بھی۔ جبکہ امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور اس کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں ہے لیکن شراب کو ہر مسلمان ناجائز حرام اور نجس ہی سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت شراب نوشی سے اس طرح مجتنب ہے جس طرح شُربِ بول سے۔

اسی پر دوسرے احکامات کو بھی قیاس فرمائیے۔ دورِ نبوی میں مسلمانوں کی تربیت اس طرح ہوتی تھی اس طرح بتدریج لوگوں کے ذہنوں کو بدلا جاتا تھا۔

اس دورِ مبارک میں چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود تھے۔ آپ قرآن حکیم کا عملی نمونہ تھے۔ صحابہ کرام کو آپ سے مستفیض ہونے کا براہ راست موقع ملتا تھا محض نبی صلعم کو دیکھ کر اور آپ کی زبان مبارک سے سنکر آیات قرآنی کی تفسیر و تاویل معلوم ہو جاتی تھی۔ لہٰذا قرآن حکیم کے علاوہ اور کسی کتاب کی طرف رجوع کرنے کی حاجت نہ تھی۔

یہی صورت حال تقریباً خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی رہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت یافتہ اصحاب موجود تھے جو قرآن کی تفسیر و تاویل سنت رسول سے کرتے تھے اور اس پر اسی طرح عمل فرماتے تھے جس طرح انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عمل کرتے دیکھا تھا ان کی زندگیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ جہتی تربیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دور آتے ہیں ان میں بھی کم و بیش یہی صورت حال قائم

رہی مگر یہ ادوار فتنوں کے سر اٹھانے کے ادوار تھے اور ساتھ ہی فتوحات بھی ہو رہی تھیں۔ لوگ فوج در فوج دین اسلام قبول کر رہے تھے مگر ان کی تربیت کا باقاعدہ نظم نہیں تھا۔ دراصل تربیت کی ذمہ داری خلافت کی تھی مگر اب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی۔ اس وقت کے خلفاء کو اپنے ٹیکس سے سروکار تھا۔ امت کی ذہنی و اخلاقی تربیت کی ان کو کوئی فکر نہ تھی۔ اب یہ کام چھوٹے چھوٹے حلقوں میں علماء و صوفیہ نے سنبھال لیا تھا لوگ ان حلقوں سے متعلق ہو کر دین کی راہ معلوم کرتے تھے ابتداءً تو صوفیائے کرام کا طریق تعلیم وہی تھا جو خلافت راشدہ کے زمانے میں تھا مگر بعد میں عجمی اختلاط کے زیر اثر ان تربیت گاہوں میں غیر اسلامی افکار و تصورات نے جگہ پائی۔ "احسان" کی اصطلاح ختم ہوئی تصوف آیا۔ اصطلاح کی تبدیلی کے ساتھ ہی مفہوم بدلا۔ یونانیوں کا اشراق، ہمہ اوست کا فلسفہ، ہندوؤں کا یوگ، حبس دم، پاس انفاس، نفس کو شدائد میں مبتلا کرنا وغیرہ ــــ ان سب اعمال اور تصورات نے تصوف میں جگہ پا کر اسے بگاڑ ڈالا۔ دین اور دنیا کی تفریق بھی انہیں فلسفوں کی دین ہے۔ صوفیاء کا رہبانہ دنیا سے الگ جا بیٹھے اور دنیا کو اہل دنیا کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اس طرح ہماری تاریخ کے وسطی دور میں بتدریج اللہ ــ دین ــ ادب اور عبادت کے مفہوم محدود ہو گئے جس سے امت مسلمہ کی ذہنی و اخلاقی حالت بے حد متاثر ہوئی۔ دین اسلام جو کہ ایک ہی مکمل اور عند اللہ مقبول دین ہے اس کو مذہب اور رسم کے معنے میں لیا گیا۔ الٰہ کا ترجمہ صرف معبود سے کیا جانے لگا۔ رب پالنے والا اور عبادت کا مفہوم پوجا ہو گیا۔ وہ شخص متقی کہلایا جو پنج وقتہ نمازیں پڑھتا ہو اور خاص وضع کا کرتہ و پاجامہ پہنتا اور داڑھی مونچھ بھی خاص وضع کی رکھتا ہو چاہے اس کی زندگی کا بقیہ حصہ کتنا ہی اسلامی تعلیمات سے دور ہو لیکن اس کے متقی ہونے میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ یہ صورت حال آج تک قائم ہے۔

اب رہا وہ شخص جو اسلام کو مکمل دین سمجھ کر اس کے کل پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہو۔ ظاہر ہے اس کی زندگی کے مختلف زاویے کسی طرف جھکے ہوئے نہ ہوں گے ان میں ایک طرح کا اعتدال ہو گا لیکن ایسے شخص کو لوگ متقی نہیں سمجھتے۔

موجودہ حالات میں جبکہ ہم اب اوپر ایک ایسا نظام معیشت و حکومت مسلط ہے جس کو ہم نہایت ہی ہلکے الفاظ میں دیو استبداد کہہ سکتے ہیں اس نظام کی گوناگوں پیچیدگیوں کے باعث ہمارے کارکنوں کی تربیت کا سلسلہ نہایت سخت اور دشوار ہو جاتا ہے

اگر ہمیں تحریک اسلامی کو زندہ رکھنا ہے تو بہت جلد کارکنوں کی تربیت کا نظم سنبھالنا ہوگا اس سلسلہ میں چند امور کی نشان دہی ضروری ہے ۔

(۱) ہمارے کارکنان میں جو علماء اور جدید تعلیم یافتہ ہیں ان کو ہر چھ ماہ کے بعد مرکز یا دفتر حلقہ میں تربیت کے لیے طلب کیا جائے ۔

(۲) یہ تربیت یافتہ کارکنان جب اپنے مقام پر واپس آئیں تو اپنے متاثرین اور قریبی ارکان کو اسی طرز پر تربیت دیں جس طرز پر انھوں نے مرکز میں تربیت حاصل کی ہے

(۳) قرآن حکیم اور احادیث نبوی کا مطالعہ لازم قرار دیا جائے ۔

(۴) ارکان کو سمع و طاعت کا پابند بنایا جائے اگر وہ اس معاملہ میں نافرمانی کا مظاہرہ کریں تو صرف یہی بات ان کے اخراج کے لیے کافی ہو ۔

(۵) وقتی جدوجہد خصوصاً غیر مسلمین میں ہر رکن پر لازم قرار دی جائے کیونکہ تیراکی کی مشق خشکی میں نہیں ہوتی

(۶) ہفتہ وار اجتماعات کو زیادہ موثر بنایا جائے ۔ اجتماعی مطالعہ کو رواج دیا جائے ۔

(۷) ان پڑھ ارکان پر لازم ہو کہ وہ چھ ماہ کے اندر اندر الحسنات کے معیار کی کتابیں پڑھنے اور املا کی مشق بہم پہنچائیں ۔

مولانا محمد علی جوہر کی

تقریر کے چند اقتباسات

بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی ۳۰ - ۳۵ سال کی ہندستانی تاریخ کو سامنے رکھ کر اگر یہ دیکھا جائے کہ اس زمانے میں اعلیٰ درجہ کی جدید تعلیم سے آراستہ وہ کون سچا مسلمان لیڈر تھا جس کا جوشِ ایمانی اس وقت کے لیڈر (علماء) کے لیے بھی باعثِ رشک تھا تو صرف ایک نام سامنے آئے گا اور وہ مولانا محمد علی جوہر رام پوری کا ہوگا۔

میں جب بھی مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں کچھ پڑھتا ہوں تو اندر سے ایک جذبۂ عقیدت ابھرنے لگتا ہے۔ میں نے ان کی اس آخری تقریر کا ذکر تو بار بار سنا تھا جو انھوں نے اپنی وفات سے پہلے لندن میں کی تھی لیکن وہ تقریر سامنے نہیں آئی تھی۔ معاصر قومی آواز لکھنؤ ۵ جنوری ۱۹۸۳ء میں "مولانا محمد علی جوہر کی آخری یادگار تقریر" کے عنوان سے اس کا ایک حصہ شائع ہوا تھا۔ عنوان کے نیچے یہ نوٹ دیا گیا ہے:-

"ذیل میں اس اہم تقریر کے بیشتر اجزا نقل کیے جا رہے ہیں جو مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن کی گول میز کانفرنس میں کی تھی اور جس میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ اگر ان کو آزادی کا پروانہ نہ ملا تو وہ غلام ہندوستان واپس نہ جائیں گے۔ چنانچہ وہ واقعی ہندوستان واپس نہیں آئے۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں ان کا انتقال ہوا اور تدفین بیت المقدس میں ہوئی"

تنہا مقصد

مجھے امید ہے کہ اپنی علالت، امراض اور دوسرے علائق کے متعلق میری اس طولانی تمہید کو آپ معاف

کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج وہ مقصد جس کے لیے میں یہاں آیا ہوں یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو
کو اسی صورت میں واپس جاؤں گا جب اسی آزادی جس پر آزادی کا اطلاق ہو سکے میرے ہاتھ میں ہو
میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں بشرطیکہ وہ آزاد ملک ہو مرنے کو ترجیح دوں گا
اور اگر آپ ہم کو ہندوستان میں آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو یہاں مجھے ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی۔

درجۂ نو آبادیات

میں آپ سے ڈومینین اسٹیٹس مانگنے نہیں آیا ہوں۔ درجۂ نو آبادیات مجھے منظور نہیں ہے۔ میں سوائے مکمل آزادی کے کسی اور چیز کے لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ۱۹۲۷ء میں ایک تجویز کے ذریعے ہم نے اسی کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ مکمل آزادی کی تجویز مدراس میں منظور کی گئی تھی۔ ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ کو منظور کرنے کی تحریک پیش کی گئی تھی جس کی پہلی دفعہ درجۂ نو آبادیات کے متعلق تھی۔ میرے پرانے سکریٹری پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی جو آج کانگریس کے پریسیڈنٹ (صدر) ہیں۔ ان کے باپ نے اس تحریک سے اتفاق کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ فارسی میں ایک کہاوت ہے "سگ باش برادر خورد مباش" اور اگر آپ میرے حکیم شمیم بھائی کی طرف نظر کریں جو یہاں موجود ہیں اور جن کو "دو انچ دو فٹ" "سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا" کہا کرتے تھے تو آپ کو یقین آجائے گا کہ میں اس کہاوت سے اتفاق کرتا ہوں۔ جواہر لال نہرو کے متعلق میں کہوں گا کہ بلی ہونا بہتر ہے بجائے اس کے کہ اپنے باپ کا بیٹا ہو کیونکہ یہ غریب جواہر لال کے باپ ہی تھے جنھوں نے کانگریس پریسیڈنٹ کی حیثیت سے ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں ان کا گلا دبا کر ان کی زبان بند کر دی تھی۔ جب وہ مکمل آزادی مانگنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو میں نے ان کے بجائے کھڑے ہو کر ڈومینین اسٹیٹس (درجۂ نو آبادیات) کی دفعہ کی مخالفت کی لیکن ۱۹۲۸ء کے آخر میں میں بھی جواہر لال کی طرح مجبور ہو گیا کیونکہ اگر ایک دفعہ کل دن تک وہ عقیدہ طے ہو جائے تو پھر کانگریس میں کوئی ایسا شخص شریک نہیں ہو سکتا جو اس عقیدہ پر ایمان نہ رکھتا ہو اور ہر ممکن ذریعہ کے لیے درحالیکہ [illegible] رکھا گیا تھا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حیرانی جیسا کہ میں نے دوسری بات کہا تھا ہندوستان اس تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے کہ وہ دنیا کی حیرانی کا باعث ہوگا۔ ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک ایک ڈومینین کی تابعیں نہ ہو جائے لیکن اگر ہم کو اس کے بغیر ہندوستان جانا پڑا تو آپ یقین کیجیے کہ ہم ایک ایسی ڈومینین کو واپس جائیں گے

جو ہاتھ سے نکل چکی ہوگی۔ ہم ایک دوسرے امریکہ کو واپس جائیں گے۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ دولت مشترکہ برطانیہ یا برطانوی شہنشاہیت کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر ہندوستانی والیان ریاست، ڈاکٹر مونجے، مسٹر جیکر اور میرے بھائی نے مل کر ہندوستان میں متحدہ ریاست کی ایک آزاد حکومت قائم کرلی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ حکومت اس سے بھی زیادہ ہوگی جیسا کہ آکسفورڈ سے رخصت ہوتے وقت جس کو ایک مدت ہوئی میں نے لکھا تھا۔ ہندوستان میں ہمارے پاس امریکہ سے بہتر کوئی چیز ہوگی کیونکہ ہمارے پاس متحدہ ریاستیں ہی نہیں ہوں گی بلکہ متحدہ مذاہب بھی ہوں گے بقول شاعر

یکسانیت میں نہیں بلکہ اختلاف میں یک رنگی
ہر شخص اپنا اور دوسروں کا احترام کرنے والا
شخصی خصوصیت میں مختلف
لیکن محبت کرنے والوں کی طرح ایک دوسرے مانند

ان ارمانوں کو اپنے دلوں میں لیکر ہم یہاں آئے ہیں لیکن ہوگا کیا؟ اس کا انحصار ہمارے قدامت پسند دوستوں ہمارے انتہا پسند دوستوں، ہمارے مزدور پارٹی کے دوستوں اور سب سے بڑھ کر ایک خاص شخص پر ہے جس پر مجھے انگلستان میں سب سے زیادہ اعتماد ہے یعنی شہنشاہ جارج جو نیک دل و کٹوریہ کے پوتے ہیں جن کی ہندوستان کی محبت کی حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا اور جن کی تمام زندگی ہندوستان کے منشور آزادی سے عبارت ہے ان کی حکومت میں تاریخ پھر سے یوں لکھی جائے گی کہ جارج سوم نے امریکہ کھو دیا تھا لیکن جارج پنجم نے ہندوستان جیت لیا۔

جان دینے کا جذبہ ۱۹۱۰ء میں جب گاندھی جی جنوبی افریقہ میں اپنی تحریک چلا رہے تھے مسٹر جی کے بہادٹن نے ایک جلسے کی صدارت کی تھی اور مجھے تقریر کرنے کی دعوت دی تھی مجھ سے پہلے دوسرے مقرر گاندھی جی کے فلسفہ پر روشنی ڈال چکے تھے۔ میں نے کہا کہ اس کے متعلق ایک بات ذہن نشین کر لیجیے۔ یہ فلسفہ گاندھی جی کا ہو یا ٹالسٹائے کا یا حضرت عیسٰے کا یا مہاتما بدھ کا یہ ایک عالمگیر انسانی فلسفہ ہے جنگ میں فتح کسی کو ہلاک کرنے کی خواہش سے حاصل نہیں ہوتی ہم ہندوستانیوں کے پاس کو ہلاک کرنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جس وقت ہمارے اندر جان دینے کا جذبہ پیدا ہو گیا تو ہماری کثیر تعداد ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ ۳۲ کروڑ انسان ہلاک نہیں کیے جا سکتے۔ اتنوں کو ہلاک کرنے کے لیے حربے بھی مل سکیں تو ان کے لیے آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے ایک

آزاد اور متحدہ ہندوستان کی تشکیل کے لیے ہم کو سرفروشی کے جذبے کی ضرورت ہے اور یہ جذبہ بہت تیزی سے پیدا ہو رہا ہے جس وقت یہ جذبہ پورے طور سے پیدا ہو جائے گا اس وقت آپ کیا کریں گے؟

ہندو مسلم مسئلہ

اصل میں جو مسئلہ برابر ہمارے لیے پریشان کن رہا ہے وہ ہندو مسلمانوں کا مسئلہ ہے لیکن میرے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ فوجی مسئلے کی طرح آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ البتہ اس کی کل ذمہ داری آپ پر نہیں ہے جس طرح ہندو اور مسلمان آج لڑ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برطانوی تسلط کو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ برطانوی اقتدار کا خاتمہ یقینی ہے —

اب میں مسلمانوں کے متعلق ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں جس کے بارے میں کسی دوسرے وقت تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ انگلستان میں اکثر احباب مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ یہ ہندو مسلم سوال سیاست میں کیوں اٹھتا ہے اور اس کا ان چیزوں سے کیا واسطہ ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ آپ کا تخیل مذہب کے متعلق غلط ہوگا اگر سیاست کو اس سے باہر رکھا جائے۔ مذہب میرے خیال میں نہ کسی عقیدہ کا نام ہے اور نہ کسی طریقہ عبادت کا، مذہب زندگی کی ایک تعبیر ہے۔ میرے پاس ایک تمدن ہے، ایک سیاسی نظام ہے، ایک نظریہ زندگی ہے اور اسلام ان سب کا امتزاج ہے۔ جہاں تک احکام خداوندی کے بجا لانے کا تعلق ہے میں اول بھی مسلمان ہوں، دوم بھی مسلمان ہوں اور آخر میں بھی مسلمان ہوں یعنی میں مسلمان ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی سلطنت یا قوم میں اس سیاسی نظام، اس تمدن، اس ضابطۂ اخلاق اور اس امتزاج کو چھوڑ کر شامل ہو جاؤں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میرا پہلا فرض اپنے خالق کی رضا جوئی ہے نہ کہ سلطان لیکن جہاں ہندوستان کا سوال آتا ہے جہاں ہندوستان کی آزادی کا سوال آتا ہے یا جہاں ہندوستان کی فلاح و بہبود کا سوال آتا ہے میں اول بھی ہندوستانی ہوں اور آخر میں بھی ہندوستانی ہوں اور ہندوستانی ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔

دو برابر کے دائرے

میں دو برابر کے دائروں سے تعلق رکھتا ہوں جو ہم مرکز نہیں ہیں۔ ایک ہندوستان ہے اور دوسرا دنیائے اسلام ہے۔ جب میں تحریک خلافت کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں انگلستان آیا تو میں

دوستوں نے کہا تھا کہ ہماری اسٹیشنری کے لیے کوئی طغرا ہونا چاہیے۔ میں نے یہ طغرا دو دائروں کی شکل میں بنایا ایک دائرے میں لفظ ہندوستان لکھا اور دوسرے میں لفظ خلافت کے ساتھ اسلام۔ ہم بحیثیت ہندوستانی مسلمان کے دونوں دائروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر دائرہ میں ۳۰ کروڑ انسان ہیں ان دائروں میں سے ہم کسی کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ہم قوم پرست نہیں ہیں۔ ہمارا رتبہ اس سے بھی بلند ہے اور بحیثیت مسلمان کے میرا عقیدہ ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور شیطان نے قوم پرستی کو۔ قوم پرستی تفریق پیدا کرتی ہے اور ہمارا مذہب اتحاد کا داعی ہے۔ کوئی مذہبی یا صلیبی جنگ اس قدر ہلاکت خیز نہیں ہوئی ہے جتنی کہ آپ کی گزشتہ جنگ اور یہ آپ کی قوم پرستی کی جنگ تھی نہ کہ میرا جہاد

برطانیہ کا ایک اور گناہ

ہندوستان کو بے دست و پا بنا دینے کے علاوہ ایک اور گناہ برطانیہ کا یہ بھی ہے کہ اس نے ہندوستان کی غلط تاریخ مرتب کی اور اس کو ہمارے اسکولوں میں رائج کیا اور اسکی وجہ سے ہمارے بچوں نے ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ پڑھی۔ جو جھگڑے اکثر ہم کو سڑکوں پر تیوہاروں کے موقع پر نظر آتے ہیں اور جن تنازعوں کے محرکات ہمارے دانشوروں (میں ان کو غیر دانشور کہوں گا) کے دل میں بٹھا دیے گئے ہیں سب اسی غلط تاریخ کا نتیجہ ہیں جو سیاسی اغراض سے ہمارے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اگر وہ انتقامی ذہنیت جو ہندوستان میں چند لوگوں کی سیاست میں واقعی موجود ہوتی اور اس حد تک موجود ہوتی جتنی کہ آج ہے اور مسلمان ہر جگہ ۲۵ فی صدی کی اقلیت میں اور ہندو ۷۶ فیصدی کی اکثریت میں ہوتے تو مجھے امید کی کوئی کرن آج نظر نہ آتی مگر صوفیوں اور سپاہیوں کا بھلا ہو کہ ان کی وجہ سے ایسے صوبے بھی ہیں جیسے کہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے کا صوبہ جس میں ہم چار فیصدی ہیں اور ایسے بھی جیسے میرے دوست نواب سر عبدالقیوم کا صوبہ جس میں ۹۳ فیصدی ہیں اور جس کے لیے ہم اس آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ سندھ کا پرانا صوبہ بھی ہے جہاں مسلمان پہلے پہل آئے اور جہاں وہ ۷۰ فیصدی ہیں۔ پنجاب میں ان کی تعداد ۵۶ فیصدی ہے اور بنگال میں ۵۵ فیصد۔ اس سے ہم کو تحفظ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ہم کو وہی ضمانت مل جاتی ہے جو ہندوؤں کو ان صوبوں میں حاصل ہے جن میں وہ بڑی اکثریت میں ہیں۔

آخری بات

میں نے ضرور اپنی تقریر سے آپ صاحبان کو پریشان کیا ہو گا مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قدر لمبی تقریر کرتے ہوئے میں خود بھی تھک گیا ہوں۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جناب صدر (باقی صفحہ ۵ پر)

ابن خطیب کی وصیتوں کے چند اقتباسات

لسان الدین بن محمد بن عبداللہ بن سعید ذہنیلے ادب میں ابن خطیب کے نام سے مشہور ہیں۔ ۱۳۱۳ء میں غرناطہ میں پیدا ہوئے۔ حکومت کے سکریٹری کے عہدے پر، پھر وزارت کے عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے اپنے صاحبزادوں کے نام اعلیٰ ادبی زبان میں طویل مؤثر اور دل نشین وصیتیں قلمبند کی تھیں ان کے کچھ اجزاء یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

"بچو! ..... میں نے زندگی میں جتنے انسان دیکھے خواہ وہ پتے چھانٹنے والے ہوں یا لیسنہ پہلے نکیل تھامنے والے یا دودھ چھوڑنے والے، یا بحری سفر کرنے والے ان کا جو مقصود بھی رہا شریعت کے قدم اس سے آگے رہے۔ لہٰذا! اس کی شاہراہ اختیار کرو۔ اصحاب شریعت کا فیض حاصل کرو۔ اس کے ان چراغوں سے روشنی حاصل کرو جو کبھی گُل نہیں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۔	جو دین اسلام کے سوا چاہے گا اس کا یہ راستہ قبول نہ ہوگا ۔

شریعت الٰہی کا مقام بلند اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہے۔ لہٰذا یہ دنیا تمہیں دین سے دستبردار نہ کردے۔ راہبوں کی طرح دین کی راہ میں اپنی ہستیاں قربان کردو۔ کیونکہ جہنم میں ہمیشہ جلے جانے کے بعد اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے اور نہ ہی فیروزمند ہو جانے کے بعد کوئی کم گشتگی نقصان پہنچا سکے گی۔ اولاد والدین سے وراثت میں جو کچھ پاتے ہیں۔ ان میں بیش ترین دین متاع دنیوی ہے۔ اے اللہ میں نے اصل حقیقت واضح کردی ہے تو گواہ رہنا۔ لہٰذا ان تباہیوں سے بچو جو دائمی شقاوت کی موجب ہیں۔ یہ تباہیاں آئیں گی تو چہرے اور کھالیں جھلس جائیں گی۔ اللہ کی ناراضگی سے اس کی رضا کی پناہ میں آؤ.......

زائل ہونے والے سامانِ زندگی کے مردار سے الفت نہ کرو۔ جو میسر ہو اس پر قناعت کرو۔ ما فات پر افسوس نہ کرو عقیدہ ایمانی کو مضبوطی سے تھامو۔ شک و شبہہ کو اس کے قریب نہ آنے دو۔ اس کے اندر کچھ خلل آ

تو پھر اسے کوئی تدبیر رفو نہ کر سکے گی۔ جبکہ ایمانیات میں یہ عقیدہ بمنزلہ سر ہے۔ سر ہی نہ رہے تو پھر جسم کیونکر باقی رہے گا۔

کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑو، اسے یاد کرو اور اس کی تلاوت رکھو۔ اس کی آیات اور مفاہیم پر غور کرو۔ اوامر و نواہی پر عمل کرو۔ جس ذات گرامی کے قلب پر اسے نازل کیا گیا ہے اس کی محبت سے اپنے دلوں کو سرشار رکھو۔ اللہ کے احکام و حدود کا اسی طرح احترام کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ان بنیادوں کی حفاظت کرو جن پہ اسلام کی تعمیر ہوئی ہے۔

نماز کی پابندی کرو۔ یہ وقار کا ذریعہ اور ملت کا خاصہ ہے۔ عبادت کی بنیاد ہے۔ بے حیائی اور بدی سے روکتی ہے۔ سینوں کو ذکر سے معمور رکھنے اور ہمارے شکر کو اللہ کا تحفہ پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ ہمسایوں سے عمدہ سلوک کا ضامن ہے۔ تاجروں سے سمجھوتہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ طبیعت کو میل کچیل سے صاف رکھنے کا صابون ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے چشمے سے دوسری بھلائیاں ابلتی ہیں۔ جسمانی ورزشوں کو اس پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اس کی ادائگی کے بعد دوسرے کام مکمل ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ یہ اس ذات کا حق ہے جو غیر فانی ہے۔ پھر فانی کے حق سے اس کی کیا نسبت۔ لہٰذا نماز ادا کرتے وقت اس کی شکلوں میں استحکام پیدا کرو۔ اس کے بعد نوافل کا حتی الامکان اہتمام کرو۔

طہارت نماز کی ادائیگی کے لیے ایک سبب اور شرط ہے۔ اس کی تکمیل کرو۔ اعضاء اچھی طرح دھوؤ۔ چہرے اور ہاتھوں کو اچھی طرح صاف کرو۔ نیتوں سے غافل نہ رہنا۔

زکوٰۃ نماز کی پیاری بہن ہے۔ دنیا کے عوض حصول سعادت کی کلید ہے۔ اللہ نے جو دولت دی ہے اس میں بخل سے شرم کرو۔ شیطان آڑے آئے تو اس کی مخالفت کرو۔ اپنے مال کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرو۔ اس مال کا کچھ حصہ دے کر اس کی رضا کو غنیمت جانو۔

رمضان کے روزے قربت الٰہی کا کیا ہی عمدہ ذریعہ ہیں۔ اعضاء اور جوارح کو گناہوں سے روکو۔ نمازیں پڑھو۔ بیداری کو خوابوں پر ترجیح دو۔ اور ہو سکے تو اعتکاف کرو۔ اس سے چہروں میں حسن اور طبیعت میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ قساوت اور سنگدلی کا ازالہ ہوتا ہے۔ وسائل زندگی کا میدان وسیع ہوتا ہے۔

مقدرت کی صورت میں حج ایک فرض رکن ہے۔ حضور کے مطابق اس کا بدلہ جنت کے سوا اور کچھ نہیں۔ طاقت ہو تو اسی کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ بھی ہے۔ اگر جہاد میں جانے کی طاقت نہ ہو تو مجاہدین کی مدد کرو۔

یہ ہیں اسلام کے ارکان و فرائض ـــــ ان کی حفاظت کرو۔ زندگی پاکیزہ، صاف ستھری اور اعلیٰ رتبہ کی گذرے گی۔ دشمنوں پر غلبہ ہوگا۔ دیکھنا خبردار! اللہ کے حقوق ضائع نہ کرنا۔ ورنہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ تم بھی ہلاک ہوجاؤ گے۔

یاد رہے کہ علم اعلیٰ مطالب کے حصول کا ایک وسیلہ ہے اسے شرفاء اختیار کرتے ہیں۔ علم کی شرط خشیت الٰہی ہے۔ یہ آخرت کی سبیل سعادت اور دنیا میں عطا و بخشش کا راستہ ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جس کا کم شفا بخش اور زیادہ نفع بخش ہے۔ اس پر کوئی غاصب قبضہ کر سکتا ہے نہ اسے کوئی دشمن چھین سکتا ہے۔ جو اسے حاصل نہ کرے وہ ذلیل ہے۔ خواہ اس کی امیدیں کتنی کثیر نہ ہوں۔ فقیر ہے خواہ اس کے پاس مال و دولت کا خزانہ کیوں نہ ہو۔

سب سے عمدہ شریعت کے علوم ہیں۔ اس کے پہلو میں زبان کے علوم آتے ہیں۔ جو وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتے ہیں ـــ موقع ملے تو احادیث حفظ کرو۔ پھر فرصت ملے تو اصول فقہ سیکھنا چاہیے اس سے کتاب و سنت کے خزینے ملتے ہیں۔ اس کے بعد جلیل القدر علماء کے جو مسائل منقول ہیں انہیں معلوم کرنا چاہیے اور صحیح دلائل سے بتدریج غور و فکر کی عادت ڈالنی چاہیے۔ دیکھنا علوم قدیمہ کو ہاتھ نہ لگانا۔ اکثر ان میں وہ ہیں جو شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ دنیا میں ان سے ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

نرم انداز میں معروف کا حکم دو اور اعتدال کے ساتھ منکر باتوں کی روک تھام کرو۔ جو لوگ خواب سے بیدار ہوں ان سے تمسک کرو۔ اللہ نے جنہیں تمہارے معاملات کا ولی بنا دیا ہو ان کی اطاعت کرو۔ فتنہ کی چنگاری ہاتھ میں نہ لینا۔ سچائی کا شیوہ اختیار کرنا۔ یہی مومنوں کا شعار ہے۔ کذب بیانی سے دور رہنا۔ یہ وہ عیب ہے جو چھپائے چھپ نہیں سکتا۔ کاذب کی سزا کم سے کم یہ ہے کہ سچ بولے تو اسے سچا نہ سمجھا جائے حق بات کہے تو اس پر اعتماد نہ کیا جائے۔

امانت داری کو عزیز رکھنا۔ خیانت، دیانت داری کی پیشانی کا داغ ہے۔ جو عہد کرو اسے پورا کرو۔ اس عہد کی بابت اللہ کے یہاں بازپرس ہوگی۔ ناپ تول میں کمی نہ کرنا۔ خوں ریزی سے خبردار! اس کی جانب اشارہ یا بات نہ کرنا۔ نہ ضبط تحریر میں لانا۔ اپنی زبان اور ہاتھ کو جو آدمی خون ناحق سے پاک رکھتا ہے اسے بے حد کشادگی نصیب ہوتی ہے۔

شراب سب سے بڑا گناہ اور اکثر جرائم کا سرچشمہ ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی دانشوروں نے

اسے چھوڑ رکھا تھا۔

سود کے قریب نہ جانا۔ ناحق طور پر کسی کا مال نہ کھانا۔ رزقِ حلال کی تلاش میں رہنا۔ ظلم سے دور رہنا۔ چغل خوری نہ کرنا۔ حسد نہ کرنا۔ غیبت سے اجتناب کرنا، بخل نہ کرنا۔ آتے جاتے جہاں دیکھنا لوگوں کو سلام کرنا۔ صدقہ خیرات کا طریقہ رکھنا۔ دسترخوان بچھانا تو غریبوں کو یاد رکھنا۔ ہمسایوں کے حقوق ادا کرنا۔ قماربازی سے دور رہنا۔ رشوتوں سے اجتناب کرنا۔ قسمیں پوری کرنا۔

واضح رہے تیر و تم دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں۔ اذیتوں کا صبر سے مقابلہ کرنا۔ ظالموں کی باتوں کا جواب نہ دینا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔ مصیبتوں میں اللہ سے دعا کرنا۔ نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنا۔ ان میں مسکینوں کو بھی شریک کرنا۔

بھائی چارگی کے تحت بھائیوں کے ساتھ جو کچھ کر سکو ضرور کرنا۔ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بنکر رہنا۔ اس طرح دشمن نابود اور دوست زیادہ ہوں گے۔ واضح رہے کہ احسان جتلانے سے نیکی مکدر ہو جاتی ہے۔ عورتوں کی باتیں مانیں گے تو بھائیوں میں اس سے زیادہ فساد پیدا کرنے والی اور کوئی بات نہ ہوگی۔ کوئی نیکی کرنا تو اس کا ذکر نہ کرنا۔ کوئی بری بات سامنے آئے تو اسے پوشیدہ رکھنا۔ عورتیں جس بات کو اہمیت دیں اسے معمولی خیال کرنا۔ دیکھو! جو بھلائی میں نے تمہارے ساتھ کی ہے اس کے تم مقروض ہو۔ لہٰذا مجھ سے جو محبت کرتے ہیں ان کے ساتھ احسان کرنا۔

دنیاداروں کی صحبت سے حتی الامکان دور رہنا۔ مصیبتوں میں تحمل سے کام لینا۔ راز فاش نہ کرنا۔ دو باتیں سامنے آجائیں تو ان میں اقرب الی الحق جو ہو اسے اختیار کرنا۔ عہدوں کے طالب نہ ہونا۔ اس سے مروت کا خاتمہ ہوتا ہے اور رسوائیاں ہاتھ آتی ہیں۔ اگر کوئی اپنی پسند سے یا مجبور ہو کر قبول کر لینا تو اس کے باب میں عائد ہونے والے فرائض کی ادائیگی کے لیے سینہ کھول دینا۔ یہ عہدے فتنہ اور آزمائش کے مقامات ہوتے ہیں۔ ان سے عبادتوں میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ سعادتیں دور ہو جاتی ہیں۔ قدم پھسلتے ہیں اور ندامتیں ہاتھ آتی ہیں۔

یہ میری نصیحتیں ہیں۔ انہیں قبول کرو۔ جتنا ان پر عمل کروگے۔ دنیا اور آخرت کی سعادتیں قدم چومیں گی۔ جتنا دور رہوگے پشیمانی اور نقصان اٹھاؤگے۔ اگر ان کی طوالت سے گھبراہٹ پیدا ہو تو مختصراً یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ ان تمام وصیتوں کا شیرازہ ہے۔ اللہ ہر حال میں تم پر میرا جانشین ہے۔ والسلام علیکم

تمہارا باپ۔ محمد بن عبداللہ بن الخطیب

رسائل و مسائل

کیا مکان کا کرایہ سود ہے

سوال

یوپی کے ایک اردو ہفتہ وار میں جس کا مزاج دینی ہے ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں مکانات، کرایہ پر چلانے کے کاروبار کو سودی کاروبار کہا گیا ہے اور کرایہ مکان کو سود قرار دیا گیا ہے اور دلیل صرف یہ دی گئی ہے کہ کرایہ مکان کی صورت میں مالک مکان کو جو رقم ملتی ہے اس میں اس کو نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اپنے سرمایہ کا معاوضہ حاصل کرتا ہے۔ مہربانی کرکے بتائیں کہ کیا کرایہ مکان کا کاروبار سودی کاروبار ہے اور کیا مکان کا کرایہ سود ہے؟

جواب

کرایہ پر مکانات دینے کے کاروبار کو سودی کاروبار قرار دینا اور کرایہ مکان کو سود سے تشبیہ دینا بالکل غلط ہے۔ یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو مسائل شرعیہ اور فقہ سے بالکل ناواقف ہو۔ دینی مزاج کے ہفتہ وار میں یا تو پڑھے بغیر یا مسائل سے ناواقفیت کی بنا پر شائع کیا گیا ہوگا۔ ہمارے نزدیک دینی مسائل میں اصل ماخذ عقل نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت ہے۔

پہلے یہ بات سامنے رکھیے کہ کرایہ پر مکان دینے کا تعلق تجارت یعنی خرید و فروخت سے نہیں ہے بلکہ اجارے سے ہے اور شرعی اصطلاح میں "اجارہ" تجارت نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کا معاملہ ہے۔ راقم نے اپنی کتاب "عشر و زکوٰۃ اور سود کے چند مسائل" میں کرایہ مکان ہی کے ایک مسئلے کے ذیل میں لکھا ہے:۔

" اجارہ اور تجارت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تجارت میں اشیاء کا لین دین ہوتا ہے خریدار

اس چیز کا مالک ہو جاتا ہے جسے اس نے خریدا اور بائع اس چیز یا اس رقم کا مالک ہو جاتا ہے جس کے عوض اس نے اپنی کوئی چیز بیچی اور اجارے میں کرایے پر کوئی شے حاصل کرنے والا اس شے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف وہ منفعت حاصل کرتا ہے جس کے لیے اس نے اجرت دی ہے وہ شے جوں کی توں آجر (کرایہ پر کوئی چیز دینے والا) کی ملکیت میں رہتی ہے " (صلاۃ طبع ۱)

دوسری طرف سودی کاروبار کا تعلق اصلاً قرض کے لین دین اور تجارت یعنی خرید و فروخت سے ہے۔ اس فرق سے معلوم ہوا کہ کرایہ کے معاملے کو سودی کاروبار کہنا غلط ہے۔

اجارے کا ثبوت قرآن کریم میں بھی ہے اور احادیث نبوی میں بھی ـــ حضرت موسیٰؑ مصر سے نکل کر مدین پہنچے تھے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح کیا اور دس برس کے بعد پھر مصر واپس آئے تھے۔ میں صرف وہ آیتیں یہاں لکھتا ہوں جس میں اجارے کا ذکر ہے۔

(۱) قَالَتْ إِحْدٰهُمَا يٰٓأَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ (القصص ۲۶)	ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان! اس شخص کو ملازم رکھ لیجیے بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔

"استیجار" کے معنی کسی شخص یا کسی چیز کو اجرت پر حاصل کرنا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی کسی ایک صاحبزادی نے اپنے والد سے درخواست کی کہ وہ حضرت موسیٰ کو اپنا اجیر (ملازم یا مزدور) بنا لیں۔

قَالَ إِنِّيْٓ أُرِيْدُ أَنْ أُنْكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هٰتَيْنِ عَلٰٓى أَنْ تَأْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ (القصص ۲۷)	ان کے والد نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے یہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ شرط منظور کی اور پھر نکاح ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے دس سال تک اجرت پر کام کیا۔ اس کے بعد اپنے اہل و عیال کے ساتھ مصر کی طرف روانہ ہوئے۔

ان آیتوں میں اجارے پر کسی شخص کی خدمات حاصل کرنے کا صریح ثبوت موجود ہے۔

(۳) حضرت خضر نے جب اس بستی میں جس کے باشندوں نے حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام سے حد غیر شریفانہ رویہ اختیار کیا تھا، ایک گرتی ہوئی دیوار کو درست کر دیا تو حضرت موسےٰ نے فرمایا:۔

لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا ۝ (الکھف) — اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ مزدوری بھی ٹھہرا لیتے۔

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ جائز کام کرکے اجرت حاصل کرنا صحیح ہے

احادیث نبوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود نبی آخر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس بکریاں چرا کر اس کی اجرت لی ہے اور دوسرے کو ان کی خدمت پر اجرت عطا بھی فرمائی ہے ۔

(۱) عن ابی هريرة رضؓ عن النبی صلے الله عليه وسلم قال ما بعث الله نبيا الا رعى الغنم فقال الصحابه وانت يا رسول الله قال كنت ارعى علے قراريط لاهل مكة (تفسیر مظہری ج ۹ بحوالہ بخاری)	ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں کیا الا یہ کہ انھوں نے بکریاں چرائی ہیں صحابہؓ نے پوچھا اور آپ نے بھی یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا میں چند قیراط کے معاوضہ پر اہل مکہ کے لیے بکریاں چراتا تھا ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رعی الغنم یعنی بکریاں چرانے کا کام تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے کیا ہے اور آپ نے اس کام پر اجرت حاصل کرنے کی صراحت بھی فرمائی ہے ۔

(۲) عن ابن عباس رضؓ ان النبی صلے الله عليه وسلم حجمه عبد لبنى بياضه فاعطاه اجره و كلم سيده فخففت عنه من ضريبته ولو كان سحتا لم يعطه (جمع الفوائد کتاب البیوع بحوالہ بخاری، مسلم، ابوداؤد)	ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بنی بیاضہ کے ایک غلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پچھنا لگایا تو آپ نے ان کو اس کام کی اجرت عطا کی اور ان کے آقا سے سفارش کی تو انھوں نے اس غلام پر جو رقم مقرر کی تھی اس میں تخفیف کر دی اور اگر حجامت کی اجرت حرام ہوتی تو آپ کبھی اس کی اجرت نہ دیتے

یہ حدیث امام ترمذی نے بھی روایت کی ہے اس میں ہے کہ غلام کا نام ابوطیبہ تھا اور آپؐ نے اجرت میں دو صاع طعام (کھجور) عطا فرمایا تھا۔ قرآن کریم کی یہ آیتیں اور احادیث نبویؐ اجارہ کے ایک صحیح اور جائز معاملہ ہونے کے لیے اصل ماخذ ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کن چیزوں کا اجارہ صحیح ہے اور کن چیزوں کا صحیح نہیں ہے تو جس اجارے کی صحت پر فقہائے امت کا اتفاق ہے وہ یہ ہے۔

واتفقوا علی اجارۃ الدور و	مباح اور جائز افعال پر گھروں، جانوروں
الدواب والناس علی الافعال	اور انسانوں کے اجارے پر فقہاء کا اتفاق
المباحۃ وکذالک الثیاب	ہے اسی طرح کپڑوں اور فرش فروش پر بھی
والبسط (بدایۃ المجتہد کتاب الاجارات)	اتفاق ہے

اس عبارت میں سب سے پہلے مکانات کے اجارے کی صحت پر فقہاء کا اتفاق ظاہر کیا گیا ہے۔ کرایہ مکانات کے کاروبار کو سودی کاروبار اور کرایہ مکان کو سود قرار دینے کی جاہلانہ بات اس حقیر کے سامنے پہلی دفعہ آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو معاف کرے جس نے ایسی بات لکھی ہے شریعت نے جن معاملات کو جائز قرار دیا ہے ان کو کسی خود ساختہ دلیل سے ناجائز نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے یہ دلیل بھی غلط ہے کہ مالک مکان کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ مکانات بوسیدہ ہوتے رہتے ہیں ان کو مرمت کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرمت پر جتنی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے وہ اس کرایہ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ جو مالک مکان کو ملتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۷۴)

کانفرنس کے عام اجلاس میں مجھے اس وقت تک دوبارہ تقریر کرنے کے لیے نہ کہیں گے جب تک کہ وہ یہ اعلان نہ کر دیں کہ ہندوستان اسی طرح آزاد ہے جس طرح انگلستان۔

زندگی: ان اقتباسات میں ذیلی عنوانات ہم نے لگائے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی جرأت اور سیاسی بصیرت تو ظاہر ہی ہے۔ ہمیں سب سے زیادہ جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی اسلامیت اور اسلام کے بارے میں ان کا وہ وسیع تصور ہے جو اس وقت جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مفقود تھا۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۳ سے آگے)

اسلامی جہاد اس وقت وجود میں آتا ہے جب اس کے سپاہی صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے برسرپیکار رہیں۔ اگر مال غنیمت کا حصول مقصد بن جائے تو سارا کیا کرایا غارت ہو کر رہ جائے گا۔

سچے ایمان کے تقاضے بتا کر سچے مسلمانوں کی چند صفات و علامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی صفت اور علامت یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔ دلوں کی یہ لرزش اور کپکپی اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کے استحضار اور زندہ شعور سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح اللہ عز و جل کی ہیبت، رہبت اور خوف سچے مومنوں کی پہلی صفت اور علامت قرار دی گئی ہے۔ دوسری صفت یہ ہے کہ جب اللہ کی آیات انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اپنی جگہ یکساں حالت میں ٹھہری رہے بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ ایک طرف مدھم دیا کی روشنی ہوتی ہے اور دوسری طرف درخشاں آفتاب کی ــــ "روشنی" ہونے میں دونوں شریک ہیں لیکن قوت و کیفیت کے لحاظ سے دونوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ آزمائش کی گھڑی میں یہ فرق نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

سچے مومنوں کی تیسری علامت یہ ہے کہ وہ "توکل علی اللہ" کی صفت سے متصف ہوتے ہیں چوتھی صفت اقامت صلوٰۃ اور پانچویں صفت انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ ان صفات سے متصف لوگوں کے بارے میں اللہ علیم و خبیر نے جو خبر دی ہے وہ یہ ہے أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (یہی لوگ سچے مومن ہیں) یہاں سچے ایمان کے جو تین تقاضے اور حقیقی مومنوں کی جو پانچ صفات بیان کی گئی ہیں اگر صرف انہیں کے بارے میں قرآن کریم کی دوسری آیتیں پیش کی جائیں تو ایک مقالہ تیار کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ ہمارا مقصد کسی مقالے کی تیاری نہیں ہے بلکہ ہم اجمالی طور پر اس سوال کا جواب قرآن کریم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ سچے اور پکے مسلمان کون لوگ ہیں سچے مومنوں کے لیے یہاں جو اجر و صلہ بیان کیا گیا ہے وہ تین اجزا پر مشتمل ہے۔ اللہ کے نزدیک بڑے درجات ــــ خطاؤں کی مغفرت اور رزق کریم ــــ ان تینوں کو بھی قرآن کی دوسری آیتوں کی روشنی میں پھیلایا جائے تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔

(باقی)

MONTHLY
ZINDAGI

R.N I./2188/57
MRD. 66
Oct. 1983



صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

ماہنامہ

زندگی



رامپور



چندہ سالانہ
غیر ممالک سے
بذریعہ ہوائی جہاز ۱۰۰/
بذریعہ بحری جہاز 60/

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

چندہ سالانہ
ہندوستان سے 30/
ششماہی
ہندوستان سے 15/
قیمت فی پرچہ
3/-

جلد: ۷۱ | صفر ۱۴۰۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۳ء | شمارہ: ۵-۶

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

منیجر زندگی ۱۵۲۵ سوئیوالان۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مالک دعوت ٹرسٹ۔ مدیر سید احمد صاحب قادری۔ پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری۔ مطبع جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی ۶
مقام اشاعت۔ دفتر ماہنامہ زندگی رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ایک ایسے مسئلے کے بارے میں جس کی متعدد بار وضاحت کی جا چکی ہے۔ جس پر کتابیں اور مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ کچھ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی لیکن ماحول کے اثرات، ذہنوں پر اتنے زوردار ہیں کہ پھر وضاحت کے لیے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ سود کا مسئلہ نہیں مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے۔ سود، موجودہ مالی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس لیے حکومت لوگوں کی امداد کے لیے جو اسکیمیں بناتی ہے اس میں کچھ نہ کچھ سود شامل کر کے انہیں گندہ کر دیتی ہے۔ وہ ٹریکٹر دے یا پمپنگ سیٹ، وہ ٹیوب ویل یا کنویں کے لیے قرض دے یا کاروبار کے لیے — سب میں سود کی ناپاکی موجود ہے۔ اس کے باوجود مسلمان بھی ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لیے بے چین ہوتے ہیں ان میں جو لوگ سود کے حرام اور ناجائز ہونے کا علم رکھتے ہیں وہ ان اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لیے فتوے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ شاید کوئی گنجائش نکل آئے اور وہ پوری طرح اس سے استفادہ کر سکیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینے کی گنجائش ہے لیکن وہ اس شرط سے مطمئن نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ شرط نہ لگائی جائے اور مطلقاً ان اسکیموں سے استفادے کی انہیں اجازت دے دی جائے۔ ویسے بہت سے مسلمان جن کا دین سے تعلق بے حد کمزور پڑ چکا ہے فتوے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے اور اپنے کاروبار میں اضافے کے لیے سودی قرض لے رہے ہیں اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ بہت سے مسلمان دوسروں کو سود پر قرض دینے کا کاروبار بھی کر رہے ہیں۔ اصل بات نقطۂ نظر اور مطمحِ نظر کی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا

مطمح نظر حقیقی معنے میں آخرت کی کامیابی اور وہاں کی فلاح ہے۔ وہ سود سے بچکر پلاؤ قورمے پر جو کی روٹی کو ترجیح دیتے ہیں اور جن لوگوں کا مطمح نظر اصلا دنیا کی مادی کامیابی ہے وہ جو کی روٹی پر قناعت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو پلاؤ قورمہ چاہیے۔ سجا سجایا مکان چاہیے، قیمتی لباس چاہیے اور اب تو ٹیلی ویژن بھی چاہیے خواہ یہ سب چیزیں سودی قرض لیکر ہی مہیا کی جا سکتی ہوں۔

حکومت سے ٹریکٹر یا پمپنگ سیٹ لینے یا زراعت و تجارت کو بڑھانے کے لیے سودی قرض لینے کی بات جماعت اسلامی کے بعض ارکان کی طرف سے آتی ہے تو سود کے بارے میں وہ تمام وعیدیں یاد آجاتی ہیں جو قرآن و حدیث میں ہیں اور پھر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے وہ رفقاء ان وعیدوں سے ناواقف ہیں؟ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے:۔

قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کی ممانعت کا حکم آیا ہے اور ان پر سخت وعیدیں بھی ہیں لیکن اتنے سخت الفاظ کسی دوسرے گناہ کے بارے میں وارد نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قلمرو میں سود کو روکنے کے لیے سخت کوشش فرمائی آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سودی کاروبار کروگے تو معاہدہ کالعدم ہوجائے گا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔ بنو مغیرہ کے سودخوار عرب میں مشہور تھے فتح مکہ کے بعد حضور نے ان کی تمام سودی رقمیں باطل کردیں اور اپنے عامل کو لکھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ کرو۔ خود حضور کے چچا حضرت عباس ایک بڑے مہاجن تھے حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ساقط کیے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس کا سود ساقط کرتا ہوں۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ سود لینے والے اور دینے والے اور اس کی دستاویز کے کاتب اور اس پر گواہی دینے والے سب پر اللہ کی لعنت۔

(سود ص ۱۴۲)

اب اگر کوئی مسلمان مجبوری کے بغیر سودی قرض لیکر سود دیتا ہے تو وہ بھی اللہ کی لعنت کا مستحق ہے۔ جو لوگ اللہ کی لعنت سے بچنے اور اس کی رحمت کا مستحق بننے کی خواہش رکھتے ہیں ان کے لیے

کر رہے ہیں وہ تو کسی مجبوری کے بغیر سود دینا بھی گوارا نہیں کریں گے اور سود لینے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ سود کے گناہ عظیم ہونے کا حال یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان معاملات سے بھی منع فرمایا جن میں سود کا شبہ ہو۔

اس حقیر نے "عشر و زکوٰۃ اور سود کے چند مسائل" میں لکھا ہے :-

اگر کوئی مسلمان مجبور ہو جائے تو مجبوری کی حالت میں سودی قرض لے سکتا ہے لیکن مسلمان کو یہ فیصلہ آخرت کے عذاب کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے کہ وہ سودی قرض لینے کے لیے واقعی مجبور ہے یا نہیں؟ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ مجبوری کی تعریف کیا ہے اور کب انسان مجبور سمجھا جائے گا۔ اور کب نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "مجبوری" کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف نہیں کی جا سکتی کہ اس کے باہر اس کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ مجبوری کا یہ فیصلہ ہر شخص اپنے حالات کے لحاظ سے خود کرے گا۔ البتہ اس کی بعض مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً کوئی شخص بھوکا ہے اور نوبت یہ آگئی ہے کہ اگر وہ کچھ نہ کھائے تو مر جائے گا اور حرام کے سوا کوئی حلال غذا موجود نہیں ہے تو وہ اپنی جان بچانے کی حد تک حرام غذا کھا سکتا ہے۔ کوئی شخص پیاسا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ کچھ نہ پیے تو مر جائے گا اور شراب کے سوا کوئی حلال چیز پینے کو موجود نہیں ہے تو وہ شراب پی کر جان بچا سکتا ہے۔ یا کسی کاشتکار کی کچھ زرعی زمین ہے اور اسی کی پیداوار پر اس کی گذر بسر ہے لیکن اس پر کسی کا دَین ہے اور اگر وہ دین ادا نہ کرے تو اس کی زمین چھن جائے گی اور دَین ادا کرنے کے لیے روپیے سود ہی پر مل سکتے ہیں کوئی دوسری جائز صورت نہیں ہے تو وہ سودی قرض لیکر دَین ادا کر سکتا اور اپنی زمین بچا سکتا ہے۔ (ص ۱۲۶)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے :-

سودی قرض لینے کے لیے بھی ہر ضرورت مجبوری کی تعریف میں نہیں آتی۔ شادی بیاہ اور خوشی و غمی کی رسموں میں فضول خرچی کرنا کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ موٹر خریدنا یا

مکان بنانا کوئی واقعی مجبوری نہیں ہے۔ عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا، یا کاروبار کو ترقی دینے کے لیے فراہم کرنا ضروری امر نہیں ہے۔ یہ اور ایسے دوسرے امور جن کو "ضرورت" اور "مجبوری" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کے لیے مہاجنوں سے ہزاروں روپیہ قرض لیے جاتے ہیں، شریعت کی نگاہ میں ان کی مطلقاً کوئی وقعت نہیں اور ان اغراض کے لیے جو لوگ سود دیتے ہیں وہ سخت گنہگار ہیں۔ (سود ص ۱۸۱)

اب حکومت خود سب سے بڑی مہاجن بن گئی ہے اور رعایا کی امداد بھی سود لیے بغیر نہیں کرتی۔"

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان حکومت کی امدادی اسکیموں سے فائدہ نہ اٹھائیں تو دوسرے برادران وطن سے پیچھے رہ جائیں گے اور ترقی نہ کر سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ جو لوگ کتاب و سنت کی رہنمائی کے بغیر زندگی بسر کرنا چاہتے ہوں ان کو یہ نقطۂ نظر مبارک ہو لیکن جو لوگ ان دونوں کی رہنمائی کے بغیر زندگی بسر کرنے کو غیر اسلامی زندگی سمجھتے ہیں ان کو تو کتاب و سنت کی دلیل چاہیے۔ جس زمانے میں سود لینا، دینا حرام قرار دیا گیا تھا اس وقت پورے ملک میں سودی کاروبار رائج تھا اور مسلمانوں کی مالی حالت دوسروں کے مقابلے میں اچھی نہ تھی۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ مادی زندگی میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں اور جس طرح ممکن ہو ان کے برابر ہو جائیں یا ان سے بڑھ جائیں؟ کیا مسلمانوں کو مال و دولت اور عیش دنیا کے حصول میں مسابقت کا حکم دیا گیا ہے؟ مسلمانوں کو رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو حصول مال سے روکا نہیں گیا ہے البتہ ان کو حدود کا پابند کیا گیا ہے، وہ نہ مال حاصل کرنے میں آزاد ہیں اور نہ مال صرف کرنے میں آزاد ہیں اور جہاں تک مطمح نظر، نقطۂ نظر، مطلوب نظر کا سوال ہے اس کے بارے میں یہ رہنمائی کی گئی ہے:

"دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔"

(آل عمران ۔ ۱۳۳)

دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت

کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے، جو مہیا کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو
اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں، یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا
فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔" (الحدید - ۲۱)
اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں جان کھپا دیتا
ہے اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔ (البقرہ - ۲۰۷)

یہ ہے وہ نقطۂ نظر اور مطمح نظر جو اللہ رب العٰلمین نے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ آخر میں عرض یہ ہے کہ بغیر مجبوری کے محض اپنے کاروبار میں اضافے کے لیے سودی قرض لینا اور سود دینا جائز نہیں ہے خواہ سود کی مقدار کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ پیشاب کا ایک قطرہ بھی نجس ہے جو ایک گھڑے پانی کو ناپاک کر دیتا ہے۔ اگر ہمارے کسی رفیق کے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی آگئی ہو تو ان کو اس کا جائزہ لینا چاہیے اور اس بات کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ وہ جماعت اسلامی میں کیا سوچ کر داخل ہوئے تھے اور وہ اس کے دستور کی پابندی کرنے کے اقرار پر قائم ہیں یا نہیں؟

تصوف کی تین اہم کتابیں

(مولانا سید احمد عروج قادری)

ہندوستان کے تین اکابر صوفیہ شیخ علی ہجویری لاہوریؒ کی کتاب کشف المحجوب۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات فوائد الفواد اور شیخ احمد سرہندیؒ کے مکتوبات کی تصوف کی دنیا میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ مولانا سید احمد عروج قادری مدیر زندگی نے ان تینوں کتابوں کا کتاب و سنت کی روشنی میں محققانہ مطالعہ کیا ہے جو باتیں کتاب و سنت کے مطابق تھیں انہیں واضح کیا ہے اور جو باتیں کتاب و سنت کے خلاف تھیں انھیں بھی بیان کیا ہے۔

تصوف کے اسلامی اور غیر اسلامی دونوں پہلوؤں کو جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ قیمت ۵۰/۷ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۹۶

ملنے کا پتہ

(۱) مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳ بازار چتلی قبر دہلی ۱۱۰۰۰۶
(۲) کریسنٹ پبلشنگ کمپنی گلی قاسم جان بلی ماران دہلی ۱۱۰۰۰۶

تدبرِ قرآن پر ایک نظر

(مولانا جلیل احسن ندوی ؒ)

بقرہ آیت ۲۶۷ (یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ـــــ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝) کا ترجمہ یہ ہے

اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو، جو ہم نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کی ہیں اور اس میں وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو، جس کو خدا کی راہ میں تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ (تدبر اول ص۵۶۷)

"بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو" یہ ترجمہ ہے اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْہِ کا۔ اور یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے لغت کی مراجعت نہیں کی۔ عربی زبان میں آنکھیں میچنے اور چشم پوشی کے لیے "اغماض" کا لفظ آتا ہے مگر اس کا استعمال اس طرح نہیں ہوتا جس طرح آیت میں ہوا ہے۔ چشم پوشی جس چیز سے کی جائے گی اس پر عَنْ آتا ہے بولتے ہیں۔ اَغْمَضَ العینَ عَنْہُ (اس نے اس سے چشم پوشی کی) اور اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے کبھی فِی نہیں آتا۔ پھر چشم پوشی اور آنکھیں میچنے کے معنے لینے کی صورت میں مفہوم غلط ہو جاتا ہے، جو یہ بنتا ہے کہ جس طرح تم ردی مال چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے لے لیتے ہو اسی طرح اللہ میاں بھی چشم پوشی سے کام لیتے ہوئے تمہارے ردی اور خراب مال کو لے لیں گے اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اللہ میاں خراب مال منھ پر ماردیں گے اس کا کوئی اجر نہ دیں گے۔ عربی زبان میں اغماض کا لفظ جب "فی" کے ساتھ آتا ہے تو اس کا تعلق خرید و فروخت سے ہوتا ہے اور اس کے معنے آتے ہیں قیمت کو گھٹا دینا، آپ جب کسی تاجر کے یہاں مثلاً کپڑا خریدنے جاتے ہیں، مول بھاؤ کرتے ہیں، قیمت طے ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کپڑا بالکل ردی اور خراب

ہے لینے کے لائق نہیں ہے تو آپ کپڑا واپس کر کے اپنی قیمت لے لیتے ہیں اور اگر خرابی کم ہے تو قیمت گھٹانے کا مطالبہ کرتے ہیں اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مکمل ردی اور خراب مال کو منہ پر مار دے گا اس پر کوئی اجر نہ دے گا۔ اور اگر مال کا کچھ حصہ ردی ہے اور بقیہ عمدہ ہے تو اجر کو گھٹا کر دے گا۔

لسان العرب جلد ۷ طبع بیروت میں غ، م، ض مادہ کے تحت اس پر بحث کی ہے۔ ابن الاثیر کا حوالہ دیا ہے اور بعض جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے

آخر میں خدا کی دو صفتیں آئی ہیں ایک غَنِیٌّ دوسری حَمِیدٌ۔ غنی سے ایک تو یہ حقیقت سمجھانی ہے کہ خدا تمہارے صدقات کا محتاج ہے بلکہ اس کا فائدہ تمہیں حاصل ہوگا۔ دوسری بات یہ بتاتی ہے کہ اس کے پاس دینے کے لیے سب کچھ ہے۔ اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں ہے اگر تم خدا کا مطالبہ پورا کرو گے تو وہ تمہیں مزید دے گا کیونکہ وہ حمید ہے یعنی فیاض، اور اگر خدا کے مطالبہ انفاق کو پورا نہ کرو گے تو وہ تمہارا مال چھین بھی سکتا ہے اور ایسا کر کے وہ قابل مذمت کام نہ کرے گا، لائق حمد و شکر کام کرے گا اس لیے کہ تم نے اپنے کو اس کا مستحق بنایا کہ جس نے تمہیں بخشا ہے، اپنی بخشش کو واپس لے لے۔

بقرہ آیت ۲۴۱ (وَلِلْمُطَلَّقَاتِ ـــــ عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝) کا ترجمہ پڑھیے۔

"اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا ہے۔ یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔"

(تدبر اول ص ۵۰۸)

اور اس کی تشریح ذیل کے الفاظ سے فرماتے ہیں:۔

اوپر آیت ۲۳۶ میں مطلقہ عورتوں کو دے دلا کر رخصت کرنے کی جو ہدایت فرمائی تھی اس کی یاد دہانی کر دی اور اس کو اہل تقویٰ پر ایک حق قرار دیا، جو حقوق صفات و کردار پر مبنی ہوتے ہیں، بعض حالات میں وہ اس دنیوی زندگی میں تو قانون کی گرفت کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں لیکن خدا کے یہاں ان صفات کے لیے وہ حقوق ہی معیار ٹھیریں گے اگر ایک چیز مومنین یا محسنین یا متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخرت میں بھی ان کی خلاف ورزی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوگا۔ آخرت میں آدمی کا ایمان

یا احسان یا تقویٰ الٰہی حقوق کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کے اعتبار سے وزن دار یا بے وزن ٹھہرے گا۔"

آگے کَذٰلِکَ والے جملہ پر فرماتے ہیں :۔

"عموماً یہ ٹکڑا ان آیات کے بعد آتا ہے جن کی حیثیت توضیح مزید کی ہوتی ہے اور جو اپنے احکام کے بعد سوال یا مزید جستجو اور تلاش پیدا ہونے کے بعد نازل ہوتی ہے۔"

(تدبر اوّل ص ۵۱۲)

اس پر عرض یہ ہے کہ یہ آیت "یاددہانی" کے طور پر نہیں آئی ہے بلکہ آیت ۲۳۶ میں صرف ان مطلقہ عورتوں کو متعہ دینے کا حکم دیا گیا تھا جنہیں شوہر کے ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی گئی اور مہر بھی مقرر نہ ہوا تھا۔ ایسی عورتوں کو معقول متعہ دینے کی ہدایت دی گئی تھی۔ "دستور کے مطابق" کا مطلب یہ ہے کہ ٹولے محلّے کے کچھ لوگ اللہ سے ڈرنے والے معاملہ فہم لوگ سر جوڑ کر بیٹھیں اور طے کریں کہ اس بد نصیب مطلقہ کو شوہر سے کس مقدار میں متعہ دلایا جائے۔ اسے شوہر کے اختیار تمیزی پر نہیں چھوڑا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ہمارے ایک مفتی کی رائے کے مطابق ایک اوڑھنی دے دے۔ یہ متعہ تو نہ ہوا۔ یہ اس لفظ کا مذاق اڑانا ہوا، اس سے خدا کے نازل کردہ الفاظ کا منشاء پورا نہیں ہوتا۔

میں پھر یاد دلاتا ہوں کہ یہ آیت یاددہانی کے لیے نہیں آئی ہے بلکہ تبیینی آیت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ متعہ صرف ایسی مطلقہ عورت کو دیا جائے کا جسے طلاق دینے والے شوہر نے ہاتھ نہ لگایا ہو اور مہر مقرر نہ ہوا ہو یا سب مطلقہ عورتوں کو دیا جائے گا؟ خدا نے فرمایا ہر قسم کی مطلقہ عورتوں کو دیا جائے گا یہ متعہ دینا اہل ایمان پر فرض ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والے آخرت سے پہلے دنیا میں اسلامی قانون کی قانونی گرفت کا سامنا کریں گے اور اگر توبہ کر کے ایسے لوگ نہیں مریں گے تو خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ میں جلتا ہو گا۔ مولانا اصلاحی صاحب نے معلوم نہیں کیوں نرم رویہ اور ڈھیلا ڈھالا انداز بیان اختیار کیا۔ یہ بات یاد رکھیے کہ قرآن کی زبان میں مومنین، متقین اور محسنین سب مترادف الفاظ ہیں۔ اس مبارک عہد میں مومن، متقی اور محسن کی تین تقسیمیں نہ تھیں۔ یہ تو دینی زوال کے دور کی پیداوار ہے۔

بقرہ آیت ۲۱۵ (یَسْأَلُونَكَ ــــ عَلِيمٌ ٥) کا پہلے ترجمہ پڑھیے۔ پھر مولانا فراہی رحمہ اللہ

کی رائے پڑھیے اور آخر میں مولانا اصلاحی کی رائے ملاحظہ کیجیے۔

"وہ تم سے پوچھتے ہیں کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو تو وہ والدین، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ (تدبر ص ۴۹۳)

مولانا فراہی رح کا مفہوم صاحب تدبر کے الفاظ میں یہ ہے:-

ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لیے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے ہوا تھا اس وجہ سے اس نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کرلی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر نہماک ہوگئے کہ انفاق کے دوسرے مصارف ـــ والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین وغیرہ ـــ کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اول حقدار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب خدا کے علم میں رہے گا اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہہ رہ گیا تو انھوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کردی گئی کہ کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو۔ چونکہ اوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہوا"

(تدبر اول ص ۴۷۶)

اور اب مولانا اصلاحی کی تاویل پڑھیے:-

اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آرہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۱۹۵ بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے۔ قاعدہ ہے کہ

آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو، وہ اس کے کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو، تو
وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر
دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے، اس کے لیے وہ جی جان سے حاضر ہے
لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے
اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کیے گئے ہیں۔ زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے
کیے گئے ہیں جو کم ہمت اور بخیل تھے، اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا
چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنھوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اٹھایا
جس کا آیت زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات
کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ
میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد تک پہنچ کر رکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے ان کی اسی ذہنیت
کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصے ہیں۔" (تدبر اول ص ۵۰۶ ۴۴۶)

مولانا اصلاحی صاحب کا اقتباس لمبا ہے نقل میں طوالت ہو گی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جواب
کا پہلا حصہ یہ ہے کہ انفاق کا فائدہ تمہارے معاشرے کے افراد ہی کو پہنچے گا، خدا کو نہیں، وہ تمہارے مال
کا محتاج نہیں ہے اور جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انفاق کرو گے تو اس کا بھرپور صلہ ملے گا۔ مولانا فرماتے
ہیں کہ پھر بھی اس طرح کے لوگ سوال کرتے رہے تب اللہ نے فرمایا کہ جو ضروریات سے بچ رہے وہ
اعلائے کلمۃ اللہ کی مہم میں لگاؤ ــــ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے شیخ کی رائے کیوں نہیں قبول کی
اپنی رائے کے بالمقابل ان کی رائے پیش کرنے پر کیوں اکتفا فرمایا۔ بہت سے وہ بہت مقامات پر حضرت
شیخ کی رائے سے اختلاف کیا ہے تو اختلاف کے دلائل بھی دیے ہیں، یہاں کیوں نہیں دیے ـــ تاکہ قرآن
کے طلبہ یہ جان سکتے کہ مولانا کے دلائل میں کتنا وزن ہے، اور مولانا فراہی کی رائے کیوں قابل قبول نہیں ہے
یہاں پر مولانا فراہیؒ کی رائے پیش کرتے ہوئے صاحب تدبر نے یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"مولانا فراہیؒ اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔"

حالانکہ دونوں کا زاویہ نظر مختلف ہے۔ "ذرا" مختلف نہیں ہے۔ مولانا فراہی کے نزدیک اس آیت
میں ان سچے اور پکے اور اونچے اہل ایمان کا اعلیٰ کردار پیش کیا گیا ہے جو سراپا اسلام (باقی ص ۳۸ پر)

میں بھی حاضر تھا وہاں

تاثرات اور حقائق

(جناب حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی)

دنیا میں ایسے بہت سے جوہر گمنام ہوئے ہیں جو اپنی جگہ چھپے رہتے ہیں اور لوگ ان کی قدر و قیمت سے ناواقف رہتے ہیں۔ حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی ایسے ہی ایک جوہر ہیں۔ ہندوستان میں ایسے لوگ شاید ہی موجود ہوں جنھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کے ایک شاگرد کی حیثیت سے کچھ وقت گذارا ہو۔ حکیم صاحب غیر منقسم جماعت اسلامی کے سب سے پہلے بحرانی دور میں مولانا مودودی کے پاس ہی مقیم تھے۔ وہ تشکیل جماعت سے کچھ پہلے ہی مئی یا جون ۱۹۴۱ء میں مولانا کی خدمت میں پہنچ گئے تھے وہ دو سال سے کچھ زیادہ مدت تک مولانا کی خدمت میں رہے۔ حکیم صاحب نے اپنے مکتوب میں مجھے لکھا ہے:۔

"تشکیل جماعت سے چند ماہ قبل مولانا نے مجھے اپنے پاس بلا لیا تھا اور یہ میری خوش نصیبی تھی کہ وہ ساری مدت جو مولانا کی خدمت میں گذری مجھے ان کی ذات سے زیادہ سے زیادہ استفادے کے مواقع حاصل رہے اور مولانا کو ہمیشہ اس کا احساس رہا کہ جس طالب علم کو انھوں نے اپنے پاس خود بلایا ہے اس کا وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ خیال ہے کہ مئی ۱۹۴۱ء کا آخری یا جون ۱۹۴۱ء کا پہلا ہفتہ رہا ہوگا جب میں لاہور پہنچا۔ میں نے مولانا کی رہنمائی میں شاہ ولی اللہؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیم اور سیرت و تاریخ کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا پھر ان سے سبقاً سبقاً قرآن مجید کا کافی حصہ پڑھا ۔۔۔ مطالعہ کے علاوہ میرے ذمہ دفتر کا کچھ کام رہتا تھا۔ اہم خطوط کی نقل بھی میرے ذمہ تھی اور

وقتاً فوقتاً مولانا کے دیے ہوئے جوابات کی نقل بھی کرتا تھا۔ یہ میرا بہت بڑا نقصان تھا کہ پٹھان کوٹ کی آب و ہوا مجھے راس نہ آئی اور شدید علالت کے باعث مجھے وطن واپس آجانا پڑا۔"

حکیم صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بھی شاگرد ہیں اس لیے وہ ان سے واقف ہیں اور مولانا مودودی سے بھی۔ جون ۱۹۴۲ء سے جون ۱۹۴۳ء تک دارالاسلام پٹھان کوٹ میں جو واقعات پیش آئے حکیم صاحب اس کے عینی شاہد ہیں اور چونکہ وہ مولانا کی خدمت میں ان سے بہت قریب رہتے تھے اس لیے انھوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے اس کو قلم بند کر دیا ہے۔ حکیم صاحب کی مجلسی گفتگو بھی دلچسپ ہوتی ہے اور ان کی تحریر پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ صاف ستھری زبان اور دلچسپ انداز بیان میں اپنے تاثرات و محسوسات کو زیر تحریر لانے پر بھی قادر ہیں۔ ان شاء اللہ "زندگی" میں ان کے لکھے ہوئے تاثرات اور حقائق پیش کیے جاتے رہیں گے۔ (زندگی)۔

مولانا مودودی پر اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں۔ انھوں نے اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے اپنے جسم و جان کی ساری توانائیاں اور اپنے دل و دماغ کی ساری صلاحیتیں ہی نہیں اپنی صحت و تندرستی بھی داؤں پر لگا دیا تھا۔ اور زندگی کی آخری ساعت اور دل کی آخری حرکت تک ان کی حرکات و سکنات اور ان کے فکر و عمل کا محور اللہ کے دین کی سربلندی ہی رہا۔ اس راہ میں مخالفتوں کے شدید طوفان بھی آئے اور قید و بند کی اذیتیں اور تختہ دار بھی۔ مگر اللہ کی راہ کے اس راہی کے پائے ثبات کو کوئی چیز بھی متزلزل نہ کر سکی۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی حیات اور سرمایہ حیات کو اللہ کی امانت سمجھا اور اللہ کی راہ میں پیش آنے والی ہر مصیبت کو خوشی خوشی برداشت کر لیا۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اور اللہ کی راہ کے کٹھن کے پکے اس راہی پر اللہ کے خصوصی فضل و کرم کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اس نے مولانا کی حیات ہی میں ان کے دل کی دھڑکنوں کو عالم اسلام کے دل کی دھڑکن بنا دیا اور اقامت دین کا نصب العین جو مولانا کو دل و جان سے زیادہ عزیز تھا اسے بے شمار لوگوں کے لیے

اُن کے دل و جان سے زیادہ عزیز بنادیا آج دنیا کے جس گوشے میں بھی احیاءِ اسلام کا کوئی کام ہو رہا ہے۔ بلاشبہ اس کی آبیاری میں مولانا کا خونِ دل بھی شامل رہا ہے۔ اسی طرح دنیا کے جس حصہ میں بھی کبھی نظامِ اسلام کو عملاً نافذ کرنے کا مرحلہ پیش آئے گا مولانا کی تصنیفات سے کسی طرح بھی صرفِ نظر نہ کیا جاسکے گا۔ ان شاء اللہ یوں ہی چراغ سے چراغ جلتے اور مولانا کی حسنات میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

مولانا کی وفات عالمِ اسلام کے لیے ایک سانحہ عظیم تو ہے ہی۔ میرے لیے وہ ایک عظیم ذاتی نقصان اور جاں کاہ حادثہ بھی ہے۔ مولانا کی رہنمائی میں میری تعلیم کا سلسلہ میری خرابی صحت کے باعث منقطع ہوگیا تھا۔ پھر علالت کا سلسلہ طول پکڑتا گیا اور اب تو برسوں سے معذوری کی زندگی گذار رہا ہوں۔ اور صحت طویل سفر کی متحمل نہیں۔ پھر بھی اس طویل عرصہ میں دل کی یہ شدید خواہش کہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ بال بچوں کو لیکر ہمیشہ کے لیے مولانا کی خدمت میں پہنچ جاؤں۔ کم نہ ہوسکی۔ مولانا میرے لیے صرف ایک دینی رہنما، شفیق استاد و مربی ہی نہ تھے بلکہ ان کی شفقتوں کا تصور اس بعد مکانی کے باوجود بھی مجھے کارزارِ حیات کی سنگلاخ راہوں میں ہمت و حوصلہ عطا کرتا رہا ہے۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

مولانا کی شفقتوں کی خنک چھاؤں اور ان کے علم و عرفان کی روشنی میں گذرے ہوئے دنوں کی یاد میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اور ان سارے حادثات و واقعات کا منظر جو میرے سامنے وقوع پذیر ہوئے اکثر آنکھوں کے سامنے گردش کرتا رہتا ہے لیکن معاملہ اگر صرف یادوں کی ترتیب کا ہوتا تو ایسی حالت میں کہ صحت کے ساتھ آنکھیں بھی جواب دے چکی ہیں، یقیناً میں اس کام کی ہمت نہ کرسکتا تھا۔ مگر یہ یادیں ایسے اہم حالات و واقعات کی تفصیلات سے بھی وابستہ ہیں جن کے حقائق پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ سوچ کر کہ حقائق پر پڑے ہوئے یہ پردے کہیں تاریخ کے ان ابواب پر پڑے ہوئے پردے نہ بن جائیں۔ مولانا کی وفات کے بعد ہی انہیں قلمبند کرنا شروع کردیا تھا لیکن اس طرح کہ چند اوراق کی تحریر عمل میں آنے کے بعد آنکھوں میں تکلیف پیدا ہوگئی تو تحریر کا سلسلہ مہینوں کے لیے منقطع ہوگیا۔ پھر اللہ نے توفیق بخشی تو مزید چند اوراق کا اضافہ ہوگیا۔ اس طرح منتشر اوراق پر قلمبند کیا ہوا بیشتر حصہ ڈیڑھ دو سال سے پڑا ہوا ہے۔ جس کا میری مسلسل تکالیف کی وجہ سے تکملہ نہیں

ہو پایا۔ اب اس مسودہ کو تلف ہونے سے بچانے کی یہی صورت نظر آئی کہ تھوڑا تھوڑا حصہ نظر ثانی کرکے اشاعت کے لیے دیتا رہوں۔ اللہ نے توفیق دی تو جو حصہ رہ گیا ہے اس کا اسی سلسلے میں تکملہ ہو جائے گا۔

پھر میری اس تحریر کے دوران ہی استاد محترم مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا "پیش لفظ" لیے ہوئے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی "سرگزشت" منظر عام پر آگئی۔ اب جہاں تک مولانا نعمانی صاحب سے میرے تعلق کی نوعیت کا معاملہ ہے تو وہ صرف یہی نہیں ہے کہ "دارالاسلام" میں، میں ان کا ایک ادنیٰ رفیق رہا۔ بلکہ تشکیل جماعت سے قبل، تشکیل جماعت کے موقع پر اور تشکیل جماعت کے بعد مولانا موصوف جب جب مولانا مودودی کے پاس لاہور تشریف لائے۔ میں مولانا مودودی کی خدمت میں حاضر تھا۔ اسی طرح "دارالاسلام" میں بھی ان کا آنا اور جانا میری موجودگی میں ہوا۔ اور وہاں مولانا موصوف نے جو کچھ کیا، اس کا میں عینی شاہد رہا۔ البتہ اس کوشش کے باوجود بھی جو مجھے "حزب اختلاف" کا ہمنوا بنانے کے سلسلے میں کی گئی میں اس کا ہمنوا نہیں بن سکا۔ اور اس کا مجھے پورا حق تھا۔ پھر ان کے اور مولانا مودودی کے درمیان کی پوری مراسلت کو بار بار پڑھنے کا شاید ہی مجھ سے زیادہ کسی دوسرے آدمی کو موقع مل سکا ہو۔ اور یہ بات اگر میرے استاد محترم مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کو یاد رہتی تو ان کے "پیش لفظ" کا شاید مقصد ہی فوت ہو جاتا ___ ایسی حالت میں میری یادوں اور تاثرات کے دائرے نے خود اس عہد کے ان سارے حالات و واقعات ہی کا احاطہ نہیں کر لیا تھا جن سے انھوں نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے بلکہ ان امور کا بھی جنھیں انھوں نے ازراہ "تقویٰ" حذف کر دیا ہے۔

اب جہاں تک مولانا علی میاں صاحب کے "پیش لفظ" کا معاملہ ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنا "پیش لفظ" اگر انھوں نے مولانا نعمانی صاحب کی کتاب کا مطالعہ کیے بغیر تحریر فرمادیا ہے تو افسوسناک ہے اور اگر اسے انھوں نے کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے بہرحال وہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد جو مولانا موصوف کے اس "پیش لفظ" میں دیکھنے کو ملا۔ جب بات یہاں تک پہنچی کہ قرآن تو جہاں ایک طرف "دعوت" کے ساتھ داعی کو پیش کرتا ہے وہیں دوسری طرف "دعوت" کے ساتھ دعوت کے مخالفین اور ان کی مخالفت کو بھی پیش کرتا ہے۔ مگر مولانا علی میاں

صاحب قرآن کے حوالے سے صرف دعوت اور داعی کے درمیان کے "نازک رشتہ" کو لیتے ہیں اور رد دعوت اور داعی کے مخالفین اور ان کی مخالفت کے درمیان کے "نازک رشتے" کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور رد دعوت اور داعی کے "نازک رشتہ" کی بھی توضیح کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی بنا پر ان کی مولانا نعمانی صاحب کی قدامت و ثقاہت سے متعلق شہادت کا لحاظ کرکے مولانا نعمانی صاحب کی شہادت کو آنکھ بند کرکے صحیح تسلیم کیا جائے۔ تب میں نے یہ سوچ کر کہ مولانا مودودی کی "سیرت" کے ساتھ ان کے مخالفین کی "سیرت" کے بھی کچھ گوشے سامنے رہیں تاکہ عدل و قسط کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ مولانا مودودی کے بعض مخالفین کی "سیرت" کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ کیونکہ جس طرح بقول خود مولانا علی میاں صاحب" کم سے کم اسلامی دعوت اور اس کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کی تحریکات اور کوششوں میں داعی کی سیرت کو اس کی دعوت و فکر سے یہ کہہ کر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کہ انظر الی ما قیل ولا تنظر الی من قال (دیکھو کیا کہا جا رہا ہے یہ نہ دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے[1])"

اسی طرح کم سے کم اسلامی دعوت اور اس کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کی تحریکات اور کوششوں میں داعی کے مخالف کی سیرت کو بھی اس کی مخالفت سے یہ کہہ کر علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کہ انظر الی ما قیل ولا تنظر الی من قال (دیکھو کیا کہا جا رہا ہے یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے) ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک

ندوہ میں گھر سے فارسی اور اردو وغیرہ پڑھ کر گیا تھا اس لیے داخلہ تو میرا وہاں درجہ اول عربی ہی میں ہوا لیکن میں اس اعتبار سے ندوہ کا ایک خوش قسمت طالب علم تھا کہ مجھے داخلہ کے بعد ہی سے استاذ محترم مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی متعنا اللہ بطول بقاءہ کی شفقت حاصل رہی۔ ساتھ ہی مجھے مولانا موصوف کی راتوں کو بھی دیکھنے کے کچھ مواقع حاصل رہے اور مولانا موصوف

---

[1] مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت اور اب میرا موقف ص ۵

کی یہ باتیں ایسی نہیں تھیں جو ایک نوجوان کے لوح دل پر اپنے نقوش مرتسم کیے بغیر چھوڑ دیتیں۔ چنانچہ یہ نقوش میری آئندہ زندگی کے لیے ایک دولت بے بہا اور مشعل راہ ثابت ہوئے۔

پھر میں نے اسی سال محنت کرکے اللہ کے فضل سے تیسرے درجہ کا امتحان پاس کر لیا اور مولانا موصوف نے اپنے طور پر تبلیغ کا کام شروع کیا تو مجھے مولانا موصوف کا مزید قرب حاصل ہوا۔ تبلیغ کا یہ کام ابتدا میں نشاط گنج، ماہ نگر اور علی گنج کے محلوں تک محدود رہا۔ بعد میں اس کا سلسلہ مضافات تک پھیل گیا تو میں، عبدالغفار صاحب، سلمان صاحب، خالد صاحب، ظہور صاحب اور میرے بعض دوسرے احباب اس میں دل و جان سے حصہ لینے لگے۔ یہ تبلیغی سفر ہم لوگوں کے لیے چلتا پھرتا مدرسہ بھی تھے اور متحرک تربیت گاہ بھی۔ راستہ میں مولانا موصوف کبھی ہم لوگوں کو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے ایمان افروز واقعات سناتے اور کبھی سید صاحبؒ اور دوسرے مجاہدین کے سرفروشی اور جاں سپاری کے کارنامے۔ کبھی جذبہ جہاد بیدار کرنے والی آیات و احادیث کی تشریح فرماتے۔ اور کبھی خانقاہوں کے شب و روز پہ جہاد کی تیاریوں کی فضیلت بتاتے۔ کبھی اپنے پسندیدہ مصنفین کی کتابوں کے پسندیدہ مقامات کی نشان دہی فرماتے۔ کبھی خارج میں ہم لوگوں کے مطالعہ کے لیے کتابیں تجویز فرماتے۔ اور کبھی ہم لوگوں کے زیر مطالعہ کتابوں کے مشکل مقامات کی تشریح فرماتے ـــــ اور مجھے یاد ہے کہ ان سفروں کے چند ماہ بعد ہی مولانا موصوف کی ہمت افزائیوں کے سہارے میں نے خود سے ابن جوزی کی "تلبیس ابلیس" اور صفوۃ الصفوۃ" کا مطالعہ کر لیا تھا ـــــ غرض بات کہیں سے بھی چلتی گھوم پھر کر سرفروشی و جان سپاری تک پہنچ جاتی۔ اسی زمانے میں مولانا اپنی تصنیف "سیرت سید احمد شہیدؒ" کے مسودہ پر نظر ثانی فرما رہے تھے یا مسودہ کتابت کی منزل سے گذر رہا تھا۔ اور مولانا موصوف سید صاحبؒ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھے اور کسی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہونے کا مطلب مولانا علی میاں صاحب کے نزدیک متعلقہ شخصیت کے رنگ میں کلیۃً رنگ جانا ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جب سید صاحب کی شخصیت سے متاثر ہونے کے بعد مولانا موصوف سید صاحب کے رنگ کو اپنا رہے تھے تو اقامت دین کا نصب العین، مولانا کی حیات کا نصب العین بن گیا تھا اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام کی تمنا، مولانا موصوف کے حیات کی سب سے بڑی تمنا بن گئی تھی۔ اور رگ و پے میں وہی خون تھا جو گردش کر رہا تھا اور دل میں وہی جوش و ولولہ تھا اور وہی عزم و حوصلہ جو موجزن تھا، سرفروشی کی وہی تمنائیں تھیں اور جاں نثاری کی وہی آرزوئیں۔ کتابت

سنت کا وہی مقام تھا اور کتاب وسنت کی دلیل کے سامنے ہر دلیل قابل رد اور غیر مسموع۔ پھر یہی سب کچھ نہیں تھا بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک تنور ہے جو مولانا موصوف کے سینے میں دہک رہا ہے اور یہ کہنے والے برسوں میں اگر ہم لوگوں کو مولانا موصوف کی معیت میں رہنا ہے تو ابھی سے مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں ٹیلہ کی مسجد کے صحن میں ٹہل ٹہل کر اپنے تلووں کو مضبوط کر لینا چاہیے۔ مولانا موصوف کی حیات کے مختلف ادوار میں ان کی حیات کا یہ دور مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ ممکن ہے اس محبت میں اس چیز کا بھی دخل ہو کہ میری تربیت، مولانا موصوف کے اسی دور کی رہین منت ہے۔

مولانا علی میاں صاحب کی حیات کے اس سنہرے باب کے متعلق جو اب خود ان کے لیے ایک مرحوم باب بن چکا ہے۔ برسوں میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ خود ان کے جذبات و احساسات کا پرتو تھا۔ مگر مولانا موصوف کی خدمت میں میرے قیام کے دوران ہی جب ان کی شخصیت سے سید صاحب رح کی شخصیت کا رنگ زائل ہونا شروع ہو گیا تو اس کی علت نہ تو میں اس وقت سمجھ پایا اور نہ برسوں بعد تک۔ پھر سید صاحب کی شخصیت کی طرح بالکل دوسری قسم کی شخصیتوں کے رنگ میں مولانا موصوف کی شخصیت کو رنگا ہوا دیکھ کر بات سمجھ میں آ گئی کہ مولانا کی شخصیت کے مختلف دور یا باب خود ان کے جذبات و احساسات کا پرتو نہیں بلکہ ان شخصیتوں کے جذبات و احساسات کا پرتو ہوا کرتے ہیں جن سے مولانا موصوف بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور یہ ان کی شخصیت کا بہت بڑا نقص بھی ہے۔ اور ان کے مقام و مرتبہ اور سن و سال سے بھی بہت فروتر ہے۔

اسی طرح مولانا علی میاں صاحب شاعر نہیں ہیں مگر شعریت ان کی بہت بڑی کمزوری ہے چنانچہ جس طرح شاعر پر کسی پھڑکتے ہوئے مطلع کا نزول ہو جاتا ہے تو وہ لطف لے لے کر بار بار اسے سناتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ پوری غزل تیار ہو جائے۔ اسی طرح مولانا موصوف کے ذہن میں شعریت کا لباس حریر زیب تن کیے ہوئے کوئی اچھوتا خیال آجاتا یا دوسرے کا ایسا کوئی خیال انہیں پسند آجاتا تو وہ لطف لے لیکر بار بار اسے سناتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ کسی مضمون کی شکل اختیار کرے یا کسی تقریر دلپذیر کی اور اب میرا خیال ہے کہ وہ کسی کتاب کی شکل اختیار کر لیتا ہوگا۔ ایسے خیالات کی پشت پر بہر حال فکر سے زیادہ شعریت ہی کا عمل دخل رہتا تھا۔ اسی لیے ان خیالات کو دوام حاصل نہیں ہو سکا۔ مولانا شاعر بھی تھے مگر ان کی شاعری کو ان کے برادر بزرگ نے سختی سے دبا دیا تھا۔ البتہ شعریت باقی

رہ گئی اور اس نے مولانا کے مزاج و طبیعت میں ایسا مقام حاصل کر لیا ہے کہ بغیر اس کو سمجھے ہوئے مولانا کی کسی چیز کو بھی سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس سے صرف نظر کر کے مولانا کا جو بھی مطالعہ کیا جائے گا وہ ناقص ہی رہے گا۔

مولانا موصوف کی توجہات کا کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہ رہنا اور ان کی کسی کیفیت کا قلیل مدت سے زیادہ قائم نہ رہنا عالم اسلام کا بہت بڑا المیہ ہوا اور یہ اس افتادِ طبع ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی خداداد صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ نہ عالم اسلام کو پہنچ سکا، نہ ندوہ کو اور نہ ہی مولانا موصوف ان موضوعات کے ساتھ انصاف کر سکے جن پر انھوں نے قلم اٹھایا۔ ان کی تصنیفات ان کے مختلف دَور کی یادگار بنکر رہ گئی ہیں اور اس افتادِ طبع کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض انتہائی اہم مسائل اور بعض نصوص تک کے متعلق بھی ان کی کتابوں میں متضاد آرا اور متضاد موقف موجود ہیں اور ان متصادم خیالات اور متحارب نظریات کی موجودگی میں قاری کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ آیا مولانا موصوف کے نزدیک یہ دونوں صورتیں درست ہیں یا ان میں سے کوئی ناسخ ہے اور کوئی منسوخ اور اگر ہے تو کون ناسخ ہے اور کون منسوخ؟ اور حد یہ ہے کہ مولانا موصوف کو شمہ برابر اس کا احساس نہیں۔ بہرحال ان کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میرے دل میں ہمیشہ یہی تمنا رہی کہ مولانا موصوف جہاں بھی رہیں اور مولانا موصوف جو بھی کریں مگر اس مقام بلند کو فراموش نہ کر ڈالیں جو اللہ نے انہیں عطا کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس تمنا کو برابر ٹھیس لگتی رہی

سند کی عظمت اور اُس کے بعض کمزور پہلو

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ہو کر چند راویوں کے واسطے سے بتدریج کسی شیخ پر منتہی ہوتی ہے۔ اس سلسلۂ روایت کو اس حدیث کی سند کہتے ہیں۔ کسی شیخ سے مراد یہاں وہ شیوخ حدیث ہیں جو سلسلۂ سند میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور جن کے ہاتھوں امت مسلمہ میں احادیث رسول کے مجموعوں کی جمع و تدوین کا عظیم کارنامہ صدر اول میں انجام پا چکا ہے۔ جیسے امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم (رحمہم اللہ) وغیرہ۔ کتب حدیث کی تدوین کے بعد روایت حدیث کی سند کے لیے ان اکابر کو شیخ ماننا حدیث کے طالب علموں کے لیے ناگزیر ہے۔

سلسلۂ روایت میں صحابہ کرام رض کی جو حیثیت اور مرتبہ و مقام ہے اس کی ضروری وضاحت ہم اس سلسلے کے مضمون "صحابہ اور صحابیت" کے تحت کر چکے ہیں۔ صحابہ رض بہرحال اس امت کے گل سرسبد ہیں۔ ان کے متعلق یہ طے ہے کہ وہ جرح و تنقید سے قطعی بالاتر ہیں اور محدثین کا یہ اصول کہ "الصحابۃ کلھم عدول (تمام صحابہ جرح و تعدیل سے بالاتر ہیں) ان کے بارے میں بالکل ٹھیک ہے۔ اس لیے صحابہ کا یہ منصب جو بیان ہوا ہے کہ :۔

عن عمر بن الخطاب قال: قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم	حضرت عمر بن خطاب رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی پیروی کرو گے راہ یاب ہو گے

اس کا یہ تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی منسوب کردہ حدیثوں کے بارے میں

لہ مشکوٰۃ المصابیح ۔ باب مناقب الصحابۃ

یہ رائے رکھیں کہ وہ پوری دیانت وامانت کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور اس کے بارے میں بلاوجہ کسی شبہے میں نہ پڑیں۔

جہاں تک سلسلۂ روایت کے باقی راویوں کا تعلق ہے وہ سب کے سب تنقید کی زد میں آتے ہیں ان سب کی امانت ودیانت، علمی مرتبہ، حافظہ، دین پر عمل، ہر چیز کو پرکھا جاتا ہے اور ائمہ فن کی ان کے بارے میں آراء کو جمع کیا جاتا ہے۔ اس اہتمام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ روایت حدیث میں کوئی خرابی راہ نہ پائے۔ اسی اہم ضرورت نے فن اسماء الرجال کی راہ ہموار کی۔

سند کا اہتمام اور فن اسماء الرجال کی ایجاد

علم حدیث کی حفاظت کے لیے سند کا باقاعدہ اہتمام اور فن اسماء الرجال کی ایجاد مسلمانوں کا ایک کارنامہ ہے جس میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جرح و تعدیل کا یہ فن مسلمانوں کا خاص فن ہے۔

جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واحوال کی روایت، تحریر اور تدوین کا کام سرانجام دیا۔ ان راویان حدیث میں صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے تیسری صدی ہجری تک کے لوگ شامل ہیں جن کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے اور ملنے والوں میں سے کم وبیش بارہ ہزار اشخاص کے نام اور حالات ہمیں ملتے ہیں۔

ان تمام رواۃ حدیث کے حالات معلوم کرنے اور ان کے طبقات قائم کرنے میں ہزاروں اکابرین امت نے اپنی عمریں کھپا دیں۔ وہ قریہ قریہ پہنچے، راویوں سے ملے۔ ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات مہیا کیں اور جو لوگ خود ان کے عہد میں بقید حیات نہیں تھے ان کے ملنے والوں سے یا ان کے توسط سے ان سے اوپر کے لوگوں سے ان کے حالات دریافت کیے اور جس حد تک انسانی امکان میں ہو سکتا تھا۔ ان حاصل شدہ معلومات کی چھان پھٹک کی۔ اس طرح سے وہ عظیم الشان اور فقید المثال فن معرض وجود میں آیا جسے فن اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت اصحاب روایت حدیث و آثار کے اسماء، القاب، سوانح، سیرت اور امانت ودیانت کا حال قلم بند کیا گیا۔ ائمہ محدثین کی ان کے بارے میں رائیں جمع کی گئیں۔ ان کی جرح و تعدیل کی گئی اور ان کے طبقات کی تعیین کی گئی۔ گویا جس کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کوئی بات کہنے کی جرات کی اس کی ساری زندگی نہایت بے لاگ اور بے رحم نقادوں کا ہدف بن گئی اور آخرت سے پہلے اس کو سارا حساب اسی دنیا میں دینا پڑ گیا۔

اس [illegible] اگر کوئی قوم مسلمانوں کی حریف ہو سکتی تھی تو وہ اہل کتاب ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ اس طرح کا انتظام اپنے نبیوں کے اقوال کی حفاظت کے لیے تو درکنار انھوں نے اپنے آسمانی صحیفوں تک کے لیے نہیں کیا۔ وہ اس میدان میں نہایت ہی ہیز نکلے۔ ان کی مذہبی کتابوں کی تو وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہماری تاریخ کی کتابوں کی ہے۔ ہمارے ہاں تاریخ کی بھی روایت ملے گی تو اس کی سند موجود ہوگی اور اس کے لیے کوئی معیار بہرحال مطلوب ہوگا لیکن ان کے ہاں سب سے بڑی کتاب "کتاب مقدس" کے لیے بھی یہ اہتمام نہیں ملتا۔ اسی طرح انجیلیں حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض حواریوں، جیسے لوقا، یوحنا، مرقس وغیرہ سے منسوب تو ہیں لیکن ان کے اولین راویوں تک کے اپنے حالات کسی کو معلوم نہیں۔ انجیلوں کی روایت حواریوں سے کس کس نے کی۔ اس کا تو سرے سے تذکرہ نہیں ملتا۔ جن قوموں نے اپنے آسمانی صحیفوں کی حفاظت میں کمزوری دکھائی وہ اپنے رسولوں کے اقوال کی حفاظت کا بھلا کیا اہتمام کرتیں۔

یہاں یہ نکتہ نہایت اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کے طالب علموں کو جملہ رواۃ حدیث کے بارے میں جرح و تعدیل کے لیے بہرحال سلف کی تحقیقات پر ہی قناعت کرنی پڑے گی اور مجرد انہی کی تحقیقات کی کسوٹی پر کسی سند کے راویوں کا درجہ متعین کیا جائے گا۔ چنانچہ اب کسی حدیث کی سند کو متقدمین کی فراہم کردہ انہی معلومات کی روشنی میں جانچا پرکھا جائے گا۔ اس لیے کہ ذرائع تحقیق، مرور زمانہ سے اب معدوم ہو چکے ہیں۔ اس میں ہمارے لیے کوئی نئی رائے قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ ہمارے ان اکابرین فن نے تحقیق کی معراج کی بلندیوں کو چھوا ہے اور انسانی امکان کی حد تک اس فن کی خدمت کی ہے۔

روایت کی جانچ کے لیے سند ایک کسوٹی ہے۔

سند کو کسی حدیث کے صدق و کذب کے فیصلہ میں ایک اہم، بلکہ اولین عامل کی حیثیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث کی تحقیق کے لیے سب سے پہلے اس کی سند ہی پر نظر پڑے گی۔ اور اس کے متن پر غور کرنے سے پہلے اس کی جانچ کرنا پڑے گی۔ اس جائزے کی روشنی میں اس روایت کا درجہ متعین کیا جائے گا۔

سند کی اس اہمیت سے انکار کی کسی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن محدثین کے بعض غالی حامیوں کا یہ خیال ہے کہ کسی حدیث کی صحت کے ثبوت کے لیے مجرد اس کی سند کا علم اصول کے معیار پر پورا ہونا کافی

ہے۔ یعنی ان کے نزدیک صحتِ حدیث کے لیے صرف سند کی صحت اور اس کا قابلِ اعتماد ہونا فیصلہ کن امر ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ یہ غلو پر مبنی اور محض حسنِ ظن ہے۔ یہ سلف کی ساری تحقیقات، جن کا ہم نے اوپر اجمالی خاکہ پیش کیا، کو گہنا دیتا ہے۔ اس لیے اس مسئلے پر ہم ذرا تفصیلی بحث کریں گے۔

سند کے تمام محاسن، لطائف، عظمت، اہمیت اور اس کے مطابق معیاری ہونے کے باوجود اس میں بعض ایسے فطری خلا رہ جاتے ہیں جن کی تلافی کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کی صحت کو جانچنے کے لیے سند کے سوا بعض دوسرے طریقے بھی اختیار کیے جائیں۔ مجرد سند پر اعتبار کر کے کسی روایت کی صحت اور حسن و قبح کے متعلق پوری طرح سے اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو آپ مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہمیں کسی درخت کی تحقیق مقصود ہو تو محض اس کی جڑ کی کیفیت کا مطالعہ کافی نہیں ہوگا، بلکہ جڑ کے علاوہ اس کے تنے، ٹہنیوں، پتّوں، پھل پھول وغیرہ کا بھی مکمل جائزہ لینا پڑے گا۔ تب جا کر اس درخت کے متعلق ہم جامع اور حتمی رائے قائم کر سکیں گے۔

سند کا خلا

سند کی تحقیق میں جو خلا باقی رہ جاتے ہیں وہ معمولی غور و تدبر سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً پہلا خلا اس میں یہ ہے کہ اپنے تعلق اور علاقہ سے بعید ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں کے عقیدہ و کردار، ان کے علم و عمل اور ان کے تعلقات و معاملات کی ایسی تحقیق کہ ان کے متعلق یہ طے کیا جا سکے کہ علمِ رسول کے حمل و نقل کے باب میں ان پر اطمینان کیا جا سکتا ہے یا نہیں کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بے شک محدثین نے اس میدان میں بڑی جانفشانیاں کی ہیں، لیکن یہ کام ہے بہت مشکل۔ اس نوعیت کی تحقیق اگر ہم اپنے گاؤں یا قصبہ یا شہر کے لوگوں کے بارے میں کرنا چاہیں تو چنداں آسان نہیں چہ جائیکہ ہزاروں میل دور کے لوگوں کے بارے میں جو مختلف ادوار میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی تحقیق کے بارے میں محتاط رائے یہ ہو سکتی ہے کہ فی الجملہ ہمیں ان لوگوں کے کوائف معلوم ہیں اور اب ان کی شخصیات مجہول نہیں رہیں۔ ان کے بارے میں کسی رائے کو حتمی یا قطعی کہنا مشکل اور غالباً اپنی معلومات پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہے۔ آدمی کے کردار و اخلاق کے معاملہ میں قابلِ اطمینان رائے اسی صورت میں قائم کی جا سکتی ہے جب معاملات میں اس سے عملاً سابقہ پڑا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحبِ علم و فراست کی رائے یہی ہے۔ ان کی

نسبت مشہور ہے کہ ایک صاحب نے ان کے سامنے کسی دوسرے شخص کی تعریف کی تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ تمہارا اس کے ساتھ کبھی پڑوس رہا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، تب انھوں نے پوچھا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی تجارتی سفر کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تب تمہیں اس کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی آدمی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ نہ کرے، اس کے ساتھ کسی کاروبار یا تجارت میں شریک نہ رہا ہو، اس کے ساتھ سفر نہ کیا ہو، اس کا پڑوس نہ رہا ہو، مسجد میں ایک دوسرے سے میل ملاپ نہ رہا ہو، دیگر دنیاوی معاملات میں ایک دوسرے سے تعاون نہ رہا ہو، ربط ضبط کا ماحول نہ رہا ہو تو اس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ آسانی کے ساتھ رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ان حالات میں بعض اوقات ایک ذہین و فطین آدمی بھی دھوکا کھا سکتا ہے۔

سند کا دوسرا خلا

سند کی تحقیق میں دوسرا خلا جرح و تعدیل کے کام کی نزاکت سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر محقق یہ نہیں جانتا کہ جرح کس چیز پر ہونی چاہیے اور تعدیل کس چیز کی ہونی چاہیے یعنی یہ جاننا کہ کیا باتیں جرح کے حکم میں داخل ہیں اور کیا باتیں تعدیل کے مقتضیات میں سے ہیں ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ کردار کی اساسات کیا ہیں، بدکرداری کی بنیادیں کیا ہیں۔ یہ چیزیں اتنی آسان نہیں کہ ہر خاص و عام اس کا کما حقہ ادراک کر سکے اس بے خبری کی مثالیں ماضی میں رہی ہیں اور خود مشائخ نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ موجودہ دور کے غلوئے عقیدت و نفرت سے اس شکل کا ایک سرسری اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جرح و تعدیل کا کام علم، فقاہت، بصیرت، تجربے اور معقولیت کا متقاضی ہے۔ انسان ہمیشہ انسان ہی رہے ہیں، فرشتے نہیں رہے ہیں۔ فن اسماء الرجال کے ماہرین کا معیار اخلاق، بصیرت و بصارت بلاشبہ بہت اونچا رہا ہے لیکن وہ بہرحال آدمی ہی تھے۔ رواۃ حدیث کے متعلق ان کی فراہم کردہ معلومات اور ان پر مبنی آراء عام انسانی جبلت میں موجود تعصب کے شائبہ سے پاک نہیں ہو سکتیں جو حق یا مخالفت دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

جرح و تعدیل کے فن کے مقتضیات میں سے ہے کہ کسی کے متعلق معلومات فراہم کرنے والا شخص جچا تلا ہونا چاہیے اور اس سے زیادہ جچا تلا متوازن اور زیرک شخص کو ہونا چاہیے جو جرح و تعدیل کرتا ہے۔

ہمارے نزدیک جرح و تعدیل کے کام کی مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے محتاط طرزِ عمل یہ ہے کہ سلسلۂ روایت یعنی سند کے راویوں کے متعلق اس فن کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں فی الجملہ ایک رائے قائم کی جائے لیکن اس رائے کو قطعیت کا یہ رنگ نہیں دیا جا سکتا کہ کسی حدیث کی صحت کا معیار اسی رائے کو ٹھیرا لیا جائے۔

سند کا تیسرا خلا

سند کی تحقیق کا تیسرا خلا یہ ہے کہ ہمارے ائمہ نے اہلِ بدعت، خصوصاً شیعہ اور روافض سے روایات لینے میں بڑی سماحت برتی ہے۔ یہ لوگ دوسرے معاملات میں تو بڑے بیدار ثابت ہوئے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں انھوں نے واقعی چشم پوشی سے کام لیا۔ امام مالک علیہ الرحمۃ سے متعلق تو بے شک اس معاملے میں احتیاط منقول ہے لیکن دوسرے تمام ائمہ: امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابو حنیفہ، قاضی ابو یوسف، امام مسلم علیہم الرحمۃ وغیرہ کے متعلق صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اہلِ بدعت سے روایات لینے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔ بس اتنی احتیاط فرماتے تھے کہ ان کے خیال میں وہ اپنی بدعت کا باقاعدہ داعی نہ ہو۔ گویا ان کے نزدیک مبتدع سے روایت لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ از روئے قرآن، از روئے حدیث اور حدیث کے مجموعی مزاج کے تقاضے کے لحاظ سے مجرد اہلِ بدعت کے گروہ سے ہونا ضعف کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ راوی اپنی بدعت کا داعی نہ رہا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تشیع، رفض، باطنیت اور اس قسم کے دوسرے مذاہب اصل دین سے انحراف پر قائم ہیں۔ اپنے مذہب کو ثابت کرنے کی خاطر جب تک یہ اصل دین میں جھوٹ نہ بولیں تو اپنا گروہی فریضہ ادا نہیں کرتے۔ انھیں اپنی بدعت کے حق میں دلیل فراہم کرنے کے لیے روایات کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اور ان کے لیے روایات میں خیانت کے سوا کوئی چارہ نہیں کیوں کہ ان کے مذاہب بہرحال بدعت ہی کے اوپر قائم ہیں۔ کسی ماثور حقیقت کے اوپر قائم نہیں۔ سوادِ امت سے ان فرقوں کا اختلاف کسی ایک آدھ آیت یا چند حدیثوں کی توجیہ میں نہیں ہے۔ بلکہ بیشتر دین کے ماخذ میں اختلاف ہے۔ جس سے ان کا مذہب الگ ہو گیا ہے۔ اب اگر کسی کو ان فرقوں کے ساتھ صلحِ کل کے فلسفے کو نبھانا اور بھائی چارگی اور دوستی قائم کرنا ہو تو وہ ضرور ایسا کرے۔ لیکن دین کے معاملے میں اس باطل فلسفہ کو راہ نہیں دی جا سکتی۔ ہمارے نزدیک اہلِ بدعت کی روایات قبول کرنے کی یہ گنجائش فتنوں کا دروازہ کھولنے کے مترادف

ہے اور ماضی میں اس کا باعث بنی ہے۔ مجرد کسی کا مبتدع ہونا اس کے ساقط الروایۃ ہونے کے لیے
کافی ہے اور ان فرقوں میں سے کسی کی روایت قابل قبول نہیں ہوتی چاہیے خواہ وہ قسم کھا کے روایت
کرے کہ میں سچ ہی روایت کروں گا۔ ہمارے نزدیک یہی صحیح مسلک ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہے۔

سند کا چوتھا خلا

سند کی تحقیق میں چوتھا خلا یہ ہے کہ ہمارے محدثین نے حلال و حرام کے متعلق حدیثیں قبول کرنے
میں فی الجملہ احتیاط برتی ہے لیکن ترغیب و ترہیب اور فضائل وغیرہ کی روایات میں انھوں نے عملاً
تساہل برتا ہے۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ میں امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

اذا روینا عن رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم فی الحلال والحرام
والسنن والاحکام تشددنا
فی الاسانید واذا روینا عن النبی
صلی اللہ علیہ وسلم فی فضائل
الاعمال وما لا یضع حکما ولا
یرفعہ فی الاسانید[1]

جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
حلال و حرام اور سنن و احکام کے بارے میں
روایت کرتے ہیں تو سند کے معاملے میں بڑی
احتیاط برتتے ہیں لیکن اگر معاملہ فضائل
اعمال وغیرہ کا ہو جس سے نہ کوئی حکم قائم
ہوتا ہو نہ کوئی حکم منسوخ ہوتا ہو تو اس
کی سند میں ہم تساہل برتتے ہیں۔

گویا محدثین نے سند کی صحت کو صرف ان روایات کے ضمن میں درخور اعتنا سمجھا جن میں کسی
نوعیت کے احکام تھے ترغیب و ترہیب کی کمزور روایات کو مفید سمجھا گیا کہ ان کے باعث لوگ نیکی کی طرف
رجوع کریں۔ فضائل کی روایات سے بھی نیکی کے عمل کو مہمیز ملتی تھی۔ اس لیے ان کو سند کے ضعف کے باوجود
کتابوں میں جگہ دے دی گئی لیکن ہمیں یہ جائزہ لینا چاہیے کہ آیا محدثین ایسا کرنے میں حق بجانب تھے یا نہیں
نہایت عمیق مطالعے اور غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک اہل تصوف کے اصل
دین سے انحراف پر مبنی خیالات اور تصورات اعمال کا تعلق ہے یہ بیشتر محدثین کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔
انھوں نے کمزور روایات کا ایک دفتر کھول دیا جس سے من پسند تصورات دین نے جنم لے لیا۔ گویا معاملہ
اصلاح حال ہی تک محدود نہ رہا، بلکہ ان روایات سے عقائد بھی متاثر ہوئے اور یہ لے اس قدر بڑھی کہ

---

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ۔ باب التشدد فی احادیث الاحکام والتجوز فی فضائل القرآن صفحہ ۱۳۴

دین کے نام سے نئے عقائد، نئے اعمال اور نئے اخلاق اختیار کر لیے گئے۔ جب اہل تصوف کے اس ناحق تجاوز کو محدثین نے ان کی سراسر زیادتی قرار دیا اور ان کے خیالات پر گرفت کی تو معلوم ہوا کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اس لیے جواب میں انہیں یہ طعنہ دیا گیا کہ محدثین کا کام تو راویوں کی غیبت کرنا ہے اور ان کا جرح و تعدیل کا کام اس حرام کام کے ارتکاب پر مبنی ہے۔ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل تصوف نے محدثین کرام کے انتباہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس طرح محدثین کا یہ خیال کہ اگر وہ حلال و حرام اور سنن و احکام کے بارے میں احتیاط کریں گے اور ترغیب و ترہیب اور فضائل اعمال وغیرہ سے متعلق روایات میں تساہل برتیں گے تو امت پر اس کے اثرات نہ پڑیں گے، بالکل غلط بلکہ مہلک ثابت ہوا۔

فی الحقیقت روایات میں اس تساہل کے نتیجے میں کمزور روایات کی بھرمار تصوف کی کتابوں میں ہو گئی ہے اور ان سے دین کا تصور جس طرح مسخ ہوا ہے وہ مخفی نہیں ہے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان کی بدولت دین کا ایک متوازی تصور قائم ہو گیا جس کی بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عمل میں نہیں ملتی۔

خلاصۂ بحث

کسی حدیث کے صدق و کذب کے فیصلہ میں سند کے ایک عامل ہونے سے انکار کی گنجائش تو کسی کے لیے نہیں ہے لیکن اس کے لطائف محاسن عظمت اور اس کے مطابق معیار ہونے کے باوجود سند کی تحقیق میں بعض ایسے خلا رہ گئے ہیں جن کے باعث سند کو روایت کی صحت کے جانچنے کا واحد ذریعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ ضروری ہے کہ تحقیق حق کے لیے آج بھی نہ صرف سند کو مزید پرکھنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس کے علاوہ وہ تمام فطری طریقے استعمال کیے جائیں جن سے روایت کی حیثیت متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہو۔

بشکریہ 'تدبر' لاہور، پاکستان

کارکنوں کی ہمہ جہتی تربیت کا فطری طریقہ

(قرآن وسنت کی روشنی میں)

(جناب متین طارق باغ پتی)

توبہ وانابت

اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آدمی کے ساتھ اس کا نفس اور شیطان لگا ہوا ہے۔ کام کرنے کے دوران میں کبھی کبھی بھول چوک بھی ہو جاتی ہے اس لیے ہر وقت، ہر آن ہر لمحہ اللہ وحدہٗ لاشریک سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے اور اس کے سامنے گڑگڑاتے رہنا چاہیے کیونکہ بندہ، بندہ ہے اور بندے کا قدم بشری کمزوریوں کے باعث ڈگمگا جاتا ہے لیکن بندے کی شان یہ ہے کہ وہ فوراً پشیمان ہوتا ہے، اپنے مالک کے سامنے گریہ وزاری کرتا ہے اور اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے۔

دراصل توبہ وانابت کی عادت داعیِ حق کی لازمی صفت ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے نیک بندوں کو اس کی ترغیب دیتے ہوئے قرآن پاک میں فرمایا ہے:-

"اور توبہ کرو اللہ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو شاید کہ تم فلاح پا سکو۔"

اور دوسری جگہ فرمایا:-

"اے ایمان والو! اللہ کی طرف پلٹو یعنی اس سے بخشش چاہو اور سچی توبہ کرو۔"

افضل الانبیاء جناب محمد رسول اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس سلسلے میں ہر وقت اپنے سامنے رکھنے کے لائق ہے۔

• حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ کی قسم میں اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں ہر روز ستر بار سے بھی زیادہ۔"

دراصل جو لوگ اپنے رب کے خوف سے اندیشہ رکھتے ہیں وہ ہر وقت توبہ و استغفار کرتے ہیں خشیتِ الٰہی

ان کے دل پر چھائی رہتی ہے اور وہ اپنی دعاؤں میں اللہ سے پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ چنانچہ

• حضرت عائشہ رض سے روایت ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں ان کاموں کے شر سے جو میں نے کیے اور ان کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کیے یعنی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا تو اس کے برے نتیجے سے پناہ مانگتا ہوں اور اگر کوئی کام مجھے کرنا چاہیے تھا اور میں نے اسے نہیں کیا تو اس کی کوتاہی سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو کام نہ کرنا چاہیے وہ کبھی میں کر گزروں۔ (مسلم)

• حضرت ابن عمر رض کی روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی تھی کہ خدایا میں پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تیری نعمت جو مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے اور جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نہ رہے اور تیرا غضب یکایک ٹوٹ پڑے اور پناہ مانگتا ہوں تیری ناراضی سے۔ (مسلم)

مال دولت، روپیہ پیسہ، بیوی بچے، گھر بار، کھیت، باغات، وقت، فرصت صلاحیت ذرائع ابلاغ کتنی نعمتیں انسان کے چاروں طرف بکھری پڑی ہیں۔ جس انسان مایا کے جال میں پھنس کر عقل و شعور کھو بیٹھتا ہے اور اپنے مستقبل کی ڈور اپنے نفس کے حوالے کر کے بگٹٹ چل پڑتا ہے دنیا کی محبت اور یہاں کے آسائش کی فکر انسان کے اوقات اور اس کی صلاحیتوں کو اس سے چھین لیتی ہے اور اسے اس بات کا موقع نہیں دیتی کہ وہ اللہ کے دین اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں پر غور کرے کیونکہ اس سے اس کے نفس کے آرام میں خلل پڑتا ہے لیکن خداوند تعالےٰ بے حد غیور ہے وہ ایسے شخص ایسی قوم سے منھ پھیر لیتا ہے اور اعلان کر دیتا ہے۔ ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباءوا بغضب من اللہ۔

یہ تاریخی واقعہ ہم سب جانتے ہیں کہ قوم بنی اسرائیل کو اللہ نے نور نبوت سے سرفراز کیا تھا لیکن اللہ سے روگردانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت سے پناہ مانگی ہے اور دعوت حق دینے والوں کو بھی ترغیب دلائی ہے کہ وہ اللہ سے پناہ مانگتے رہیں چنانچہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضور مجھے کوئی دعا بتائیے۔ آپ نے فرمایا۔ کہو:۔

"خدایا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کے شر سے اور اپنی شہوت کے شر سے۔" (ترمذی)
اسی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں جس طرح اعمال صالحہ سے مزین تھیں اس سے بڑھ کر اللہ کا خوف ان کے سینے میں جاگزیں تھا۔
واقعات میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے "بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا" تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور شدت غم سے آپ بیمار پڑ گئے۔
حضرت عثمانؓ جب قبرستان کے پاس ہو کر گذرتے تھے تو بے اختیار رو پڑتے۔ یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہو جاتی۔"
• حضرت ابو درداءؓ فرمایا کرتے تھے کہ "روز جزا کو سب سے زیادہ فکر مجھے اپنے بارے میں لاحق ہے وہ یہ کہ مجھ سے پوچھا جائے کہ:۔ " اے ابودرداء تجھے علم سے نوازا گیا تھا تو نے جانتے ہوئے کیا عمل کیا؟"
یہ سوال ہم سب سے ہو سکتا ہے بلکہ ہو گا کہ:۔
"تمہیں زندگی دی گئی تھی اسے کس کام میں کھپایا تمہیں جوانی بخشی گئی تھی اسے کس چیز میں بسر کیا تمہیں دولت عطا کی گئی تھی اسے کیسے خرچ کیا اور تمہیں نور علم سے نوازا گیا تھا اس کے مطابق کہاں تک عمل کیا یعنی یہ صلاحیتیں، یہ قوتیں حق کی راہ میں لگائی گئیں یا باطل کی راہ میں۔"

حاصل کلام

آخر میں یہ عرض اور کر دوں کہ ہمیں نظم و ضبط کی پابندی پورے طریقے سے کرنی چاہیے۔ ایک داعیٔ حق ہونے کی حیثیت میں ہم لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ ہماری زندگی اس طرح بسر ہو جس طرح ہمارا مالک چاہتا ہے ہمارے لیے اپنے خدا کے علاوہ اور کسی چیز میں کوئی کشش نہ ہو۔ خدا کا دین ہمارا محبوب دین ہو۔ ہم اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے خدا کے سچے غلام ہوں۔ اس کے دین کی اقامت کے لیے ہمارے دل میں تڑپ ہو اور اس کے رسول کی سچی پیروی ہماری زندگی کا مطلوب و مقصود ہو اور ہم انتہائی مصروفیت میں انتہائی غم میں انتہائی خوشی میں کسی بھی وقت اس مقصد کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیں کیونکہ یہ مقصد ہماری زندگی کا، ہماری جدوجہد کا، ہماری ساری کوششوں کا نصب العین

ہے۔ نصب العین کہتے ہی ہیں۔ اس مقصد کو جس کے لیے آدمی اپنا سب کچھ قربان کرنے کا فیصلہ کرے جس کی خاطر انسان اپنے سارے دوسرے مقاصد سارے مفادات، سارے رشتے سارے تعلقات تج دینے کو تیار ہو جائے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں وہی شخص وہی قوم وہی ملت کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے جو اپنے نصب العین کی طرف والہانہ بڑھتی ہے

اب میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ کام جو ہم کرنے اٹھے ہیں یہ بہت بلند ہے بڑا عظیم ہے اور بے انتہا سعادت وبرکت والا ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ کسی کو ایک کتاب دے دی یا کہیں جا کر تقریر کر دی، راستہ میں کوئی مسلمان مل گیا تو اس سے کلمہ سن لیا اور بس سمجھ لیا کہ ہمارا کام ختم ہو گیا اقامت دین کا فرض جو ہم پر ڈالا گیا ہے وہ پورا ہو گیا۔ میں آپ کی خوش فہمی کو دور کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی دعوت کا کام اس سے بہت بلند ہے یہ بڑی حکمت چاہتا ہے۔ بڑی قربانی چاہتا ہے وقت کی بھی، پیسے کی بھی، جان کی بھی۔

اور اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھیے کہ ہر انسان کو اللہ اس کام کے لیے نہیں چنتا۔ وہ بڑے سعادت مند لوگ ہوتے ہیں اور بڑے نصیب والے لوگ ہوتے ہیں اور بڑے اونچے لوگ ہوتے ہیں جو قربانیوں کے لیے چنے جاتے ہیں اس موقع پر آپ اپنی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھیے۔ یہ لوگ اپنی عزیز ترین پونجی اپنی ہر متاع عزیز اپنی ہر محبوب سے محبوب چیز اور اثاثہ حیات کو چھوڑ کر کس قدر خوش خوش ہجرت کر کے مدینہ پہنچے۔ ابو سلمہؓ کے دل کو اہل وعیال کی محبت کچھ کم لگا رہی ہوگی۔ حضرت صہیبؓ نے خون پسینہ ایک کر کے جو دولت کمائی تھی وہ ان کے دل کو تڑپا رہی ہوگی۔ اپنے گھر اپنے دیار اپنے وطن کی مٹی سے انسان کو پیار ہوتا ہے مگر صحابہ کرامؓ نے رضائے الٰہی کے لیے سب کچھ مشرکین کے حوالے کر دیا حتیٰ کہ جب وقت آیا تو جان سے بھی گریز نہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہر وقت ایک جدوجہد ہر لمحہ ایک لگن ہر سانس اسلام کی طرف پیش قدمی ہو۔ ہماری موت اور زندگی ہماری معاشرت اور معیشت اور جملہ معاملات اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوں اور ہم سنت رسول کے چلتے پھرتے نمونہ ہوں۔ ہماری صفت یہ ہو کہ ہم تائب ہوں، قائم اللیل ہوں، صائم النہار ہوں اور الراکعین والساجدین کی مکمل تصویر ہوں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

انبیائے کرامؑ کی اعجاز بیانی

(عبید اللہ فہد فلاحی علی گڑھ)

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ اپنی قوم کو دعوت اس زبان میں دیتے ہیں جو مقصد و مدعا کو زیادہ خوبی و وضاحت کے ساتھ قوم کے ہر حلقہ تک پہنچا سکے۔ اس میں ابہام و اجمال غیر ضروری طوالت، استعارات و تشبیہات کی کثرت اور رکاکت و ابتذال سے سخت اجتناب کیا گیا ہے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان، بے تکلف استعارے، شیریں و موثر لب و لہجہ، دل سوزی و ترحم، سادگی و صفائی سے مزین کلام جس کا ایک ایک لفظ دل میں اتر جائے۔ دماغ میں ہیجان پیدا کر دے اور کٹر سے کٹر مخالف اور دشمن خدا و رسول کو چت کر دے۔ وقت کے مختلف اسالیب میں سے وہی اسلوب استعمال کرتے ہیں جو سب سے زیادہ موزوں، سب سے زیادہ باوقار، جذبات کو سب سے زیادہ اپیل کرنے والا، دل و دماغ کے تاروں کو جھنجھوڑ دینے والا ہوتا ہے اور ان سب چیزوں سے مل کر وہ ادب وجود میں آتا ہے جس کے آگے وقت کے ملک الشعراء گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ اس کی بلاغت اور زبان آوری قوموں کی زندگیاں بدل دیتی ہے اور فکر و نظر اور جہد و عمل میں انقلاب برپا کر دیتی ہے[1]

ہر نبی لسان مبین میں دعوت دیتا اور شیریں و مؤثر لہجے میں اپنی بات عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تبیین و توضیح اور تبلیغ و ابلاغ اس کا نصب العین ہوتا ہے[2]۔ وہ اس کے لیے خدا سے دعا بھی کرتا ہے اور اس خاص صفت کی کمی پر مضطرب اور بے چین بھی رہتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام زبان آور خطیب نہ تھے۔ جب ان پر نبوت کا بار گراں ڈالا گیا تو انہیں اپنی اس کمی کا احساس ہوا اور انھوں نے شرح صدر اور اظہار بیان کی قوت بخشے جانے کی

نہایت ادب و تواضع کے ساتھ دعا فرمائی ہے

"اے میرے رب میرے سینے کو میرے لیے کھول دے اور میری فہم کو آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں (طٰہٰ: ۲۵ تا ۲۸)

حضرت موسےٰؑ نے حضرت ہارونؑ کو اپنا شریک کار بنائے جانے کی درخواست بھی کی جو نہایت زوردار خطیب تھے۔ چنانچہ سورۂ قصص میں ان کی دعا یوں مذکور ہے :-

اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے تو اس کو ایک معاون کی حیثیت سے میرے ساتھ کر دیجیے کہ وہ تائید کرے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ میری تکذیب کریں گے۔

(قصص :- ۳۳-۳۴)

دراصل ایک نبی کو خدا دشمن اور منکر رسالت ماحول میں توحید کا آوازہ بلند کرنا ہوتا ہے۔ پورا معاشرہ اپنے مفادات پر ضرب پڑنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ تکذیب پر تل جاتا ہے بلکہ اس کی جان کا دشمن بھی ہو جاتا ہے۔ اس وقت نبی کا ارمان یہ ہوتا ہے کہ وہ مخالفوں کے دلوں میں اتر جائے اپنی دعوت ان کے ذہنوں میں راسخ کر دے، دین کے حقائق اور اسرار کو کھول کھول کر بیان کر دے تاکہ تمام ہی افراد پر حجت قائم ہو سکے۔ اس غرض کے لیے لسان مبین، فصیح و شستہ اسلوب اور شیریں و مؤثر لہجہ درکار ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ انبیاء کرامؑ کو اس صفت سے مزین فرماتا ہے تاکہ وہ تبلیغ کا حق ادا کر سکیں اور "بلاغ مبین" کی ذمہ داری نبھا سکیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کا طرز استدراج، حضرت عیسےٰؑ کی تمثیلات، حضرت یوسفؑ کی تاویل اور احادیث۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

استدراج ابراہیمؑ

حضرت ابراہیمؑ کی قوم بڑی مناظرہ باز قوم تھی وہ فوراً ہر چھوٹی بڑی بات پر بحث و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتی تھی۔ اسی وجہ سے آپ نے بحث و استدلال میں استدراج کا طریقہ اختیار کیا یعنی آپ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آ سکتا ہے۔ آخر کار وہ مجبور ہو کر چاروں شانے چت ہو جاتا۔ اس کی ایک مثال سورۂ انبیاء میں موجود ہے۔ انھوں نے ایک دن موقع نکال کر تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے

کر دیا، صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا اور جب نوبت ان سے باز پرس کی آئی تو کہہ دیا کہ یہ حرکت تو ان بڑے صاحب کی معلوم ہوتی ہے اور مجھ سے پوچھنے کے بجائے خود ان مظلوموں ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ اگر وہ بولتے ہیں تو اپنی داستان غم خود ہی سنا دیں گے کہ یہ مصیبت کس کی لائی ہوئی ہے۔ اس جواب کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو اس مقام پر لا کھڑا کیا جہاں اعتراف شکست کے سوا اور کوئی راہ ان کے لیے باقی ہی نہیں رہ گئی:۔

"انھوں نے پوچھا کہ ابراہیم! کیا یہ حرکت ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بلکہ ان کے اس بڑے نے یہ حرکت کی ہے۔ تو انہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔ تو ان کو ذرا تنبہ ہوا اور آپس میں بولے کہ بلا شبہ تم ہی ناحق پر ہو۔ پھر اوندھے ہو گئے۔ بولے کہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ اس نے کہا۔ کیا خدا کے ماسوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تم کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکیں نہ کوئی ضرر۔ تم پر تف ہے اور ان چیزوں پر بھی جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو۔ کیا تم لوگ سمجھتے نہیں"

(انبیاء: ۶۲ تا ۶۷)

استدراج کا یہی طریقہ اس وقت اختیار فرمایا جب قوم کے سامنے شرک سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور کامل توحید کی انہیں دعوت دی۔[۵] پہلے تارے کو دیکھا تو اپنے آپ سے مخاطب ہو کر اس طرح بولے کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے کہ ہاں بھائی یہ میرا رب ہے لیکن جب ستارہ ڈوب گیا تو اپنے آپ کو مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ میں ڈوب جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس طرح چاند اور سورج کے بارے میں بھی یہی بات کہی لیکن آخر میں قوم کو اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ یہ تمام باطل معبود ہیں کیونکہ یہ سب ڈوب جاتے ہیں۔ معبود برحق تو وہ ہے جو زندہ ہے، قیوم ہے۔ اسے کبھی فنا نہیں وہ ازل سے ہے ابد تک رہے گا۔

"پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا تو اس نے ایک تارے کو دیکھا۔ بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا۔ اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا۔ بولا یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا بولا۔ اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر

جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھیراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رخ یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔"

(انعام: ۷۶ تا ۷۹)

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ اور ایک بادشاہ کا مناظرہ بیان ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے مخاطب کی ہٹ دھرمی اور اس کے عناد کو محسوس کر کے اس مرض کو مزید ابھرنے کا موقع دینے کے بجائے اس سے بچنے کی پوری کوشش کی بلکہ بات کو دوسرے پہلو سے کچھ اس انداز میں پیش کر دیا کہ مخالف ہکا بکا رہ گیا۔ قرآن کہتا ہے:

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا۔ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیمؑ کا رب کون ہے اور اس بنا پر کہ اس کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا۔ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔" ابراہیمؑ نے کہا۔ اچھا۔ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے ذرا مغرب سے نکال لا۔ یہ سنکر وہ منکر حق ششدر رہ گیا مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔ (بقرہ: ۲۵۸)

نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی، قدیم صحیفوں اور قرآن دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سورج کو سب سے بڑے دیوتا کا درجہ حاصل تھا اس وجہ سے نمرود لازماً سورج دیوتا کا سب سے بڑا اوتار مانا جاتا رہا ہوگا۔ اس طرح ہندوستان، چین اور مصر وغیرہ کے قدیم بادشاہوں کی طرح نمرود عراقی بادشاہ کو بھی سیاسی اور مذہبی دونوں ہی قسم کے اقتدار حاصل تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے جواب میں سب سے پہلے یہ کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے لیکن نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس سمایا ہوا تھا اس وجہ سے اس نے اس راسخ حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر تو اختیار میں بھی رکھتا ہوں جس کو چاہوں بخش دوں اور جس کو چاہوں قتل کر دوں جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ مخالف کٹ حجتی اور مناظرہ بازی پر اتر آیا ہے تو کسی خاص پہلو پر الجھنے کے

بجائے رب کی ایک دوسری صفت بیان کر دی جس نے مخالف کی راہ بالکل مسدود کر دی اور حجت
ابراہیمی کے اس وار پر نمرود بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ فرمایا کہ اچھا اگر یہ بات ہے تو میرا رب سورج کو مشرق
سے نکالتا ہے تم اس کو ایک دن ذرا مغرب سے نکال کر دکھا دو۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس جواب پر وہ
کٹ کر رہ گیا۔ یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر
فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبود اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبود اعظم کا مظہر
بنائے بیٹھا تھا۔[1]

حضرت ابراہیمؑ کے اس طرزِ استدلال اور مجادلہ کی ایک مثال وہ ہے جس کی قرآن میں تعریف
کی گئی ہے[2] آپ نے قوم لوط کے بارے میں جو مجادلہ اللہ تعالیٰ سے فرمایا تھا وہ ان کی دردمندی طریقہ
استدراج اور طرزِ استدلال کا کامل نمونہ تھا۔ قرآن میں اس مجادلہ کی تفصیل نہیں ملتی اس وجہ سے ہم
توریت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ توریت کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے ان فرشتوں سے
جو قوم لوط کے لیے عذاب لیکر آئے تھے، مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی۔

"تب ابراہام نے نزدیک جا کر کہا۔ تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر
میں پچاس راستباز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر
جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ
مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف
کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ مجھے سدوم میں پچاس راستباز
ملیں تو ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہیم نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے
میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں راکھ اور خاک ہوں شاید پچاس
راستبازوں میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست
کرے گا۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر
اس نے اس سے کہا شاید وہاں چالیس ملیں تب اس نے کہا۔ میں ان چالیس کی خاطر
بھی یہ نہیں کروں گا۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔
پھر اس نے کہا۔ دیکھیے میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی شاید وہاں بیس ملیں

اس نے کہا۔ میں اسے بیس کی خاطر بھی نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابراہام سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابراہام اپنے مکان کو لوٹا۔"

(پیدائش باب ۱۸ — ۲۳-۳۳)

حضرت ابراہیمؑ کا یہی وہ طریقہ استدلال تھا جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:-

وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ — یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے بخشی۔ (انعام: ۸۳)

(حوالہ جات)

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دعوت دین اور اس کا طریق کار۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

۲۔ سورۂ نحل میں ہے۔ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۴۴) اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا جاتا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔" اسی سورہ کی آیت ۳۵ میں ہے۔ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (تو کیا رسولوں پر صاف صاف بات پہنچا دینے کے سوا اور بھی کوئی ذمہ داری ہے؟)

۳۔ قرآن سے یہ بات کہیں نہیں معلوم ہوتی کہ حضرت موسیٰؑ کی زبان میں لکنت تھی۔ لکنت کی روایت تو صرف توریت میں ہے اور وہیں سے ہماری تفسیر کی کتابوں میں آئی۔ یہاں وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي میں جس بات کی درخواست ہے وہ لکنت دور کرنے کی نہیں۔ اظہار و بیان کی وہ صلاحیت و قابلیت بخشے جانے کی درخواست ہے جو فریضہ رسالت و نبوت کی ادائیگی کے لیے ضروری تھا اور یہ درخواست نہایت متواضعانہ اسلوب و الفاظ میں ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے دل کو تسخیر کرنے والا ایک جادو بیان خطیب بنا دے بلکہ نہایت خاکسارانہ انداز میں فرمایا کہ میری زبان کو وہ روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ یہ دعا کرنے کے لیے لکنت کا مریض ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک قادر الکلام بھی یہ دعا کرتا ہے اور کرنی چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ انبیاءؑ کو اللہ تعالیٰ جس طرح اخلاقی عیوب سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح خلقی نقائص سے بھی محفوظ رکھتا ہے سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والی بات یہ ہے کہ

قرآن میں اس روایت کی تائید کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ چنانچہ فرعون نے موسیٰؑ کو ایک طرف غلام قوم کا فرد ہونے کا طعنہ دیا تھا تو دوسری طرف آپ پر یہ الزام لگایا تھا کہ یہ خطابت پر قادر نہیں ہے تو میرے مقابلے میں یہ سیادت کا مدعی کیسے ہو سکتا ہے؟ (زخرف: ۵۲)

تفصیل کے لیے دیکھیے۔ تدبر قرآن جلد چہارم ص ۷۸، ۷۹ نیز جلد ششم ص: ۲۳۷، ۲۳۸)

(۴) اسالیب القرآن' معلم حمید الدین فراہی جلد چہارم از مولانا بدر الدین اصلاحی طبع اول ۱۳۸۹ھ

(۵) تدبر قرآن جلد دوم ص ۴۷۴، نیز جامعۃ الامام محمد بن سعود کا آرگن هُنا لا سبیلی ۱۹۸۲ء مضمون اسالیب الدعوۃ فی القرآن ص ۲۶۷ - ۲۶۹

(۶) ایضاً جلد اول ص ۲۵۶

(۷) سورۂ ہود میں فرمایا ہے: فلما ذھب عن ابرٰھیم الروع وجاءتہ البشریٰ یجادلنا فی قوم لوط ان ابرٰھیم لحلیم اوّاہ منیب (ہود: ۷۴، ۷۵) یعنی جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور (اولاد کی بشارت سے) اس کا دل خوش ہو گیا تو اس نے قوم لوط کے معاملے میں ہم سے جھگڑا شروع کیا حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا

(بقیہ "تدبر قرآن" صفحہ ۱۱ سے آگے)

پرندے کبھی نہیں آ سکتے۔ بغیر پلے ہوئے پرندے نہ پہلے کسی اجنبی آواز پر آئے ہیں نہ آئندہ کبھی آئیں گے ابراہیم علیہ السلام بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ دوسرے اجنبی پرندے ان کے بلانے پر کبھی نہیں آ سکتے۔

دوسری بات جو انھوں نے کہی ہے وہ یہ کہ "اگر ایک ایک پرندے کو زندہ الگ الگ پہاڑوں پر رکھوا دینا مقصود ہوتا تو اس مفہوم کے لیے زبان کا یہ اسلوب صحیح نہیں ہے۔ عربی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اسلوب اس سے مختلف ہوگا۔ گزارش یہ ہے کہ وہ کیا اسلوب ہے مولانا کے ذہن میں جسے انھوں نے چھپا رکھا ہے اسے یہاں بیان کیوں نہیں فرمایا۔ کچھ دوسرے بھی لوگ عربی کے اسالیب سے کچھ نہ کچھ واقف ہیں، انھیں اندازہ ہوتا کہ مولانا نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جو اسلوب استعمال کیا ہے وہ کیا ہے اور اس میں کتنی طاقت ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؓ کی حضرت حسنؓ کو وصیت

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد معرکۂ بدر و حنین اور احد، خیبر اور خندق کی لڑائیوں میں نمایاں رول ادا کرنے والے چوتھے خلیفہ راشد نے جنگ جمل میں بصریوں کی شورشیں فرو کیں۔ معرکہ صفین میں خوارج کا فتنہ سر نہ اٹھاتا تو بنو امیہ کی بغاوت کا سر ہمیشہ کے لیے کچل دیتے۔ خلافت راشدہ کے خلاف آپ کے زمانے میں جو سیاسی فضا اور قرآن مجید کے خلاف سلطانیت کی جو ریشہ دوانیاں شروع ہو چکی تھیں انہیں ہمیشہ کے لیے نابود کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک خارجی کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جنگ صفین سے واپس ہوتے ہوئے جب حاضرین پہنچے تو وہاں اپنے بیٹے حضرت حسنؓ کے نام ایسی وصیتیں قلمبند فرمائیں جن کا ایک ایک حرف آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس میں تجربہ کی گہرائی اور مشاہدے کی پختگی سب کچھ موجود ہے۔ شرح نہج البلاغۃ کا مل مولفہ شیخ محمد عبدہ مصری کے حوالے سے ہدیہ ناظرین ہے۔

"اس باپ کی طرف سے جو فانی ہے۔ مصائب زمانہ کا معترف ہے جس کی عمر ڈھل چکی ہے جس نے زمانے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے جس کی نگاہوں میں دنیا مذموم ہے۔ جو مردوں کی بستی کا باشندہ ہے جسے کل یہاں سے کوچ کر کے چلے جانا ہے۔ اس بیٹے کے نام جو نا قابل ادراک کا طالب، ہلاک ہونے والوں کا ہم نوالہ، نشانۂ امراض، زمانے کا مرہون، مصائب کا شکار، دنیا کا غلام، فریب کا سوداگر، موتوں کا مقروض، اسیر اجل، افکار کا ہم نشین، غم و آلام کا ساتھی، آفات کی زد پر، خواہشات کا مارا اور موتوں کا جانشین ہے۔

اما بعد۔ دنیا روٹھ چلی۔ زمانے کے تیور بدل گئے۔ آخرت کا عالم پیش نظر ہے۔

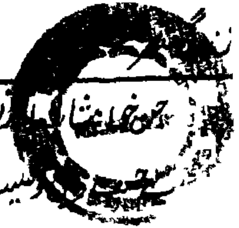
یہ وہ آئینہ ہے جس میں صاف نظر آرہا ہے کہ دوسروں کو اپنے سوا نہ دیکھوں پیچھے کی
جانب نہ مڑوں۔ مگر جہاں اپنی ہی فکر اور اپنی ہی بات پیش نظر ہے۔ نیز ہوا و ہوس سے دور
صدق و صفا کے ایک ایسے عالم میں آچکا ہوں جہاں فریب نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے
وہیں یہ حقیقت بھی ہے کہ تم اپنا ایک جز نہیں کل ہو۔ تمہارے ساتھ کوئی بات پیش آجائے
تو گویا میرے ساتھ پیش آگئی۔ موت تجھے آجائے تو گویا میرے ساتھ پیش آگئی۔ موت
تجھے آجائے تو گویا مجھے آگئی۔ لہذا اپنی جو فکر ہے وہی تمہاری بھی ہے۔ جیسی یا مروں
احتیاطاً لکھ رہا ہوں۔ پیارے بیٹے! تجھے وصیت کرتا ہوں کہ :۔

اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا۔ اس کے حکم کے پابند رہنا۔ قلب کو اس کے ذکر سے معمور
رکھنا۔ اس کے رشتے سے خود کو وابستہ رکھنا۔ یہ رشتہ قائم ہوجائے تو تمہارے اور اللہ
کے درمیان کس بات کی کمی رہ جائے گی۔ دل کو تذکیر و موعظت سے زندہ رکھنا۔ زہد سے
اس پر موت طاری کرنا۔ اس میں یقین کی قوت بھرنا۔ حکمت سے اسے روشن رکھنا۔ اسے
موت کی یاد سے جگاؤ۔ اس میں فنا کا اعتراف اور حوادث دہر کی بصیرت پیدا کرو۔ لیل و
نہار کے انقلابات اور زمانہ کے حملوں سے ہوشیار رکھنا۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کو جو کچھ
پیش آیا اسے یاد دلاؤ۔ ان کے دیار میں جاؤ۔ جو کچھ انھوں نے کیا اس پر غور کرو۔ دیکھو
کہ کس ماحول سے گئے اور کہاں فروکش ہوئے۔ دیکھو لوگے کہ اعزہ سے رخصت ہو کر
دیار غیر میں داخل ہوئے۔ تم بھی عنقریب انہی کی صف میں کھڑے ہوگے۔ لہذا اپنا ٹھکانا عمدہ
بناؤ۔ دنیا کے عوض آخرت فروخت نہ کرو۔ جس بات کا عرفان نہ ہو اسے ذرا بھی نہ چھیڑو
جس بات کے ذمہ دار نہ ہو اس سے سروکار نہ رکھو۔ اس راستہ پر نہ جاؤ جہاں بھٹک
جانے کا اندیشہ ہو۔ کیونکہ ہولناکیاں مول لینے سے یہ بہتر ہے کہ مقام اندیشہ پر اپنے آپ کو
روک لو۔ معروف کا حکم دو۔ معروف انسانوں میں تمہارا شمار ہوگا۔ ہاتھ اور زبان کی
طاقت سے منکر کو روک دو۔ جو اس کا مرتکب ہو حتی الامکان اس سے دور ہوجاؤ۔ اللہ
کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو۔ اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی پروا نہ کرو۔ حق جہاں بھی
ہو اس کی شدتوں کے متحمل بنو۔ دین کی سمجھ پیدا کرو۔ نفس کو مصیبتوں پر صبر کا عادی

بتاؤ صبر کیا خوب وصف ہے۔ تمام معاملات میں نفس کو مجبور کرو کہ اللہ کی جانب
مائل ہو جائے۔ کیونکہ یہ ایک محفوظ غار اور ایک ٹھوس قلعہ ہے۔ دعا میں پروردگار کے
مخلص رہو۔ کیونکہ عطا اور محرومی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کام کرنے سے پہلے عمدہ پہلوؤں کو
نگاہ میں لاؤ۔ میری اس وصیت کو اچھی طرح سمجھنا۔ اس سے اعراض نہ کرنا۔ بہترین بات
وہی ہوتی ہے جو مفید ہوتی ہے۔ یاد رکھنا کہ اس علم میں کوئی خیر نہیں جو منفعت بخش نہ ہو۔
اور جس علم سے کوئی نفع نہ ہو اسے حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔

بیٹے! میں نے دیکھا کہ عمر دراز ہو گئی اور روزافزوں کمزور ہو رہا ہوں تو وصیت کرنے
میں عجلت کی اور اس لیے کہ مبادا کر نہ پاؤں اور میرے جسم کی طرح ادھوری ہو کر رہ جائیں باتیں
جو ہر روز کم سے کمتر ہو رہا ہے' یا پھر میرے اور تمہارے درمیان زمانے کے فتنے اور ہوا و ہوس
کی باتیں حائل ہو جائیں اور تم بدک جاؤ۔ نوخیز کا دل خالی زمین کی طرح ہے۔ اس میں جو
شے بوئی جاتی ہے قبول کر لیتی ہے لہذا تمہارے دل کی زمین سخت ہو جانے سے پیشتر
اس میں حسن ادب کا بیج بو دینا چاہتا ہوں۔ اس طرح تم سنجیدہ اور ٹھوس فکر کے مالک
بنو گے۔ تجربات کی وادیوں میں سرگرداں نہ ہو گے اور وہ تمام باتیں تم پر روشن رہیں گی جو
مجھ پر روشن ہو سکی تھیں۔

بیٹے! گو میں اپنے پیشروؤں کی عمر کو نہیں پہنچا۔ پھر بھی ان کے طور طریقوں پر غور کرتا رہا ہوں
ان کے حالات پر نگاہ ڈالی ہے' آثار و نشانات دیکھے ہیں۔ اس طرح یوں کہو کہ انہی جیسا
ایک فرد بن چکا ہوں۔ بلکہ یہ بھی کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ جو امور و معاملات اسلاف کے میرے
روبرو آچکے ہیں اول سے آخر تک گویا کہ انہی کے عہد میں رہا ہوں۔ اس لیے مجھ کو رطب و یابس
نفع و نقصان اور حق و باطل کی تمیز ہے۔ میں نے ہر معاملہ کی چھان بین کر کے اس کا خلاصہ تمہارے
سامنے رکھ دیا ہے۔ اس وقت تم عنفوان عمر میں ہو اور تمہارے اندر تہذیب و ادب کی وہ
بات موجود ہے جس سے تمہاری سلامتی اور صدق و صفا کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے چاہوں گا
کہ تمہیں کتاب الہی کا علم' اس کی تاویل' اسلامی احکام، قوانین اور حرام و حلال کی ساری
باتیں معلوم ہو جائیں۔ اس سے زیادہ کی مجھے خواہش نہیں تھی۔ البتہ مجھے خطرہ تھا کہ لوگ



...نظریات کا شکار ہو گئے۔ مبادا ان ہی کا شکار تم بھی نہ ہو جاؤ۔ اس ... وصیت نامہ تمہارے لیے تیار کیا ہے۔

بیٹے! میری سب سے زیادہ محبوب وصیت یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ تم پر اس نے جو فرائض عائد کیے ہیں انہی پر انحصار کرو۔ تمہارے آبا و اجداد اور خاندان کے صالحین کے جو نقوش پا ہیں ان پر قائم رہو۔ اس لیے کہ جس فکر و نظر اور طرز عمل کے حامل وہ حضرات تھے اس سے حامل تم نہیں ہو۔ انھوں نے جو قبول کیا سمجھ کر قبول کیا اور جو باتیں مسترد کیں وہ وہی تھیں جن کا انھیں مکلف نہیں بنایا گیا تھا۔ پھر بھی ان ہی کی طرح سمجھ کر چلنا ہو تو فہم و فراست اور علم و بصیرت کی مشعل ہاتھ میں لو، نہ کہ شکوک و شبہات کی وادیوں میں گم کردہ راہ ہو کر۔ اس راہ میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے خدا سے اعانت چاہو، اس کی توفیق طلب کرو۔ اور ان تمام شائبوں سے پاک رہنے کی دعا مانگو جو تمہیں کسی شبہہ یا گمراہی میں مبتلا کر دینے والے ہوں۔ جب پورا یقین ہو جائے کہ قلب منزہ ہو کر اس پر خشوع و خضوع کی کیفیت طاری ہو چکی ہے اور فکر و نظر میں پختگی آ گئی ہے تو دیکھ لیے گے کہ میری باتیں کس قدر راست ہیں۔ بالفرض تمہارا نفس محبوب جم نہ سکے۔ اسے فکر و نظر کا موقع نہ ملے تو سمجھنا کہ آگے ظلمتیں ہیں جن میں تمہارے قدم رواں دواں ہوں گے۔ دین کا طالب وہ نہیں ہے جو بے راہ رو ہو یا حق و باطل کو خلط ملط کر دے۔ اس صورت حال سے رک جانا ہی بہتر ہے۔

بیٹے! میری وصیت پر دھیان دینا۔ یاد رکھنا کہ موت کا مالک ہی زندگی کا مالک ہے۔ خالق ہی مارتا بھی ہے اور دوبارہ زندگی بھی بخشتا ہے۔ امتحان و آزمائش میں ڈالنے والا ہی معاف بھی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں امتحان و آزمائش اور آخرت میں مکافات عمل کی جو بات رکھی ہے، دنیا بس اسی پر قائم ہے۔ ان میں سے کوئی بات تم سے اوجھل ہو جائے تو اسے اپنی جہالت پر محمول کرنا، اس لیے کہ آغاز میں جاہل تھے، پھر صاحب علم ہوئے۔ معاملات کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے تمہارا فکر پریشان ہوتا ہے۔ نگاہیں بھٹکتی ہیں کیا فی غور و خوض اور راہ حیرت کے بعد پھر کہیں جا کر تمہاری سمجھ میں کچھ آتا ہے۔ لہٰذا اس ذات گرامی کی پناہ میں آؤ جس نے تمہیں پیدا کیا، رزق دیا اور تمہیں استوار کیا۔ عبادتیں تمہاری ہی

سکے لیے ہوں بلکہ تو اسی کی جانب ۔ ڈرو تو اسی سے ڈرو ۔

بیٹے یاد رکھنا کہ اللہ کے باب میں جیسا کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے دنیا کوئی اور ہرگز نہیں بتا سکتا ۔ لہذا آپؐ کو پیشوا اور نجات کا راہبر مانو میں نے نصیحت میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے ۔ کوشش کے باوجود اپنے لیے تم اس حد تک نہیں پہنچ سکتے جس حد تک میں تمہارے لیے پہنچ چکا ہوں ۔

بیٹے ! یاد رکھنا ۔ اگر تمہارے رب کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے پیغامبر تمہارے پاس آتے ۔ اس کی سلطنت اور حکومت کے آثار تمہیں نظر آتے ۔ اس کے افعال اور صفات کا تمہیں پتہ ہوتا ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ واحد ہے جیسا کہ خود اس نے اپنے باب میں ظاہر فرمایا ہے ۔ اقتدار میں اس کا کوئی شریک نہیں ۔ وہ کبھی مٹنے والا نہیں ہے ۔ وہ تمام اشیاء سے پہلے ہے مگر اس کی اولیت اور ابتدا کوئی نہیں اور تمام اشیاء کے بعد آخر ہے مگر اس کی کوئی انتہا نہیں ۔ وہ اس بات سے بالاتر ہے کہ اس کی ربوبیت قلب و نظر کے پیمانوں سے ناپی جائے ۔ اس حقیقت کا عرفان ہو جائے تو پھر ویسا ہی کرنا چاہیے انسانوں کو کرنا چاہیے ۔ ایسے انسانوں کو جن کا شرف کم ہے ، جن کی قدرت تھوڑی ہے ۔ جو عاجز و درماندہ ہیں ، جو اطاعت اور خوف کے باب میں اپنے پروردگار کے انتہائی محتاج ہیں ۔ اس نے تو تمہیں اچھی بات کا حکم دیا ہے اور بری باتوں سے روکا ہے ۔

بیٹے ! میں تمہیں دنیا ، اس کی حالت ، اس کے زوال اور اس کے منتقل ہو جانے کی بات بتا رہا ہوں تمہیں آخرت اور آخرت میں آخرت والوں کے لیے جو تیار ہے اس کی خبر دے رہا ہوں ۔ اس کے لیے مثلیں بیان کروں گا ۔ تاکہ عبرت کے سبق اور راہ راست تک رسائی حاصل کر لو ۔ دنیا کو جو آزما لے اس کی مثال ایسے مسافروں کی ہے جنہیں کوئی بے آب و گیاہ مقام راس نہ آئے تو کسی زرخیز سبزہ زار کا قصد کریں اور پھر راہ میں صعوبتیں اٹھائیں دوستوں سے جدا ہوں ، سفر کی مشقتیں برداشت کریں ، موٹا جھوٹا کھا کر رہیں ۔ پھر کہیں جا کر منزل مقصود آئے ۔ راستہ میں کسی تکلیف کو تکلیف اور کسی خرچ کو صرفہ تصور نہ کریں ۔ بس سب سے عزیز تر شے یہ ہو کہ ان کی منزل مقصود نظر آ جائے ۔ دنیا سے جو دھوکا کھا بیٹھے اس کی مثال

ایسی ہے جیسے کچھ لوگ کسی سبزہ زار میں ہوں مگر یہ جگہ ناسازگار ہوجائے تو اس سے نکل کر بے آب وگیاہ زمین میں جا پہنچیں۔ ایسی حالت میں ان کے لیے اس سے زیادہ ناپسندیدہ اور ہولناک کوئی اور شے نہ ہوگی کہ وہ ایک اچھی حالت سے نکل کر ایک انتہائی تکلیف دہ حال میں داخل ہوگئے۔

بیٹے! اپنے اور غیروں کے تعلقات کے باب میں اپنے آپ کو میزان بناؤ۔ دوسروں کے لیے وہی ناپسند کرو جو اپنے لیے پسند کرو۔ دوسروں کے لیے وہی ناپسند کرو جو اپنے لیے ناپسند کرو دوسروں پر ظلم نہ کرو جیسا کہ خود منظور نہیں۔ دوسروں سے جن باتوں کا ارتکاب معیوب سمجھتے ہو۔ ان باتوں کا ارتکاب اپنے باب میں بھی معیوب سمجھو۔ اپنے حق میں لوگوں سے جس رویہ کے خواہشمند رہو ویسے ہی رویہ کی لوگوں کے حق میں بھی خواہش رکھو۔ جو بات معلوم نہ ہو گو اس کا کچھ حصہ معلوم بھی ہو پھر بھی نہ بولو۔ جس بات کا تمہارے حق میں کہا جانا پسند نہ ہو تم بھی دوسروں کے حق میں نہ کہو

یاد رکھنا! خود پسندی عقلوں کی آفت اور صداقت کی دشمن ہے مشقت سے کام لو۔ دوسروں کے لیے دولت نہ جمع کرو۔ یاد رکھو تمہارے روبرو ایک لمبی مسافت ہے اور راستہ بھی مشقتوں سے پر ہے۔ یہاں کہیں بھی تمہیں حسن طلب سے بے نیازی نہیں۔ زادراہ اتنا ہی لینا جتنے میں منزل آجائے۔ پشت ہلکی رکھنا۔ اس پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ رکھنا۔ زیادہ بوجھ رکھو رلینا وبال جان ہے۔ فاقہ زدہ لوگوں میں کچھ ایسے مل جائیں جو تمہارا زاد راہ قیامت میں پہنچا کر تمہیں اس وقت دے سکیں جس وقت اس کی شدید ضرورت ہوگی تو انہیں غنیمت سمجھنا اور یہ بوجھ ان پر ضرور رکھ دینا۔ یہ مل جائیں تو ان پر زیادہ سے زیادہ بوجھ رکھنا کہ مبادا انھیں تلاش کرو اور نہ پاؤ۔ تونگری میں تم سے کوئی قرض خواہ ہو تو اسے غنیمت سمجھنا کیونکہ جس روز تم تنگی میں ہوگے اس روز وہ تمہیں ادا کردے گا۔

یاد رکھنا تمہارے سامنے پہاڑوں کی بلندی پر جانے والا دشوار گذار راستہ ہے اگر راستہ میں جو جتنا زیادہ ہلکا ہوگا اتنا ہی مزے میں ہوگا۔ اس راستہ میں سست گام تیز گام سے بدتر ہوگا۔ یہیں سے تمہیں جنت یا جہنم میں اترنا ہے۔ لہذا اترنے سے پہلے آگے کی سیرکھنا

فرو کش ہونے سے پہلے منزل کو دھیان میں رکھنا موت کے بعد حصول رضا کی کوئی جگہ ہے اور نہ دنیا کی طرف پلٹ کر آنا ہے۔

یاد رکھنا! جس کے ہاتھوں میں آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں اسی نے تمہیں دعا کرنے کی اجازت بھی دے رکھی ہے۔ دعا قبول کرنے کا وعدہ بھی کر رہا ہے۔ اسی نے تمہیں حکم دیا ہے کہ مانگو تو اسی سے مانگو۔ وہ تمہیں دے گا۔ رحم کی درخواست اسی سے کرو وہ رحم کرے گا۔ اس نے اپنے اور تمہارے درمیان کوئی دربان نہیں رکھا ہے۔ اس نے تمہیں اس بات کا مکلف بھی نہیں بنایا ہے کہ تم اس کے یہاں کوئی سفارش ارسال کرو بدی کا ارتکاب کر لینے کے بعد تمہیں توبہ سے منع بھی نہیں کیا ہے۔ وہ سزا دینے میں عجلت سے کام بھی نہیں لیتا جہاں تمہیں رسوا کر دینا ضروری تھا وہاں اس نے تمہیں رسوا بھی نہیں کیا ہے۔ انابت کا راستہ اختیار کرنے پر اس نے تم پر کوئی سختی بھی نہیں کی ہے۔ جرم پر اس نے تم سے کوئی مباحثہ بھی نہیں کیا ہے۔ رحمت سے اس نے مایوس بھی نہیں ہونے دیا ہے بلکہ گناہوں سے باز آجانے کو نیکی، تمہاری بدی کو ایک اور نیکی کو دس محسوب کیا ہے۔ توبہ کا دروازہ تمہارے لیے وا کیا ہے جب تم پکارتے ہو تو وہ تمہاری پکار سنتا ہے۔ جب اس سے سرگوشی کرتے ہو اور اپنی ضرورتیں اس کے روبرو پیش کرتے ہو، اپنا حال زار اس کے سامنے رکھتے ہو اپنے غم و آلام کی اسے خبر دیتے ہو، اپنی تکلیفیں بیان کرتے ہو، اپنے کاموں میں اس سے مدد کے طالب ہوتے ہو اس کی رحمت سے اپنے لیے فراوانی، عمر، صحت اور کشادگی رزق کا خزانہ مانگتے ہو جسے عطا کرنے کی اس کے سوا کسی اور کو طاقت نہیں تو اسے تمہاری سرگوشی کا علم ہوتا ہے۔ اس نے اپنے حضور درخواست کرنے کی اجازت دے کر اپنے خزانوں کی کنجیاں تمہارے حوالہ کر دی ہیں جب چاہو دعا کے اس کی نعمتوں کے دروازے کھول لو۔ اس کا باران کرم برسا لو۔ لہذا قبول دعا میں تاخیر ہو تو مایوس نہ ہونا۔ کیونکہ عطیہ و بخشش نیتوں کے مطابق ہوتی ہے۔ پھر ایسا بھی ہے کہ قبولیت دعا میں تاخیر سے سائل کا رتبہ بڑھایا جاتا ہے اور امیدوار کرم کے لیے عطا اور بخشش کا امر زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ کبھی مانگی جانے والی شے نہیں دی جاتی بلکہ اس سے بہتر دوسری شے دیدی جاتی ہے جو قریب یا دور کے زمانے میں نفع بخش ہوتی ہے

کبھی اس سے بھی صرف نظر کر کے تمہارے اس حال پر توجہ کی جاتی ہے جو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ جس چیز کے تم طالب ہو اس میں تمہارے دین کی تباہی پوشیدہ ہوتی ہے وہ تمہیں اگر دے دی جائے تو دین تباہ ہو جائے۔ اس لیے تمہاری مانگ ایسی شے کی ہو جس کا جمال باقی رہے جس کے وبال سے محفوظ رہ سکو۔

یاد رکھنا! تمہاری تخلیق آخرت کے لیے ہوئی ہے' نہ کہ دنیا کے لیے۔ نیز یہ کہ تم ایک ایسے مقام میں ہو جہاں سے نہیں معلوم تمہیں کب کوچ کر کے چلا جانا ہے۔

تم آخرت کی راہ میں ہو۔ تمہارے پیچھے وہ موت ہے جس سے کوئی بھاگنے والا بچ نہ سکا۔ ایک نہ ایک دن وہ تمہیں آ کے رہے گی۔ لہٰذا موت اس عالم میں نہ آئے کہ کسی حال بد میں مبتلا ہو اور توبہ کی سوچ رہے ہو اور وہ آ کر تمہارے اور توبہ کے درمیان حائل ہو جائے۔ اس طرح تم اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے۔

بیٹے! موت کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھنا۔ یاد رہے کہ موت کے بعد تمہیں کہاں جانا ہے۔ موت آئے تو احتیاط کے سارے تقاضے پورے ہو چکے ہوں اس کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں۔ اچانک نہ آئے کہ مبہوت ہو کر رہ جاؤ۔ دنیا والے جس طرح دنیا سے چمٹتے اور اس پر جھپٹتے ہیں اس طرح انہیں دیکھ کر دھوکہ نہ کھا بیٹھنا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے اس دنیا کا حال رکھ چکا ہے۔ اس نے بتا دیا ہے کہ اس دنیا کی ہستی کیا ہے اس کی بدیاں کھول کر اس نے رکھ دی ہیں۔ دنیا والے کیا ہیں جیسے بھونکتے ہوئے کتے' ایک دوسرے پر غراتے ہوئے خونخوار درندے' طاقتور کمزور کو کھا تا ہے۔ بڑا چھوٹے کو دباتا ہے۔"

پھر حسب ذیل دعا پر اپنے قیمتی اور طویل کلمات ختم فرمائے ہیں:

"میں تمہارے دین اور دنیا دونوں کو اللہ کی امانت میں رکھتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ دنیا و آخرت میں وہ تمہارے لیے بہترین فیصلہ فرمائے۔"

عبدالمجید اصلاحی

جب اقتدار کا نشہ ذہن پر چھا جاتا ہے

ایک بزرگ امریکی صحافی جو سرخ چین کے وجود میں آنے سے قبل ایک مدت تک چین کی رپورٹنگ کرتا رہا تھا۔ چالیس برس کے بعد دوبارہ چین گیا تو ششدر رہ گیا۔ چین کا زمین و آسمان بدلا ہوا تھا۔ چین پر سرخ انقلاب آکر نہ صرف چلا گیا تھا۔ تبدیلی اب پھر پیچھے کے رخ میں ہے۔ پہلا انقلاب کو بے خطا سمجھا جاتا تھا لیکن اب انقلاب کی ایک ایک خامی ڈھونڈی اور اس کا برملا اعتراف کیا جا رہا ہے۔

امریکی صحافی لکھتا ہے۔ ماؤ پر تنقید تصور بھی نہیں کی جا سکتی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ماؤ کا احتساب کیا جا رہا ہے اور وہ خدا سے ایک خطا کار لیڈر کی سطح پر آگیا ہے۔

یہ صحافی یونان بھی گیا جو سرخ انقلاب کا اصل گہوارہ تھا۔ یہیں وہ غار ہیں جن میں سرخ فوج کا ہیڈ کوارٹر قائم تھا۔ ایک محفوظ پہاڑی کے اندر تلے اوپر کمرے بنائے گئے تھے جن میں ماؤزے تنگ اپنے ساتھیوں سمیت رہتا تھا اور یہیں سے تمام ہدایات جاری ہوتی تھیں۔ ماؤ تسے تنگ کے ان ساتھیوں میں چو این لائی۔ لیو شاؤ چی چوہے اور لن پیاؤ وغیرہ شامل تھے۔ وہ ایک خاندان کی طرح رہتے اور بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے لیکن جونہی اقتدار ملا سوائے چو این لائی کے بیشتر ساتھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اب وہ ساری تاریخ جو ماؤ کی زندگی میں راز سربستہ تھی اب کھلے عام بیان کی جاتی ہے۔

ماؤزے تنگ بلاشبہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا لیکن اس سے خطائیں بھی غیر معمولی ہوئیں۔ وہ عمر بھر مشقت کی زندگی بسر کرتا رہا تھا۔ جدوجہد کے ایام میں وہ فرش پر سوتا تھا جب اقتدار حاصل ہوا تو اس کے لیے گدا بچھایا گیا۔ صبح اٹھ کر اس نے کہا۔ میں رات بھر نہ سو سکا۔ میرے لیے آئندہ گدا نہ بچھایا جائے۔ میں فرش پر ہی سوؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد بقیہ عمر وہ فرش پر ہی سوتا رہا۔

وہ بلا کا ذہین تھا لیکن اس کے ذہن میں ثقافتی انقلاب کا جو خناس سمایا تو اس نے پورے چین کو تہ و بالا کر دیا۔ پوری اجتماعی زندگی درہم برہم ہو گئی اور بھائی بھائی کا اور پڑوسی پڑوسی کا دشمن بن گیا۔ ستم یہ کہ

ماؤ کا اس کے باوجود اصرار تھا کہ وہ درست اور باقی سب غلط۔ چین کے ایک موجودہ مقتدر لیڈر نے جو ماؤ کا ساتھی بھی رہ چکا تھا۔ امریکی صحافی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ ماؤ ابتدائی دور میں سنتا زیادہ اور بولتا کم تھا لیکن بعد میں اس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ سنتا کسی کی نہیں تھا اور بولتا سب سے زیادہ تھا۔

خود ماؤ کے الفاظ میں ثقافتی انقلاب کا مفہوم تذکر تھا یعنی پارٹی کو یاد دلانا کہ ان کی اصل حیثیت پرولتاریہ کی ہے اور جس کی دماغ پر ہوا بھر گئی ہو اسے نکال دیا جائے اب یہ ہوا کیسے نکالی جاتی تھی اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک ریڈ گارڈ (سرخ محافظ) خود بیان کرتا ہے کہ ایک رات وہ سو رہا تھا کہ ایک ہنگامے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ ان کے ہیڈ کوارٹر کے صحن میں ریڈ گارڈ دو ٹیچروں کی پٹائی کر رہے تھے ان ٹیچروں کا قصور یہ تھا کہ ان پر شبہہ تھا کہ وہ پارٹی تعلیمات سے انحراف کر گئے ہیں۔ ٹیچر دہائی دے رہے تھے کہ وہ انحراف کے قطعی مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن انہیں مارنے والے سنتے ہی نہ تھے۔ ان ٹیچروں کو اتنا مارا گیا کہ وہ اسی مار میں ختم ہو گئے۔ پھر ان کی لاشیں ایک کونے میں پھینک دی گئیں تاکہ ٹرک آئے اور انہیں لے جائے۔

ایک چینی پروفیسر نے امریکی صحافی کو بتایا۔ میں طالب علم تھا۔ جب ثقافتی انقلاب آیا اس وقت میرا بھائی یونیورسٹی میں تھا۔ اس کی اصلاح کے لیے اسے گرفتار کر کے اتنا مارا گیا کہ وہ مر گیا۔ ماں کو بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو شدت غم سے اس نے خودکشی کر لی۔

ایک صاحب جو اب حکومت میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا مجھے پکڑ کر مارا پیٹا گیا۔ اگر میرے ہی مزاج مجھے نہ چھڑاتے تو میں ختم ہو چکا تھا۔

حد یہ ہو گئی کہ جو شخص (لی تا) چین کی کمیونسٹ پارٹی کا بنیادی رکن تھا وہ بھی اسی انقلاب میں قتل کر دیا گیا اور خبر یہ دی گئی کہ اس نے خودکشی کر لی ہے ــــ حکومت کی جانب سے اس انقلاب کی نذر ہونے والوں کی تعداد ۔۔ ۸۴۳ بتائی جاتی ہے۔ جبکہ سات لاکھ ۲۹ ہزار پانچ سو گیارہ افراد قید کیے گئے تھے۔ لیکن غیر سرکاری ذرائع کے مطابق ہلاک شدگان کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر ہے اور اذیت پانے والوں کی تعداد ایک ملین سے بھی زائد ہے۔

امریکی صحافی نے چار کے ٹولے کے جرائم پر روشنی ڈالی ہے۔

اس نے بتایا کہ ماؤ آخری عمر میں جب معذور ہو چکا تھا تو اس کے نام پر اس کی بیوی (چیانگ چنگ) حکمرانی کرتی تھی ایک مرتبہ فلپائن کی خاتون اول امیلڈا مارکوس چین کے دورے پر آئی تھی تو ماؤ کی بیوی جو چین کی خاتون اول تھی اس کو ساتھ لیکر زرعی کمیون کے معائنہ پر گئی۔ فلپائن کی خاتون اول کو دیکھنے کے لیے دیہاتیوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ ایک مقام پر ہجوم اتنا زیادہ ہو گیا کہ موٹر کے نیچے ایک دیہاتی آکر کچلا گیا ڈرائیور نے ماؤ کی بیوی سے پوچھا۔ کیا میں ذرا رک جاؤں؟ اس نے جھڑک کر کہا۔ چلے چلو۔

ماؤ کی بیوی شادی سے پہلے ایک اداکارہ تھی۔ شادی کے بعد رفتہ رفتہ اس کا ماؤ پر اتنا اثر ہو گیا کہ ماؤ کے بعد وہی چین کی طاقتور شخصیت تسلیم کی جاتی تھی لیکن آج وہ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہے

(بقیہ تنقید وتبصرہ)

دعوتی حلقوں سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ اگلے ایڈیشن میں یہ کمیاں دور ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ اخوان المسلمون کا تربیتی نظام سامنے آگیا ہے تو دیگر معاصر تحریکات کے بھی تربیتی نظام کو تفصیلی رنگ میں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ تاکہ باہمی اخذ و استفادہ سے ہر ایک کو اپنی کمیوں کو دور کرنے میں مدد ملے۔ تحریک اسلامی کا تربیتی نظام دیکھنا ہے اس موضوع کے لیے آگے کون بڑھتا ہے۔ وفی ذالك فلیتنافس المتنافسون۔ سلطان احمد اصلاحی۔ ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ

رسائل و مسائل

ایک حدیث کا حوالہ

سوال

آپ نے اپنی کتاب "اسلامی تصوف" ص ۲۰۷ پر "کاد الفقر ان یکون کفرا (قریب ہے کہ فقر کفر بن جائے) کی حدیث لکھی ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ حدیث کس کتاب میں ہے اگر حدیث ہے تو حوالہ کیوں نہیں ہے؟

جواب

"کاد الفقر ان یکون کفرا" کے حدیث ہونے میں آپ کو شبہ کیوں ہوا؟ اگر آپ اس کی طرف کوئی اشارہ کر دیتے تو جواب میں آسانی ہوتی مجھے افسوس ہے کہ میری کتاب میں اس کا حوالہ رہ گیا۔ یہ فقرہ حدیث ہونے کی حیثیت سے زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اس فقرے کے ساتھ ایک اور فقرہ بھی ہے۔ وکاد الحسد ان یغلب القدر۔ یہ پوری حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے امام بیہقی نے شعب الایمان میں درج کی ہے۔ مشکوٰۃ میں یہ حدیث باب ما نہی عنہ من التہاجر والتقاطع میں موجود ہے۔ یہ حدیث ان احادیث کا مفہوم واضح کرتی ہے جن میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے کفر اور فقر سے پناہ مانگی ہے۔ مشکوٰۃ کے باب الاستعاذہ میں یہ حدیثیں موجود ہیں میں یہاں انہیں نقل کرتا ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں یہ دو چیزیں بھی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی کی ایک حدیث کے دو فقرے یہ ہیں:۔

(۱) اللّٰھم انی اعوذبك من شر فتنۃ الغنی ومن شر فتنۃ الفقر (متفق علیہ)

اے اللہ میں فتنہ مال کے شر اور فتنہ فقر کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

(۲) عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یقول اللهم انی اعوذ بك من الفقر والقلة والذلة (رواه ابو داؤد)	حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ اے اللہ میں محتاجی، قلت اور ذلت سے تیری پناہ مانگتا ہوں
(۳) وعنه ان رسول الله صلے الله علیه وسلم کان یقول اللهم انی اعوذ بك من الجوع فانه بئس الضجیع	انہیں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے اے اللہ! میں بھوک سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو ایسا ساتھی ہے جو جاگتے سوتے ہر حال میں پیچھا نہیں چھوڑتا۔
(۴) عن مسلم بن ابی بکرة قال کان ابی یقول فی دبر الصلوٰة اللهم انی اعوذ بك من الکفر والفقر وعذاب القبر فکنت اقولهن فقال ای بنی عمن اخذت هذا قلت عنك قال ان رسول الله صلے الله علیه وسلم کان یقولهن فی دبر الصلوٰة۔ رواه الترمذی والنسائی الا انه لم یذکر فی دبر الصلوٰة و روی احمد لفظ الحدیث وعنده فی دبر کل صلوٰة	مسلم بن ابی بکرہ سے روایت ہے کہ میرے والد نمازوں کے بعد کہا کرتے تھے۔ اے اللہ میں کفر، فقر اور عذاب قبر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں بھی نمازوں کے بعد یہ فقرے کہنے لگا تو میرے والد نے مجھ سے پوچھا اے بیٹے تم نے یہ فقرے کس سے سیکھے ہیں؟ میں نے کہا۔ آپ سے۔ انھوں نے کہا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد یہ کہا کرتے تھے۔ یہ حدیث ترمذی اور نسائی نے روایت کی ہے الا یہ کہ نسائی میں دبر الصلوٰة کا لفظ نہیں ہے اور حدیث کا یہ لفظ امام احمد نے بھی روایت کیا ہے اور مسند احمد میں بھی دبر کل صلوٰة کے الفاظ ہیں یعنی نبی صلے اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد

یہ فقرے فرمایا کرتے تھے۔

(۵) عن ابی سعید قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللھم انی اعوذ بک من الکفر والفقر قال رجل وھذان؟ قال نعم رواہ النسائی

ابو سعید سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ اے اللہ میں کفر اور فقر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ ایک شخص نے پوچھا۔ کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں

میں اگر ہر حدیث پر الگ الگ گفتگو کروں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اب آپ خود غور کریں کہ ان تمام احادیث کو پڑھنے کے بعد جب امام بیہقی کی روایت کردہ حدیث کاد الفقر ان یکون کفرا سامنے آتی ہے تو کیا یہ فقرہ ان تمام احادیث کے مفہوم کو واضح نہیں کر دیتا؟ اس کے علاوہ سب سے پہلی حدیث جو امام بخاری رح کے حوالے سے اوپر نقل کی گئی ہے کیا اس سے دوسری تمام احادیث کی توضیح نہیں ہوتی؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فقر (محتاجی) سے پناہ مانگی ہے جس کے ساتھ صبر نہ ہو۔ اس طرح کا فقر کفر کا سبب بن سکتا ہے اور بن جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو کاد الفقر ان یکون کفرا کے فقرے میں واضح کر دیا گیا ہے۔ کفر کا سبب کس طرح بنتا ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے معمولی بات جو مشاہدے میں بھی آتی رہتی ہے کہ بے صبر مسلمان فقیر بسا اوقات اللہ جل شانہ کی شان میں گستاخیاں کرنے پر اتر آتا ہے۔ میں نے جب اپنی کتاب "اسلامی تصوف" میں کاد الفقر والی حدیث نقل کی تھی تو یہ تمام احادیث میرے سامنے تھیں۔

تنقید و تبصرہ

شمع حرم محمد یوسف اصلاحی صفحات ۱۶۰ کتابت، طباعت عمدہ آفسٹ کی گرد پوش کے ساتھ۔ اچھا کاغذ قیمت دس روپے۔ جاذب نظر

ناشر:۔ مکتبہ ذکری رام پور۔ یوپی

قرآن کریم اور احادیث نبوی دو ایسے سرچشمہ ہدایت ہیں جن کے سوتے قیامت تک ختم نہیں ہوں گے۔ ان کی تفسیر و تشریح اور ان سے مستنبط مسائل کے چھوٹے بڑے مجموعے نہ جانے کتنی تعداد میں شائع ہو چکے ہیں اور نہ جانے کتنی تعداد میں آئندہ شائع ہوتے رہیں گے۔ مسلمان، کتاب و سنت سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ان دونوں کی صحیح تفسیر و تشریح و تعبیر کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرویات میں سے ۱۰۰ حدیثوں کا انتخاب کرکے یہ مجموعہ مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں حضرت عائشہ رض کے حالات اور ان کے علمی مرتبہ پر ایک تحریر ہے اور پھر احادیث کے متون، ان کے ترجمے اور تشریحیں ہیں۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی کا اسلوب تحریر شگفتہ ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ ہر روایت کا ایک عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس طرح ۱۰۰ عنوانات کی فہرست بھی ابتدا میں دے دی گئی ہے۔ پہلا عنوان "اللہ کی محبت" اور آخری عنوان "مستقل مزاجی اور مداومت" ہے۔ امید ہے کہ لوگ اس مجموعے سے استفادہ کریں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تعلیمات نبوی پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

اب چند باتیں جو قابل توجہ ذہن میں آئی ہیں انھیں پیش کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔
ص ۱۲ پر "بچپن" کے عنوان کے تحت گڑیوں سے کھیلنے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے سوال کا

ذکر ہے اور اس کے بعد "نکاح" کا عنوان ہے اس سے ایسا خیال ہوتا ہے کہ شاید گڑیوں سے کھیلنے کا وہ واقعہ نکاح سے پہلے کا ہے۔ حالانکہ تبصرہ نگار کو یہ یاد ہے کہ وہ واقعہ مدینہ منورہ میں حضرت عائشہ کی رخصتی کے بعد حضورؐ کے گھر میں پیش آیا تھا۔

ص ۲۶ پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کے بیان میں مہینہ تو رمضان المبارک کا اور سن عیسوی ۶۵۸ دیا ہے۔ یہ بے تکی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہجری اور عیسوی دونوں سن کا ذکر کرتے یا صرف سن ہجری ہونا چاہیے تھا اور رمضان کی مناسبت سے تو صرف ہجری سن ہی مناسب تھا۔

ص ۱۲۳ "کرایہ پر مکان" کے عنوان کے تحت ایک روایت "الادب المفرد" کے حوالے سے درج ہے۔ اس روایت میں کرایہ مکان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "الادب المفرد" سامنے نہیں ہے۔ شاید اسی عنوان کے تحت وہ روایت درج ہو۔ اگر ایسا ہو تو مرتب کو اس کا اظہار کرنا چاہیے تھا ورنہ قاری کو الجھن ہوتی ہے کہ روایت میں کرایہ مکان کا کوئی ذکر نہیں ہے اور تشریح میں اس سے کرایہ مکان کے جواز کا استنباط موجود ہے۔ اس کے علاوہ روایت میں "وافکرت ذالک علیھم" کا ترجمہ "اور آپ نے ان کو بہت برا بھلا کہا" یہ ترجمہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ شاید اس ترجمہ کی وجہ سے تشریح کا رخ نامناسب ہوگیا ہے۔ کیا اس مجموعے کے فاضل مرتب کے نزدیک کسی غیر مسلم کو اپنا مکان کرایہ پر دینا ناجائز ہوگا؟ ظاہر ہے کہ خود مسلم اپنے گھر میں بہت سے غیر اسلامی ناجائز کام کرے گا۔

ص ۱۵۵ پر "شعر و نغمہ" کے عنوان کے تحت ایک روایت ہے۔ اس میں نغمہ کی طرف کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس لیے حدیث عنوان کے مطابق نہیں ہے۔ اس حدیث میں صرف شعر کے بارے میں اظہار خیال ہے۔

اس کتاب کے بارے میں لکھا گیا ہے:۔

"خواتین کے خصوصی مسائل سے متعلق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت کردہ چالیس مستند حدیثیں" ـــــ اس مجموعہ کی چالیس حدیثوں میں خاص طور پر عورتوں سے متعلق صرف چھ حدیثیں ہیں۔ اس لیے اس مجموعہ کو خواتین کے خصوصی مسائل سے متعلق کہنا کس طرح صحیح ہوگا؟ ـــــ نیز یہ کہ ص ۱۲۳ پر جو روایت ہے وہ حضرت عائشہ کی روایت کردہ نہیں ہے بلکہ خود ان کے ایک طرز عمل کو کسی دوسرے نے بیان کیا ہے۔ اس مجموعے کی تمام احادیث کو روایت و درایت کے اعتبار سے صحیح ترین قرار دینا ایک بڑا دعویٰ

ہے جو تمام احادیث کی اسناد کی پوری تحقیق کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیر کے تبصرے کا جو نہج ہے اس کے مطابق یہ چند باتیں صرف اس لیے عرض کی گئی ہیں کہ اگر لائق اعتنا ہوں تو فاضل مرتب ان کی طرف توجہ فرمائیں۔ بحیثیت مجموعی یہ مجموعہ لائق استفادہ ہے۔

اخوان المسلمین کا تربیتی نظام

ناشر:- ہندوستان پبلی کیشنز۔ دہلی۔ صفحات ۱۷۰
قیمت ۸ روپیے

ہمارے عزیز دوست جناب عبید اللہ فہد فلاحی صاحب نے عربی سے اردو میں تراجم کا جو ڈھیر لگا دیا ہے۔ اخوان المسلمین کا تربیتی نظام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ مشہور اسلامی مصنف اور اخوان المسلمین کے سرگرم کارکن جناب یوسف القرضاوی صاحب کی کتاب التربیۃ الاسلامیۃ و مدرسۃ حسن البنا کا اردو قالب ہے جسے ہندوستان پبلی کیشنز دہلی نے جاذب نظر کتابت و طباعت اور دیدہ زیب ٹائیٹل کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ترجمہ کا کام بعض پہلوؤں سے تصنیف سے زیادہ مشکل ہے جس کا حق اسی وقت ادا کیا جا سکتا ہے جبکہ آدمی کو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت حاصل ہو۔

عبید اللہ فہد عربی کے ساتھ اردو کا بھی بہت صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور بات کو موثر انداز میں پیش کرنے کا اچھا سلیقہ انھیں حاصل ہے۔ ان کے دیگر تراجم کی طرح اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا بھی اس میں اصل زبان کا مزہ حاصل کرے گا۔ ترجمہ کا احساس اسے شاید ہی کہیں ہو سکے گا۔ مباحث کے آغاز میں اردو قارئین کی رعایت سے دیگر مصنفین کے موزوں اقوال اور مؤثر اشعار سے کتاب کی تہذیب و تزئین کا جو کام مترجم نے کر دیا ہے وہ ان کی ادبی حس اور ذوق کی نفاست کا پتہ دیتا ہے۔

کتاب میں تربیت کا بہت ہی وسیع اور جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ جو بعض دیگر معاصر اسلامی تحریکات کی طرح اخوان المسلمین کا طرۂ امتیاز ہے اس کے مصنف چونکہ صرف ایک صاحب علم اور اہل قلم ہی نہیں بلکہ اخوان کے سرگرم کارکن اور اس کی چوٹی کے رہنماؤں کے قریب رہے ہیں۔ اس لیے اس میں ان کی وسیع معلومات کے علاوہ ذاتی تجربات و مشاہدات کا بھی ایک بڑا حصہ سمٹ آیا ہے جو اخوان کی مجاہدانہ تاریخ کا بہت ہی قیمتی حصہ ہیں۔ مصائب و آلام کے جو پہاڑ اخوان پر توڑے گئے ماضی قریب میں کہیں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کے کارکنوں کی یہی مثالی اور ہمہ جہتی تربیت تھی جس

کے نتیجہ میں وہ ان سخت حالات سے گذرنے میں کامیاب ہو سکے جس کی جھلک جا بجا ہمیں نظر آتی ہے راہ خدا میں استقامت اور جاں سپاری و جذبۂ سرفروشی کی جو عظیم الشان مثالیں ان صفحات میں بکھری ہوئی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں یقین نہیں آتا کہ یہ اسی بیسویں صدی کے واقعات ہیں۔ طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ ہم اس طرح کے چند واقعات نقل کرتے جو اس میں شک نہیں کہ اس کتاب کے سب سے زیادہ موثر اور جاندار حصے ہیں۔ اخوان کی شب بیداری اور ان کی "ایثار و قربانی" وغیرہ کے واقعات سے بھی طبیعت بہت زیادہ متاثر ہوتی ہے۔

البتہ طباعت کی غلطیاں بہت ہیں جو اکثر و بیشتر تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ صفحہ ۲۹ پر حدیث شریف کے الفاظ (لم یتفقدوا) (لم یفتقدوا) چھپ گئے ہیں۔ حدیث کا یہ پورا ٹکڑا اس طرح ہے۔ ان اللّٰہ یحب الابرار الاتقیاء الاخفیاء الذین اذا غابوا لم یتفقدوا وان حضروا لم یدعوا ولم یقربوا (مشکوٰۃ کتاب الرقاق باب الریاء والسمعۃ)

صفحہ ۷۹ پر جہاد ان کے نزدیک صرف یہیں تک موجود نہ تھا۔ یہاں غالباً محدود ہوگا۔ ص۱۱۴ پر "مدارج السالکین" (مدارج المساکین) چھپ گیا ہے۔ ص۱۲۶ پر "نقراز" (نعرہ حق) ہو گیا ہے۔ شعر یوں ہوگا۔ فیہ نقراز

صفحات ۹۲، ۹۳، ۱۲۷، ۱۶۶ وغیرہ میں اسی طرح کی اغلاط موجود ہیں۔ ص۵۸ پر صاحب الشہاب قتل کر دیے گئے اس مقام پر شہید کر دیے گئے زیادہ مناسب تھا۔ ص۱۱۳ پر "پتھر بھی شیشہ بھی" کچھ شاعرانہ سا جملہ ہو گیا ہے۔ مضمون سے اس کا رشتہ جوڑنا تکلف سے خالی نہیں۔ اس کا یہ عنوان زیادہ مناسب ہوتا۔ "عقیدت بے جا سے گریز" یا اسی سے ملتا جلتا کوئی دوسرا عنوان۔ اسی طرح ص۱۳۲ پر عبارت اور اس کے نیچے مندرج شعر میں ربط کا فقدان نظر آتا ہے۔ یا تو آخر میں کوئی جملہ بڑھاتے مثلاً یہ کہ "اسلام مذہب کی معاملات دنیا سے بے دخلی کا قائل ہے نہ اس کے یہاں رہبانیت اور نفس کشی کے لیے کوئی جگہ ہے۔ انسان دنیا میں رہ کر معاملات دنیا سے بے تعلق ہے۔ یہ معاملہ تو اس سے زیادہ کچھ مختلف نہ ہوگا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔ ورنہ پھر یہ معروف شعر کافی تھا۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

بہر حال یہ معمولی کمیاں ہیں جن سے کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم خاص طور پر

(باقی ۶۹ پر)

MONTHLY
ZINDAGI

R.N.I /2188/57
MRD. 66
DEC 1983

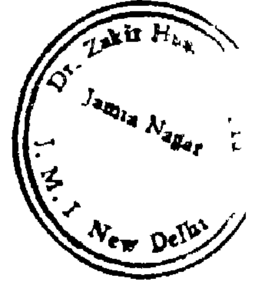
صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا

ماہنامہ

زندگی

رامپور




Jamia Nagar
J. M. I. New Delhi

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر۔ سید احمد قادری)

چندہ سالانہ	
ہندوستان سے -/30	غیر ممالک سے
ششماہی	بذریعہ ہوائی جہاز
ہندوستان سے -/15	-/105
قیمت فی پرچہ -/3	بذریعہ بحری جہاز -/60

جلد: ۷۲ | ربیع الاول سنہ ۱۴۰۴ھ مطابق جنوری ۱۹۸۴ء | شمارہ: ۱

اس دائرہ ⭘ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے پرچہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

منیجر زندگی۔ نئی دہلی۔۲

مالک دعوت ٹرسٹ۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر محمد شفیع قادری مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت۔ دفتر ماہنامہ زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال پر بھی جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۰ نومبر تا ۵ دسمبر ۱۹۸۳ء ایک قرارداد منظور کی ہے۔ اس سے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوتا اور ایک اجمالی خاکہ سامنے آتا ہے۔ اس کی تفصیل اس لیے غیر ضروری ہے کہ مسلمان خود اس صورت حال سے دوچار رہیں اور اس کے بھیانک نتائج بھگت رہے ہیں۔ یہ صورت حال کیوں ہے اور اس کو بدلنے کی تدبیر کیا ہے۔ ہم اسی پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے کہ انڈونیشیا کے بعد شاید اسی کا نمبر ہے اس کے باوجود اس ملک میں اس کی آواز صدا بصحرا کی حیثیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کا اتنا وزن بھی نہیں ہے جتنا بعض ان اقلیتوں کا ہے جن کی تعداد ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کے جواب میں سوچنے سمجھنے والے لوگ یہ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر اتحاد نہیں، ان کا کوئی قائد نہیں۔ یہ منتشر ہیں اور ان کے انتشار کی کوئی حد نہیں ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ مشترکہ مسائل و معاملات میں بھی ان کا اتحاد محض وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے۔ یہ جواب درست ہے لیکن ابھی بات پوری نہیں ہوئی کیونکہ اس جواب پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں اتحاد کیوں نہیں ہے اور مشترکہ مسائل و معاملات میں بھی ان کا اتحاد پائیدار کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امت گروہی اور ذاتی مفادات میں پھنس کر رہ گئی ہے اور تماشا یہ ہے کہ اس کا لیڈر خواہ وہ مذہبی

ہو یا سیاسی، عملاً گروہی و ذاتی مفادات کی دلدل میں خود دھنسا ہوا ہے وہ زبان سے اس کے خلاف زوردار تقریریں کرتا ہے۔ اس کی تقریر کا مطلب شاید یہ ہوتا ہے کہ میری ذات اور میری پارٹی کے علاوہ کسی دوسری ذات اور کسی دوسری پارٹی کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مفادات کا لحاظ کرے۔ غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی پوری ملت کا مفاد پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ ریاستی اسمبلیوں کی ممبری چھوٹی موٹی وزارت و صدارت، کچھ عہدے اور مناصب، بس یہی ہے مسلمان لیڈروں کی طرح اس کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس کے لیے اگر ان کو منکرین خدا کی پارٹیوں کا ممبر بننا پڑے، الحاد کی تائید کرنی پڑے۔ اس ملک میں ملحدانہ نظام حکومت درآمد کرنے کے لیے سعی کرنی پڑے تو اس میں بھی ان کو کوئی باک نہیں ہے۔

یہ تمام باتیں اصل مرض کی علامات ہیں اس امت کا اصل مرض کیا ہے؟

امت کا اصل مرض یہ ہے کہ اپنے مقصد وجود اور مقصد بعثت کو بھول گئی ہے اور اس نے وہ رسی اپنے ہاتھ سے چھوڑ دی ہے جس نے اس کی شیرازہ بندی کی تھی۔ یہ اپنے مرکز سے کٹ کر کٹی ہوئی پتنگ بن گئی ہے۔ یہ داعی کی حیثیت چھوڑ کر مدعو ہو گئی ہے۔ اس کا مقصد وجود یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے قولاً و عملاً حق کی شہادت دے۔ فساد کو روکے، نیکی کو فروغ دے اور برائی کو مٹائے۔ لیکن آج اس کی اکثریت اپنے قول اور عمل سے باطل کی شہادت دے رہی ہے، خود فسادات کا شکار ہے نیکی کو مٹا رہی اور برائی کو فروغ دے رہی ہے۔ اور تشویشناک بات یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ اس کو اپنے مرض کا احساس نہیں ہے بلکہ یہ اس کا انکار کر رہی ہے حالانکہ اس کے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے جس میں قوموں کے عروج و زوال اور ارتقاء و انحطاط کا وہ قانون تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جو اٹل ہے، جس میں کوئی شک نہیں، کسی قسم کا اشتباہ نہیں اور دنیا کی لمبی تاریخ جس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ایک جگہ قرآن عزیز میں پچھلی امتوں کی سرگزشت سنا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت ایسے مشفقانہ انداز میں واضح کی گئی ہے کہ بات دل کے اندر اترجاتی ہے۔ اگرچہ تخاطب عام ہے لیکن امتِ محمدیہ اس میں بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔

"پھر کیوں نہ ان قوموں میں جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں، ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں کے پیچھے پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ (ہود' ۱۱٦)

اس آیت کریمہ کے ایک ایک لفظ سے خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمت اور اپنے بندوں پر اس کی شفقت ٹپکی پڑتی ہے۔ عہدِ حاضر کے ایک مفسرِ قرآن نے تو اس کا مخاطب امتِ محمدیہ ہی کو قرار دیا ہے۔ اس آیت میں قوموں کے عروج و زوال کا جو قانون بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کوئی قوم اس وقت تباہ کی جاتی اور زوال سے دوچار ہوتی ہے جب اس میں فساد اور بگاڑ سے منع کرنے والوں' نیکی اور خیر کی ترغیب دینے والوں اور شر سے ڈرنے والوں کی تعداد اتنی کم ہو جاتی ہے کہ ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے اور اس کی اکثریت' غالب اکثریت' خدا سے بغاوت اور دنیوی عیش و عشرت میں اس طرح مگن ہو جاتی ہے کہ اس کے دل پتھر بن جاتے ہیں اور صلاح و فلاح کی آوازیں اس سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہیں اس وقت اللہ رب العزت اس کی تباہی یا اس کے زوال کا حکم صادر کر دیتا ہے۔ البتہ وہ اپنے کرمِ خاص سے ان تھوڑے سے لوگوں کو بچا لیتا ہے جو صدقِ دل سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اتنے قلیل اور ان کی آواز اتنی کمزور ہوتی ہے جو فساد کو روک نہیں سکتی۔ آج ہمارا ملک جس غلط رخ پر جا رہا ہے اور یہاں کے باشندوں کا جو مزاج بنتا جا رہا اور بنایا جا رہا ہے وہ بے حد تشویشناک ہے۔ اس کو صحیح رخ پر موڑنے کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر ہے۔ اس لیے کہ اسی کے پاس وہ نسخۂ کیمیا ہے جو ہر روحانی بیماری کا واحد علاج ہے لیکن یہ نسخۂ کیمیا جن لوگوں کے پاس ہے اور جو دراصل تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے اس کو نہ وہ خود استعمال کر رہے ہیں اور نہ دوسروں کے سامنے اسے پیش کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگ حقیقی معنے میں اس نسخۂ کیمیا سے واقف بھی نہیں ہیں۔ اس کی تازہ دلیل میناکشی پورم اور رام ناتھ پورم نے مہیا کی ہے۔

تھوڑے سے ہریجنوں نے اسلام قبول کیا اور پورے ملک میں جیسے آگ لگ گئی۔ مسلمانوں کے خلاف اشتعال پیدا کرنے کے لیے جھوٹ' افتراء اور اتہام کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ قبولِ اسلام کو

روکنے کے لیے تنظیمیں وجود میں آگئی ہیں اور سیٹھوں نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے ہیں۔ اس کی وجہ اسلام کے بارے میں برادران وطن کا غلط تصور ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اس قوم کا مذہب ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ خود ان کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی بنا پر وہ اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ اگر اسی طرح لوگ اسلام قبول کرتے رہے اور اس پر روک نہیں لگائی گئی تو ہندوستان مسلمان قوم کے قبضے میں چلا جائے گا اور ہندوؤں کی اعلیٰ نسل اس اقتدار سے محروم ہو جائے گی جو آج اس کو حاصل ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا یہ غلط تصور کیوں ہے؟ اس لیے ہے کہ ہم نے اپنے قول و عمل سے روز روشن کی طرح یہ بات واضح نہیں کی ہے کہ مسلمان نہ اس طرح کی کوئی قوم ہیں جیسی دوسری قومیں دنیا میں آباد ہیں اور نہ دین اسلام کسی خاص قوم کا دین ہے بلکہ فی الواقع یہ تمام بنی نوع انسان کا دین ہے۔ اس نظام زندگی کے تحت اقتدار انسانوں کا نہیں بلکہ انسانوں کے خالق کا ہوتا ہے کسی ملک میں اس دین کے تحت احکام انسانوں کے نہیں بلکہ خدا کے نافذ ہوتے ہیں جو اس کی بھیجی ہوئی کتاب میں ہیں۔ اس دستور حیات کے تحت بحیثیت انسان تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں۔ یہاں نسل، نسب، رنگ، زبان اور وطن کی وجہ سے کسی کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہوتا بلکہ اللہ پر ایمان، اس کی عبادت، اطاعت اور تقویٰ و طہارت کی بنا پر کوئی انسان دوسروں سے ممتاز ہو سکتا ہے؟ اگر برادران وطن اس حقیقت کو سمجھ لیتے اور اس کو ہمارے اعمال کے آئینے میں دیکھ بھی لیتے تو کیا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کا تصور یہی ہوتا جو آج ہے؟ خالق کائنات نے انسانوں کو جس فطرت پر پیدا کیا ہے وہ خیر پسند ہے۔ اسلام، انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں کا پورا جواب ہے۔ انسانوں میں ابوجہل اور ابولہب بہت کم ہوتے ہیں اور آخر کار خیر کی قوت ان کو میدان سے ہٹا دیتی ہے۔

یہی تبلیغ جو قول سے بھی ہو اور عمل سے بھی امت مسلمہ کے لیے واحد راہ نجات ہے ہمیں نہیں معلوم کہ یہ امت کب ادھر رخ کرے گی لیکن یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ جب تک وہ ادھر رخ نہیں کرتی اور اپنا فریضہ حیات ادا نہیں کرتی اس کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور نہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کے آلام و مصائب سے بچ سکتی ہے۔

یہ باتیں ان مسلمانوں کے پلّے نہیں پڑتیں جنھوں نے نہ خود اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ انہیں سمجھانے کی سعی کی گئی ہے اس لیے بہت بڑی ذمہ داری انہیں مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے جو یہ باتیں سمجھتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کرنا اور باشندگان ملک کے ذہنوں کو بدلنا آسان کام نہیں ہے مسلمانوں کو اپنے قول اور عمل اپنی سیاست، معیشت اور معاشرت میں نمایاں تبدیلی لانی ہوگی یعنی پہلے ان کو خود اسلام کے سانچے میں ڈھلنا ہوگا۔ ہم اس پر یقین رکھتے ہیں اس لیے تادم آخر یہی کہتے رہیں گے اور کوشش کے ساتھ یہ دعا بھی کرتے رہیں گے کہ خود ہمارے قول اور عمل میں کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو اسلام کے خلاف ہو۔

اب میں چند الفاظ اپنے آپ سے اور رفقائے جماعت سے عرض کروں گا۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد "شہادت حق" کے بغیر کوئی معنے نہیں رکھتی اس لیے ہم سب کو یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ کیا ہمارے اعمال و افعال کے آئینوں میں حق و صداقت جلوہ گر ہے؟ کیا فی الواقع ہم اسلام کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں؟ کیا ہم اپنے قول، اپنے عمل، اپنی سیاست، اپنی معیشت اور معاشرت میں وہ نمایاں تبدیلی لا چکے ہیں جس کی ضرورت کا اظہار ہم دوسروں کے سامنے کرتے ہیں؟

میرے عزیز رفیقو! ہم میں ہر ایک کو اپنا اپنا یہ جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور یہ جائزہ سرکش نہ بہانہ ساز نفس کے منھ میں تقوے کی لگام ڈال کر لینا چاہیے۔ یہ بات بھی ہم سب کو معلوم ہے کہ جب تک بندہ اپنے مالک اور معبود حقیقی سے ربط و تعلق کو مستحکم نہیں کرتا وہ اس کی نظر عنایت کا مستحق نہیں ہوتا سوچیے کہ اس سے ربط و تعلق کو مستحکم کرنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہم میں سے جو لوگ معیار مطلوب کے قریب پہنچ چکے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ وہ کسی دوسرے پر احسان نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے نفس پر کر رہے ہیں۔ اور جو لوگ اس سے بہت پیچھے ہیں ان کو سعی کرنی چاہیے وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہے ہیں بلکہ اپنے آپ کو پہنچا رہے ہیں۔

تدبرِ قرآن پر ایک نظر

مولانا جلیل احسن ندوی ؒ

تدبر قرآن میں آل عمران آیت ۲۸ کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے :-

"اہل ایمان مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔ مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے۔ اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے"

اور اس کی تشریح میں فرماتے ہیں :-

"مومنین کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان ہیں جو ابھی پوری طرح یکسو نہ ہوئے تھے، بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان رکھتے تھے اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلۂ کار بنا لیتے تھے اور یہ ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان اور اسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے

"کافرین" سے یہاں مراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں ان کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے" (تدبر قرآن جلد اول ۶۶۸، ۶۶۹)

ہماری گزارش یہ ہے کہ "مومنین" کے لفظ کا تتبع واستقراء بتاتا ہے کہ یہ لفظ قرآن مجید میں مخلص اہل ایمان کے ہی معنے میں آیا ہے اس میں منافقین شامل نہیں ہیں جو اسلام کے مستقبل کے بارے میں غیر مطمئن ہونے کے باعث یہود کی طرف میلان رکھتے تھے اور مسلمانوں کے خلاف یہود جو سازشیں کرتے تھے

مددگار بن جاتے تھے۔ نہیں بلکہ مخلص اہل ایمان مراد ہیں جن میں کچھ لوگ اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں اور کچھ کی ابھی پوری طرح تربیت نہیں ہوئی ہے۔ جو لوگ اعلیٰ درجہ کے تربیت یافتہ ہیں وہ کافروں یعنی اہل کتاب اور خاص طور پر اہل یہود سے ان کا ترک تعلق اس ہدایت کی وجہ سے اور بڑھ جائیگا اور جو مخلص کم تربیت یافتہ لوگ ہیں مخالفین سے ترک تعلق کے معاملے میں اپنی روش درست کرلیں گے۔ موالات یعنی دوستی وحمایت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کریں یا کہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو۔

إِلَّا أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً کا ترجمہ مولانا اصلاحی نے یہ کیا ہے۔

"مگر یہ کہ ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے"

حالانکہ اِلّا یہاں منقطعہ ہے اور الّا منقطعہ کے بعد آنے والا اسم لفظاً منصوب ہوتا ہے اور محلاً مرفوع ہوتا ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے۔ خبر بالعموم لفظوں میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ محذوف ہوتی ہے اور الّا منقطعہ کا ترجمہ "البتہ" اور "لیکن" سے کرنا چاہیے۔ یہاں بھی خبر محذوف ہے اس کا ترجمہ زیادہ صحیح الفاظ میں یہ ہے :۔

"البتہ کافروں سے مکمل طور پر بچنا یہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے یا یہ کہ مومنین پر واجب ہے"

مولانا اصلاحی صاحب نے آلعمران آیت ۲۳ کا یہ ترجمہ دیا ہے :۔

"ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ عطا ہوا، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جارہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ منہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں" (تدبر قرآن، جلد اول صفحہ ۶۶۱)

اور تشریح کے ضمن میں نصیبًا من الکتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :۔

"نصیبًا من الکتاب سے مراد تورات اور انجیل وغیرہ ہیں اور کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے جس طرح پچھلے آسمانی مذاہب اور شریعت اسلامی میں نسبت جزو و کل کی ہے اسی طرح دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں بھی نسبت جزو و کل کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کے تدریجی ارتقاء کے لحاظ سے درجہ بدرجہ

عطا ہوتی ہے جب تک انسان کامل شریعت اور کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل شریعت اور کامل کتاب نہیں دی گئی بلکہ اس کے حالات اور اس کی ضروریات کے مطابق کتاب دی گئی لیکن یہ کتاب اصلاً اس کامل شریعت اور اس کامل کتاب ہی کا حصہ ہے جو اس کے لیے پہلے سے خدا کی اسکیم میں مقرر تھی۔ انبیائے بنی اسرائیل نے جو تعلیم دی وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی تعلیم کا اتنا حصہ تھا جو ان کے دور اور ان کے حالات کے لیے موزوں تھا۔ اسی طرح تورات اور انجیل قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں بلکہ اسی صحیفہ کامل کے اوراق تھے جو آخری امت سے پہلے کی امتوں کے لیے نازل ہوئے۔ اسی طرح گویا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتاب الٰہی کے مختلف حصے اور مختلف ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصلاً اور قطعاً ان میں کامل ہم آہنگی و ہم رنگی ہے۔ اگر تورات اور انجیل میں ملاوٹ اور تحریف نہ واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نظر نہ آتا۔"

(تدبر قرآن جلد اول ص ۲۶۲)

مولانا اصلاحی کے مندرجہ بالا اقتباس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں مثلاً صحیفہ موسیٰ اور صحیفہ ابراہیم میں نسبت جزو و کل کی ہے۔ جب تک انسانی معاشرہ کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل کتاب کا ایک حصہ ان کو دیا گیا۔ گویا قرآن کتاب الٰہی ہے اور دوسری کتابیں اس کے مختلف ابواب اور مختلف حصوں کی حیثیت رکھتی ہیں ہم کو اس سے سخت اختلاف ہے۔ ہر کتاب جو خدا کی طرف سے آئی وہ کامل آئی کسی کامل کتاب کے مختلف ابواب اور مختلف حصے نہیں آئے۔ یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے کہ تورات اور صحیفہ ابراہیمی اور دوسرے انبیاء پر نازل ہونے والے صحیفے ناقص ہوں۔ اس کے برعکس صحیح بات یہ ہے کہ ہر کتاب جو کسی قوم میں آئی اس کی حیثیت قرآن کی تصریح کے مطابق کتاب منیر ہدیٰ، ضیاء، نور کی حیثیت رکھتی تھی فرق اگر کچھ ہو سکتا ہے تو نقص و کمال کا نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کا ہو سکتا ہے۔ انسانی معاشرے کی حیثیت ہمیشہ ایک رہی ہے۔ عبادات، معاملات، اخلاق، حلال و حرام، نکاح و میراث کے مسائل تمام

آسمانی کتابوں میں یکساں تھے اور یں فرق صرف جزوی معاملات میں ہو سکتا ہے مثلاً وضو تمام انبیاء کے یہاں ہے، البتہ یہ کہ تین مرتبہ اعضاء وضو دھوئے جائیں یا دو مرتبہ اس میں اختلاف ہو سکتا ہے باقی دین کے تمام اساسیات تمام انبیاء کے یہاں یکساں ہیں اور یکساں ہی ہونے چاہئیں۔

نصیبًا من الکتاب کا یہی ترجمہ کیوں ہو جو صاحب تدبر نے کیا ہے یعنی " ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا" یہ مطلب کیوں نہیں ہو سکتا کہ نصیبًا میں تنوین تفخیم شان کے لیے ہے اور مِن بیانیہ ہو جس کا ترجمہ یوں ہو گا۔

" کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جن کو بہت بڑی خوش نصیبی یعنی کتاب دی گئی تھی "

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، آیات ۵۴ تا ۶۳ کی تفسیری تمہید میں فرماتے ہیں :-

" اب یہ وہ اصل بات آ رہی ہے جو درحقیقت سورہ کا عمود ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں خطاب نصاریٰ سے ہے اور مقصود ان پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے باب میں حقیقت حال کا اظہار ہے۔ اوپر خاندان عمران کا شجرہ، حضرت مریم کی ولادت اور ان کے بارے میں ان کی ماں کی نذر، حضرت زکریا کی بیٹے کے لیے دعا اور حضرت یحییٰ کی ولادت کے واقعات جو بیان ہوئے ہیں سب حضرت عیسٰیؑ کے ذکر کی تمہید تعریف کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔　　　　(تدبر جلد اول صفحہ ۶۸۸)

یہ مولانا کی رائے ہے اور ہماری رائے یہ ہے کہ اس سورہ میں بھی بقرہ کی طرح اہل کتاب بالخصوص یہود کو مخاطب بنایا گیا ہے اور اس میں بھی یہود سے خصوصی خطاب ہے۔ بقرہ میں ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور آل عمران میں ان کو اطاعت کی دعوت دی ہے یعنی اس نظام اطاعت میں داخل ہونے کی فہمائش کی گئی ہے جو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا تھا محض یہ بات کہ سورۂ آل عمران میں الوہیت مسیح کی تردید تفصیل سے کی گئی ہے اور بقرہ میں اجمال کے ساتھ۔ محض اتنی سی بات کافی نہیں ہے اس دعوے کے لیے کہ آل عمران کے مخاطب خصوصی نصاریٰ ہیں۔ قرآن کی دعوت کے اصل حریف یہود تھے اور وہ مشرکین کی مخالفت کی شدت کے محرک تھے۔ نصاریٰ کی حیثیت ثانوی تھی اور ان کی مخالفت اتنی شدید نہیں تھی۔ مسلمانوں کے پاس مدینے میں تو یہود تھے ان کی بستیاں

مدینہ سے باہر بھی بسی ہوئی تھیں اس لئے ہمارے نزدیک اصل خطاب یہود سے ہے نہ کہ نصاریٰ سے ہماری تائید میں بہت سے دلائل کے علاوہ خود مولانا فرماتے ہیں :۔

"ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے ۔ یعنی نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات لوگوں پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً دونوں میں یکساں شرح و بسط کے ساتھ دین کی اصولی باتوں پر بحث ہوئی ہے ۔ دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی ہے ۔ یعنی الٓمٓ دونوں شکلاً بھی ایک ہی تنے سے پھوٹی ہوئی دو بڑی بڑی شاخوں کی طرح نظر آتی ہیں ۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو شمس و قمر سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی ۔ اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ وصف اور تمثیل میں یہ اشتراک بغیر کسی گہری مناسبت کے نہیں ہو سکتا ۔ دونوں میں زوجین کی سی نسبت ہے ایک میں جو بات مجمل بیان ہوئی ہے ۔ دوسری میں اس کی تفصیل بیان ہو گئی ہے ۔ اسی طرح ایک میں جو خلا رہ گیا ہے دوسری نے اس کو پُر کر دیا ہے ۔ گویا دونوں مل کر ایک اعلیٰ مقصد کو اس کی مکمل شکل میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں ۔"

(تدبر قرآن اول ص۶)

رہا یہ سوال کہ خاندان عمران کا شجرۂ حضرت مریم کی ولادت اور ان کی ماں کی نذر، حضرت زکریا کی بیٹے کے لیے دعا اور حضرت یحییٰ کی ولادت کے واقعات جو بیان ہوئے ہیں وہ اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ سورہ کا خطاب نصاریٰ کے لیے مخصوص مانا جائے قبل اس کے کہ ان مذکورہ بالا آیتوں تک پہنچیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی رائے کے دلائل خود اسی سورہ سے پیش کر دیے جائیں ۔

(۱) آل عمران آیت ۳ میں تورات اور انجیل دونوں کے نازل کیے جانے کا ذکر ہے ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل کتاب کے دونوں گروہ مخاطب ہیں ۔ تورات گروہ پہلے اور انجیلی لوگ دوسرے نمبر پر۔

(۲) آیت ۴ کے آخر میں ان الذین کفروا بآیات اللہ لھم عذاب شدید آیا ہے یعنی جو لوگ قرآن کی شکل میں آیات اللہ کا انکار کر رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے ظاہر ہے انکار کرنے والے سب سے پہلے یہود ہیں پھر نصاریٰ اور الذین کفروا سے صرف نصاریٰ کو مخاطب قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔

(۳) آیت ۷ میں آیات محکمات اور آیات متشابہات کی صورت میں قرآن کی تقسیم کی گئی ہے اس کے بعد اہل کتاب میں سے بالخصوص ٹیڑھے دل والے لوگوں کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا ذکر ہے آیت کے الفاظ یہ ہیں۔ اَلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ اور معلوم ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں جیسا کہ سورۂ صف میں آیت ۵ میں فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ (جب یہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ یعنی جب انھوں نے گمراہی پسند کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو ایسا بنا دیا کہ وہ ہمیشہ ٹیڑھے رخ پر سوچیں) یہاں جن لوگوں کو اھل زیغ کہا گیا ہے اس سے مراد صرف یہود ہیں نصاری کو نہیں لیا جا سکتا۔ نیز اسی آیت ۷ میں الراسخون فی العلم آیا ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحیح تورات پر عمل کرتے تھے اور اپنی قوم کے علماء کی تحریفات و بدعات سے قطعاً کنارہ کش تھے ان کو تورات کا بہت گہرا علم تھا تورات میں ان کے علم کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ یہی لوگ نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لائے کیونکہ تورات میں آپ کی پیشین گوئیاں درج تھیں اور وہ نئے نبی کی بعثت کا انتظار کر رہے تھے یہ بات کہ ہم صرف یہودی علماء صالحین کو مراد لیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ نساء میں یہودی مخالفین کے کرتوت بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْھُمْ کے الفاظ آئے ہیں اس سے مراد یہود کے علماء صالحین کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس جملہ کی پہلے کی آیتوں اور بعد کی آیتوں میں یہودی کا ذکر ہے اور نصاریٰ کا ذکر تو آیت ۱۷ سے شروع ہوتا ہے۔ انہیں یہودی علماء صالحین کی دعا کے الفاظ یہ ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا (یعنی ہم اے خدا تیرے قانون ضلال کی زد میں نہ آئیں ہم ایسا کام کریں کہ تیری طرف سے ہمیں ہدایت اور استقامت علی الحق کی توفیق ملے۔

(۴) جو بات آیت ۷ میں مجملاً کہی گئی تھی اسی کی توضیح آیت ۱۱، ۱۲ میں کی گئی ہے۔ اس میں بھی اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا کے الفاظ دو مرتبہ آئے ہیں جس سے اہل کتاب کے دونوں گروہ مراد ہیں لیکن پہلے نمبر پر یہود ہیں۔

(۵) آیت ۲۱ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں اللہ کی آیتوں کا انکار کرنے والوں نبیوں کو قتل کرنے والوں اور دوسرے داعیان حق کو قتل کرنے والوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں مراد صرف یہود ہیں اور جو الزام یہاں یہود پر عائد کیا گیا ہے وہی الزام سورۂ بقرہ آیت ۶۱

اور ۸۷ اور آیت ۹۱ میں یہود پر عائد کیا گیا ہے اور آگے سورہ آل عمران میں بھی آیت ۱۸۱ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ غرض ان آیات میں صرف یہود مراد ہیں نصاریٰ کسی طرح مراد نہیں ہو سکتے۔

۶۔ آیت ۳۱ میں اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ کے الفاظ آئے ہیں یہود اور نصاریٰ دونوں اللہ کے محبوب ہونے اور اللہ سے محبت کرنے کے دعوے دار تھے جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۱۸ میں بیان ہوا ہے۔ یہاں بھی یہود و نصاریٰ دونوں مراد ہیں لیکن یہود زیادہ زور کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے تھے اس لیے ان سے کہا گیا کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنے کے دعوے دار ہو تو میری پیروی کرو یعنی مجھ پر ایمان لاؤ تب اللہ تعالیٰ کے تم محبوب ہوگے۔ آیت ۳۱ میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو متکلم بنایا گیا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں خدا خود متکلم کی حیثیت میں بتاتا ہے کہ اس رسول کے نظام اطاعت میں داخل ہو تب اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنائے گا ورنہ اگر موجودہ انکار کی روش پر قائم رہو گے تو خدا اعلان کرتا ہے کہ نہ تم اس کے محبوب ہوگے اور نہ محب ہوگے۔

(۷) آیت ۳۳ تا آیت ۵۵ میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس کا مقصد صرف الوہیت مسیح کا ابطال نہیں ہے بلکہ اصل مقصد جو ہماری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کے شروع سے آیت ۳۲ تک جو بات ثابت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے دونوں گروہ یہود و نصاریٰ اور بالخصوص یہود اس نظام اطاعت کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم لیکر آئے بلکہ یہ لوگ اس کے خلاف ہر طرح کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔

انھوں نے خدا کے آخری پیغمبر کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا ہے جو سلوک انھوں نے اسرائیلی آخری پیغمبر حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے ساتھ روا رکھا۔ انھوں نے گہوارہ میں حضرت مسیح کے بولنے کے وقت سے لیکر نبی بننے تک اپنے لیے انہیں نشانی رحمت جانا لیکن جب انھوں نے نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے بعد سوسائٹی کے ارباب اقتدار علما و صوفیا اور امرا کو اصلاح حال کی دعوت دینی شروع کی تب یہ ان کے دشمن ہو گئے اور مریم جیسی عالمہ فاضلہ عفیفہ اور پاکدامن عورت کو زانیہ بنایا اور حضرت مسیح کو ولد الزنا قرار دیا۔ صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ فلسطین کے علاقے کی عیسائی حکومت کے گورنر سے جا جا کر شکایت کرتے تھے کہ یہ آپ کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارنے میں ان کو گرفتار کر لیا جائے ان کو پھانسی دے دی جائے، سولی پر لٹکا دیا جائے لیکن نبیوں پر اللہ تعالیٰ ہیبت کی

چادر ڈال دیتا ہے اس لیے ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ گورنر نے ان کی مسلسل شکایتوں کو نظرانداز کرتا رہا یہودی علماء ان کو رات دن قتل کرنے کی تدبیریں کرتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہوئے

یہاں پر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت ۳۳ کے مضمون کی تھوڑی تفسیر کر دی جائے۔ اس آیت میں آل ابراہیم کا لفظ آیا ہے جس سے مراد صرف عرب ہیں کیونکہ یہود نے کبھی بھی اپنے آپ کو ابراہیم کی طرف منسوب نہیں کیا انھوں نے ہمیشہ اپنے کو بنی اسحاق کہا یا بنی اسرائیل کہا۔ یہ صرف عرب ہیں جو اپنی نسبت ابراہیم کی طرف کرتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ نساء آیت ۵۴ میں یہی لفظ آیا ہے اور وہاں عربوں کے سوا اور کسی کو مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ غرض یہاں آل ابراہیم سے عرب مراد ہیں جن کے اندر نبی صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے جس کا یہ لوگ انکار کر رہے ہیں۔ انکار ہی نہیں بلکہ شدید دشمن بنے ہوئے ہیں اور آل عمران کا ذکر حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی مناسبت سے ہوا ہے۔ عمران اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور متقی اور پرہیزگار آدمی تھے ان سے مریم جیسی پیکر عصمت وعفت اور عاملہ فاضلہ لڑکی پیدا ہوئی جس پر یہود نے زنا کی تہمت لگائی اور ان کے بیٹے کو ولدالحرام کہا اور یہاں تک آگے چلے۔ یہاں تک کہ حضرت مسیح کی دعوت کو انھوں نے ماننے سے انکار کیا اور ان کے خلاف سازشیں کیں جس کی تفصیل ہم اوپر کر آئے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ آیت ۳۳ سے اوپر کیا مضامین بیان ہوئے ہیں اور آیت ۳۳ میں اس طرح تمہید کیوں اٹھائی گئی ہے۔ آیت کا مطلب تو یہ ہے جو خدائی نظام آدم اور نوح اور ربیع کے پیغمبر لائے تھے وہی نظام نبی عربی اور حضرت مسیح لائے تھے۔ ان کے دعوتی نقاط ایک تھے سر مو کوئی فرق نہیں تھا لیکن تم نے اے یہود نہ اپنے آخری اسرائیلی پیغمبر کو مانا اور نہ ان کو ماننے کو تیار ہو جو تمہاری بدقسمتی سے عرب قوم میں مبعوث ہوا جس طرح مسیح کے بارے میں تمہاری سازش ناکام ہوئی اسی طرح اس نبی کے سلسلے میں تمہاری سازش ناکام ہو کر رہے گی اور جس طرح حضرت مسیح کی حفاظت کا اللہ نے انتظام کیا اسی طرح موجودہ رسول کی حفاظت کرے گا۔ تم اپنی سازش میں ناکام ہوگے۔ اس کے مابعد آیت ۵۵ میں فرمایا " ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ ۔ اس میں خطاب یہود سے ہے یعنی دنیا میں رسول کے خلاف سازش ناکام ہوگی اور تم خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہروگے اور پھر دنیا میں تم اور تمام مومنین جو قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ تم دونوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردوں گا جو منکر ہیں ان کو سخت سزا دوں گا اور وہ اپنا کوئی بھی حامی و ناصر نہیں پائیں گے اور اہل ایمان صالحین

کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ ملے گا اس کے بعد آیت ۵۹ تا ۶۳ میں صرف نصاریٰ کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور الوہیت مسیح کا ابطال کیا گیا ہے ۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ آیت ۳۱ سے جو سلسلہ کلام چلا ہے اس کا اصل مقصد الوہیت مسیح کا ابطال نہیں ہے بلکہ یہود کے بارے میں یہ بتانا ہے کہ انھوں نے اپنے آخری اسرائیلی پیغمبر کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہی سلوک ابراہیمی پیغمبر کے ساتھ کر رہے ہیں ۔ اگرچہ ضمناً حضرت مسیح کی الوہیت اور مریم کی الوہیت دونوں کا ابطال ہو گیا ہے ۔ اصل میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کسی سلسلہ کلام سے پہلے کیا بحث ہو رہی تھی اور آخر میں بات کہاں پہنچی ہے ۔ اس لحاظ سے مولانا اصلاحی صاحب کو غور کرنا چاہیے ۔

تصحیح

ماہنامہ زندگی شمارہ دسمبر ۱۹۸۳ء میں بعض بڑی غلطیاں رہ گئی ہیں اس لیے ان کی تصحیح ضروری ہے "تدبر قرآن پر ایک نظر" ص ۸ سطر ۷ عبارت چھوٹ گئی ہے اس کو اس طرح درست کر لیجیے ۔

"خدا تمہارے صدقات کا محتاج نہیں ہے ۔ اگر وہ تم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ تمہارے مال" ―― ص ۳۸ پر اسی مضمون کا جو بقیہ ہے وہ غلط ہے اس کو قلم زد کر کے کسی کاغذ پر درج ذیل عبارت لکھ کر وہاں چپکا دیں ۔

"پوچھتے ہوئے ہیں کہ کتنا انفاق کریں جو اعلائے کلمۃ اللہ کی مہم میں ضروری ہے ۔ اور پوچھ وہ رہے ہیں جو اس مہم کے لیے پورا انفاق کر رہے ہیں ۔ اتنا انفاق کر رہے ہیں کہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ والدین، قرابت مندوں اور محتاجوں کے حقوق پس پشت نہ ڈال دیں ۔ اس لیے خدا نے انفاق میں توازن کی تعلیم دی ہے اس کے بالکل برعکس مولانا اصلاحی صاحب "کچے اور بخیل" لوگوں کا کردار پیش کر رہے ہیں ۔ حالانکہ یہاں سیاق و سباق میں دور دور تک کہیں ان کچے لوگوں کا ذکر نہیں ہے"

ص۱۱ سطر ۱۰ "تک" کا لفظ کاٹ دیجیے ۔ ص۱۱ آخر سے سطر ۴ "مئی ۱۹۸۲ء" غلط ہے ۔ اسی طرح ۱۹۸۲ء غلط ہے ۔ دونوں جگہ ۱۹۸۳ء بنا لیجیے ۔ ص۴۹ بقیہ تنقید و تبصرہ کی پہلی سطر میں لفظ "کمیکیاں" غلط ہے ۔ کمیاں بنا لیجیے ۔

انبیائے کرام کی اعجاز بیانی

(دوسری قسط)

(جناب عبداللہ فہد علی گڈھ)

حضرت یوسفؑ کی تاویل احادیث

بلاغت کا ایک بہترین اسلوب یہ ہے کہ حکمت اور خوبصورتی کے ساتھ گفتگو کو اپنے مقصد کی طرف موڑ دیا جائے۔ سورۂ یوسف کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو اس فن سے خصوصیت سے نوازا تھا۔[۵] آپ نے اس فن کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے حق میں استعمال کیا۔ جب دونوں آدمیوں نے جیل میں عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے خوابوں کی تعبیر پوچھی تو آپ نے جواب دیا کہ میں تعبیر تو ضرور بتادوں گا مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے جس کی بنا پر میں تمہیں تعبیر دیتا ہوں۔ اس طرح ان کی باتوں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ ان کے سامنے دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

"قید خانہ میں دو نوجوان اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے۔ ایک روز ان میں سے ایک نے اس سے کہا۔ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں۔"
دوسرے نے کہا۔ "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے ان کو کھا رہے ہیں۔"
دونوں نے کہا۔ "ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں۔"
یوسفؑ نے کہا۔ "یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے ان خوابوں کی تعبیر میں تمہیں بتادوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اپنے بزرگوں

ابراہیم اسحاق اور یعقوب کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

اے زنداں کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا کسی کی بندگی تم نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریقہ زندگی ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اے زنداں کے ساتھیو! تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب کو (شاہ مصر کو) شراب پلائے گا۔ رہا دوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے۔"　　(یوسف: ۳۶ تا ۴۱)

یہ ہے اظہار مدعا کے لیے حصول موقع کی بہترین مثال۔ یوسف علیہ السلام کا بہترین طرز استدلال جس نے یقیناً مخاطبین کے دلوں کو چھو لیا ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ دعوت دین کا صحیح اور منطقی ڈھنگ کیا ہے۔ یوسفؑ نے اپنی اس تقریر میں دین کے نقطۂ آغاز سے بات شروع کی اور توحید اور شرک کا فرق ابتداہی میں واضح کر دیا۔ یہ جوان جو نوکر پیشہ غلام تھے۔ اس بات کو خوب محسوس کر سکتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا اور سارے جہان کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑ دو اور میرے دین میں آجاؤ بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو اللہ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہم کو کسی کا بندہ نہیں بنایا مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کے اپنے رب بنا کے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر بھی تنقید کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری کے ہر شائبے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو

تم اَن داتا، کسی کو خداوند نعمت، کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا مختار صحت و مرض وغیرہ کہتے ہو یہ سب خالی نام ہی ہیں۔ ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی یا خداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔[۵]

حضرت یوسف علیہ السلام کی تاویل احادیث کی یہ صلاحیت اس وقت بھی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے جب آپؑ کے گہرے علم اور سلوک سے آپ کی حقیقی محبت سے متاثر ہو کر بادشاہ مصر قید خانے سے آپ کو نکالنا چاہتا ہے تاکہ حکومت کی کنجیاں آپ کے حوالے کر دے اور ملک کا انتظام آپ کی مرضی کے مطابق چلے۔ اس موقع پر یوسف علیہ السلام اپنی بے گناہی اور معصومیت و پاکبازی کے ثبوت کی خاطر موقع محل کو لیتے ہیں اور قید خانے سے نکلنے سے پہلے ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ بادشاہ مصر، اس کی بیوی اور تمام سب پر آپ کی برات واضح ہو جاتی ہے۔

"بادشاہ نے کہا۔ اسے میرے پاس لاؤ۔ مگر جب شاہی فرستادہ یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔" اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ حاشا للہ! ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔ عزیز کی بیوی بول اٹھی۔ اب حق کھل چکا ہے۔ وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ بالکل سچا ہے۔"

(یوسف، ۵۰، ۵۱)

حضرت عیسٰے علیہ السلام کی تمثیلات

حضرت عیسٰے علیہ السلام کی تمثیلات قرآن میں مذکور نہیں ہیں لیکن انجیل کے دوسرے حصہ عہد نامہ عتیق کے مطالعہ سے اور انجیل برنا باس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ نے آپ کو زبردست ادبی قوت عطا فرمائی تھی۔ تمثیل اور مجازنہ بلاغت کا اعلیٰ ترین اسلوب ہے اور اس اسلوب سے حضرت عیسٰے پوری طرح مزین تھے مشتے نمونہ از خروارے۔ چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں۔

پہاڑی کے وعظ میں قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"کوئی شخص کسی طرح دو حاکموں کی جو باہم دشمن ہوں، خدمت نہیں کر سکتا کیونکہ اگر ایک تم سے محبت رکھے گا تو دوسرا دشمنی کرے گا۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم خدا اور دنیا کی خدمت نہیں کر سکتے کیونکہ دنیا جھوٹ، بوالہوسی اور کینے میں پڑی ہے۔ پس تم دنیا میں سکون نہیں پا سکتے سوا اذیت اور گھاٹے کے"

(متی باب ۶ ص ۲۴، لوقا باب ۱۶ ۱۳)

زہد و قناعت کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"تم زائروں کی طرح سفر میں ہو۔ کیا زائر اپنی راہ میں محلوں اور کھیتوں اور دوسرے دنیوی معاملات سے خود کو زیر بار کرتا ہے؟ ہرگز نہیں، وہ سڑک پر فائدے اور سہولت والی ہلکی چیزیں لیکر چلتا ہے پس تمہارے لیے یہی مثال ہونی چاہیے اور اگر تم کوئی اور مثال چاہو تو وہ بھی میں تمہیں دیتا ہوں تاکہ جو کچھ میں تم سے کہوں وہ تم کرو۔

اپنے دلوں کو دنیوی خواہشوں سے بھاری نہ کرو کہ ہمیں کون پہننے کو دے گا؟ یا ہمیں کون کھلائے گا؟ بلکہ پھولوں اور درختوں اور پرندوں کو دیکھو جنہیں ہمارا خداوند خدا سلیمان کی طرح شان و شوکت سے بڑھ کر شان و شوکت سے پہناتا اور غذا دیتا ہے اور وہ تمہیں بھی غذا پہنچانے پر قادر ہے   (پہاڑی کا وعظ ص ۴۰، انجیل برنابا)

قرآن کہتا ہے کہ تم اس دنیا میں خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے آخرت میں اس کا کئی گنا اجر پاؤ گے حضرت عیسےٰ اسی بات کو تمثیل کے پیرائے میں یوں کہتے ہیں۔

"مجھے ذرا بتاؤ تو، اگر تم اپنا روپیہ کسی ساہوکار کی کوٹھی میں جمع کرو اور وہ تمہیں دس گنا اور بیس گنا دے تو کیا تم ایسے آدمی کو اپنا سب کچھ نہ دے دو گے؟ مگر میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ خدا کی محبت میں جو کچھ دو گے یا چھوڑو گے اس کے بدلے تمہیں سو گنا واپس ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی۔ پھر سوچ لو، خدا کی خدمت پر تمہیں کتنا قانع رہنا چاہیے"

(متی باب ۱۹، ۲۹)

اپنے ساتھیوں کو حلم و بردباری اور بدی کا جواب نیکی سے دینے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"پس اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو تم اسے مارنے کے لیے دوسرا گال بھی

پیش کردو۔ بدی کے بدلے بدی نہ کرو کیونکہ یہ تو بدترین جانور بھی کرتے ہیں بلکہ بدی کے بدلے بھلائی کرو۔ اور جو تم سے دشمنی کریں ان کے لیے خدا سے دعا کرو۔ آگ سے آگ نہیں بجھتی بلکہ پانی سے، اسی طرح میں تم سے کہتا ہوں کہ تم بدی پر بدی سے غالب آسکو بلکہ بھلائی سے۔" (متی باب ۵ ۳۹، ۴۴)

انسان کو خدا کی وفاداری اور اطاعت گزاری پر آمادہ کرنے کے لیے یہ پیرایۂ بیان اختیار فرمایا:۔

"اے نادانو! اگر تم یہ خیال کرو کہ کتا جو عقل نہیں رکھتا اپنے مالک کے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔ تو تم میرا کہا صحیح جانو گے مجھے بتاؤ۔ کیا کتا مالک کے گھر کی نگہبانی کرتا اور ڈاکو کے مقابلے میں اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے؟ ہاں بے شک، مگر اسے صلہ کیا ملتا ہے؟ بہت سی مار، زخم اور تھوڑی روٹی اور وہ اپنے مالک کے سامنے ہمیشہ مسرور شکل لیکر آتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"سچ ہے اے استاد" شاگردوں نے جواب دیا۔

تب یسوعؑ نے کہا۔ اب سوچو کہ خدا نے انسان کو کتنا کچھ دیا ہے۔ مگر تم دیکھو گے کہ وہ کتنا بے ایمان ہے کہ اس عہد پر قائم نہیں جو خدا نے ابراہام اپنے بندے سے کیا؟ (سموئیل باب ۱ ۴۲)

ایک بار ایک فقیہ نے پوچھا کہ استاد سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا:۔

"مکان کی سب سے بڑی تباہی کون سی ہے؟ پھر اپنی انگلی سے بنیاد کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔ "اگر بنیاد اکھڑ جائے تو مکان فوراً اس طرح گر کر تباہ ہو جاتا ہے۔ کیا اس کو پھر سے تعمیر کرنا پڑتا ہے لیکن اگر کوئی اور حصہ ٹوٹ جائے تو اس کی مرمت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح میں تم سے کہتا ہوں کہ بت پرستی سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ یہ آدمی کو ایمان یعنی خدا سے محروم کر دیتی ہے۔" (استثنار باب ۶ ۵)

قتل انبیاء کو قرآن نے بنی اسرائیل کا سب سے بڑا جرم بتایا ہے اور ان کی تباہی و زوال کے منجملہ اسباب میں سے ایک سبب اسے بھی قرار دیا ہے۔ دیکھیے حضرت مسیح اس شناعت کو کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

"میں تمہارے آگے ایک مثال رکھتا ہوں۔ ایک مکان دار تھا جس نے ایک تاکستان لگایا اور اس کی باڑھ بنائی کہ جانوروں سے پامال نہ ہو اور اس کے بیچ میں اس نے شراب کے لیے بھٹی بنائی اور پھر باغبانوں کو ٹھیکے پر دے دیا۔ اس کے بعد جب شراب جمع کرنے کا وقت آیا تو اس نے اپنے نوکر بھیجے جنہیں باغبانوں نے دیکھا تو کچھ کو سنگسار کیا اور کچھ کو بھلا دیا اور اوروں کو چھری سے پھاڑ دیا اور ایسا انھوں نے کئی بار کیا۔ بتاؤ تاکستان کا مالک باغبانوں سے کیا سلوک کرے گا؟"

حواریوں نے کہا "وہ انھیں بری طرح ہلاک کر دے گا اور اپنا تاکستان دوسرے باغبانوں کو دے دے گا"

تب حضرت عیسٰےؑ نے کہا "تم جانتے نہیں کہ تاکستان اسرائیل کا گھرانا ہے اور باغبان یہوداہ اور یروشلم کے لوگ ہیں۔ وائے تم پر کیونکہ خدا تم پر غضبناک ہے کہ تم نے خدا کے نبیوں کو قتل کر ڈالا۔ یہاں تک کہ ابھی اب کے وقت میں خدا کے مقدسوں کو کوئی دفن کرنے والا بھی نہ ملتا تھا۔　　(متی باب ۲۱ ۳۳ تا ۴۱)

یہ اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ حضرت مسیحؑ کو افہام و تفہیم اور ابلاغ و تبلیغ کا زبردست ملکہ عطا ہوا تھا۔ مشکل سے مشکل بات کو سادہ تمثیل کے پیرائے میں اس طرح بیان کر دیتے تھے کہ مخاطب فوراً مفہوم و مراد کو پا لیتا اور اصل نشانہ پر براہ راست زد بھی نہ پڑتی تھی کہ ناحول آپ کی دعوت کو سننے سے انکار کر دے۔ یہ داعی کی دعوت اور اس کی زبان کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ امثال حِکَم، استعارات و تشبیہات اور مجاز و کنایہ کے پیرایہ میں تلخ سے تلخ بات بھی کہہ دیتا ہے اور مخاطب اسے گوارا کر لیتا ہے لیکن مفہوم و منشا بالکل واضح ہوتا ہے۔

رسول اکرمؐ کے جوامع الکلم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزۂ قرآن کے ساتھ ایک اور معجزہ عطا کیا گیا تھا اور وہ احادیث کا معجزہ تھا۔ آپ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپ جوامع الکلم سے نوازے گئے تھے۔ احادیث نبویؐ میں ارشادات رسالتمآبؐ کے جو اجزا پائے جاتے ہیں وہ اپنے اندر موتیوں کی سی شان رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ، ان کا خوش آہنگ گٹھاؤ، ان میں معنوی گہرائی، دل پر اثر کرنے والی روح، سہل بیانی اختصار اور جامعیت کلام نبوی کے امتیازات میں سے ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کہا کرتے تھے کہ "میں سارے عرب

میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سنا ہے لیکن آپ سے بڑھ کر فصیح کلام کسی اور سے نہیں سنا۔ ایک بار حضور سے دریافت فرمایا۔ آپ کو یہ ادب کس نے سکھایا؟ فرمایا: "میرے رب نے مجھے ادب کی تعلیم دی ہے"[۱] ۔ ایک تو آپ قریشی تھے دوسرے آپ نے اپنا بچپن بنی سعد میں گذارا تھا جن کی زبان ٹھیٹھ عربی تھی اسی بنا پر آپ فرمایا کرتے تھے:۔

انا اعربکم انا قریشی و	میں تم میں سب سے زیادہ عربی داں ہوں
استرضعت فی بنی سعد	میں قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر میں
بن بکر[۲]	میری رضاعت کا زمانہ گذرا ہے۔

آپ کی باتوں میں جو شیرینی لطافت اور دل ربائی و رعنائی تھی اس کا جواب نہ تھا۔ کلام اس قدر جامع و مانع، فصیح و بلیغ اور سہل ممتنع ہوتا تھا کہ کسی دوسرے انسان کے بس سے باہر تھا۔ ایک بار حضرت علیؓ نے سوال کیا کہ اپنے طریقے کی وضاحت کیجیے تو آپ نے اس کا جو تاریخی جواب دیا وہ حکمت انسانی کا جامع ترین نمونہ اور فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ فرمایا:۔

معرفت میرا سرمایہ ہے۔ عقل میرے دین کی اصل ہے۔ محبت میری بنیاد ہے۔ شوق میری سواری ہے۔ ذکر الٰہی میرا مونس ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے۔ حزن میرا رفیق ہے۔ علم میرا ہتھیار ہے۔ صبر میرا لباس ہے۔ رضائے الٰہی میری غنیمت ہے۔ عجز میرا فخر ہے۔ زہد میرا روزگار ہے۔ یقین میری قوت ہے۔ صدق میری سفارش ہے۔ جہاد میرا کردار ہے۔ طاعت میری پناہ ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے[۳]

آپ کی قوت خطابت سحر کی تاثیر رکھتی تھی جس میں عقل کے ساتھ جذبات کو بھی اپیل کیا جاتا تھا۔

یہاں ہم آپ کا وہ خطبہ نقل کر رہے ہیں جو آپ نے اس وقت دیا جب معرکہ حنین و طائف کے بعد مال غنیمت کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس وقت آپ نے مولفۃ القلوب کو بہت سا حصہ دے دیا تاکہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور اسلامی اخوت اور رشتہ محبت میں وہ منسلک ہوسکیں۔ اس موقع پر کچھ انصاری نوجوانوں نے عجیب سے احساسات کی لہر دوڑا دی۔ کہا گیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قریش کو خوب انعامات دیے اور ہمیں محروم رکھا۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ آپ نے سب کو خیمہ میں جمع کیا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد ان کے سامنے یہ تقریر کی۔

اے گروہ انصار! یہ کیسی چہ میگوئیاں ہیں جو تمہاری جانب سے مجھ تک پہنچی ہیں اور تمہارے اندر یہ خفگی کس بنیاد پر ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت دی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے۔ خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو متحد اور متفق کیا؟ تم مفلس تھے۔ خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو آسودہ حال کیا؟ (ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے) نہیں، تم جواب دو، اے محمد! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے پناہ دی۔ تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی تھی تم جواب میں کہتے جاؤ۔ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے گروہ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لیکر اپنے گھروں کو جاؤ۔

دیکھیے کس بلا کا جوش ہے۔ خنجر خطابت نے نوجوانوں کے دلوں کو گھائل کر دیا۔ وہ رو پڑے یہاں تک کہ ان کی داڑھیاں تر ہوگئیں اور برجستہ پکار اٹھے۔ "ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی تقسیم پر راضی ہیں" ایک بار آغاز کار میں بستی کے لوگوں کو خطاب کیا اور دعوت توحید و رسالت اور آخرت کی طرف ان کی توجہ مرکوز کرائی۔ فرمایا:۔

"قافلے کا نگہبان کبھی اہل قافلہ کو غلط خبر نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بفرض محال) اور سب لوگوں سے غلط بات کہنے پر آمادہ بھی ہو جاتا تو تم سے کبھی کوئی غلط بات نہ کہتا اور اگر دوسروں کو ہلاکت کے خطرے سے دوچار بھی کر دیتا تو تم کو تو کبھی ہلاکت کے خطرے سے دوچار نہ کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ میں تمہاری طرف خصوصاً اور پھر دیگر انسانوں کی طرف خدا کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بخدا ایک روز تم کو لازماً مرنا ہے جیسے کہ تم سوتے ہو اور پھر مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہوتے ہو۔ تم سے لازماً تمہارے اعمال کا حساب لیا جانا ہے اور تمہیں بھلے کا بھلا اور برے کا برا بدلہ ضرور پانا ہے۔ پھر یا تو ہمیشہ کی جنت ہوگی یا ہمیشہ کی دوزخ ہے۔"[۱۵]

ایک شخص عمرو بن عبسہ نے آپؐ سے کچھ سوالات کیے اور آپؐ نے ان کے مختصر جوابات دیے۔ یہ ایسا ملخص مکالمہ ہے جس کے مطالعہ سے علم و آگہی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

اس کام میں (ابتدا) کون آپ کے ساتھ تھا؟

"ایک مرد آزاد (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) اور ایک غلام (حضرت بلال رضی اللہ عنہ)

اسلام کیا ہے؟

"پاکیزہ گفتار اور حاجت مندوں کو کھانا کھلانا۔

ایمان کیا ہے؟

"صبر اور سخاوت"

کیسا اسلام افضل ہے؟

"اس شخص کا جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

کیسی نماز افضل ہے؟

"جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے"۔

کیسا ایمان افضل ہے؟

"جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے"۔

کیسی ہجرت افضل ہے؟

ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں۔

کیسا جہاد افضل ہے؟

"اس شخص کا جس کا گھوڑا میدان جنگ میں مارا جائے اور وہ خود بھی شہادت پائے۔

کون سی گھڑی (عبادت کے لیے) افضل ہے؟ "رات کا پچھلا پہر" ل۹۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی ادبیت اور بلاغت تھی جس کی وجہ سے بعض مستشرقین قرآن پاک کو بھی (نعوذ باللہ) آپ کی تصنیف قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ آپ امی تھے اور آپ کی یہ فصاحت و بلاغت اور زبان آوری من جانب اللہ تھی جس طرح دوسرے انبیاء کو خدا نے عطا کی تھی تاکہ تبلیغ رسالت کی ذمہ داری کو کما حقہ نبھا سکیں۔

اس مضمون کی یہ چند سطریں یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام نے جس زبان میں اپنی دعوت پیش کی وہ فصاحت و بلاغت کا مرقع اور جمال و رعنائی کا پیکر تھی۔

(باقی ص۵۲ پر)

میں بھی حاضر تھا وہاں

تاثرات اور حقائق

(۲)

(جناب حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی)

سیرت سید احمد شہیدؒ کی تصنیف سے شروع ہونے والا سفر جس طرح اپنی سمت اور منزل بدلتا رہا ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس سفر کا نقطۂ آغاز سامنے رہے۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر مذکورہ بالا کتاب کے بعض اقتباسات یہاں دیئے گئے ہیں:-

سیرت سید احمد شہیدؒ کی تالیف کے جو مقاصد بیان کیے گئے تھے ان میں سے پہلا مقصد یہ تھا۔

ایک نہایت نجدہ منظر یہ ہے کہ بہت سے ہمت و عزم کے جوان قوت ارادی اور قوت عمل کے مالک بے توفیقی، کم نگاہی یا مسلمانوں کی بدقسمتی سے اپنی کارآمد قوتیں بیکار اور اکثر مضر چیزوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ ان آوارگان فکر و عمل کو اگر صحیح راستہ نظر آجائے اور خدا کی توفیق سے اس پر قدم اٹھائیں تو بہت جلد منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ اسلام کی خدمت اور نوع انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحۂ عمل ہے جو اس کتاب میں بتایا گیا ہے اور وہی ہے جس کے مطابق جناب رسول اللہ صلعم، آپ کے خلفائے راشدین اور بعض مجددین امت نے عمل کیا یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا اور اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادی، سیاسی غلبہ کی کوشش کرنا

اسی طرح مسلمانوں کی منزل مقصود کا بھی صرف ایک راستہ ہے اور وہ وہی راستہ ہے جس سے اس امت کا پہلا قافلہ منزل تک پہنچا ہے۔ لن یصلح آخر هذه الامة الا

ما اصلح اولھا (اس امت کے پچھلوں کی اصلاح صرف وہی چیز کر سکتی ہے جس نے اس کے اگلوں کی کی) یعنی دین خالص اور اس کی پیروی

چوتھے مقصد کے ذیل میں بتایا گیا تھا:۔

.... لیکن قرآن کی اشاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے بعد صرف انہیں حضرات کی سیرت پورے طور پر مفید ہو سکتی ہے جو سیف و تسبیح کے جامع ہوں اور جن سے محبت و شوق الٰہی کے ساتھ حرکت و عمل کی قوت پیدا ہو۔

پھر اس "سیرت" کی حیثیت یہ بتائی گئی تھی:۔

ایک صوفی ایک مصلح اور ایک مجدد کی حیثیت سے بھی یہ سیرت مکمل ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقے کے مطالعہ کے لائق۔

نوجوانوں کے نام اس سیرت کا پیغام تھا:۔

نوجوانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ وہ خود بدلنے کے بجائے زمانہ کو بدلنے کی ہمت کریں نازکیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے انہیں		مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں سلطنتوں کو فتح کرنے کا حوصلہ رکھیں کہ نوجوانوں نے یہ بھی کیا ہے۔ جسم کی آرائش و زیبائش چھوڑ کر بزم جہاں کی آرائش کی فکر کریں اور دیکھیں کہ کیا چیزیں کم ہیں کہ پوری کردیں۔ کیا رخنے ہیں کہ بھر دیں۔ کیا چیزیں بیکار ہوگئی ہیں کہ نکال دیں۔

اہل خانقاہ و مشائخ کو اس کا پیغام تھا:۔

اہل خانقاہ اور مشائخ کو اس کا پیغام ہے کہ:۔

اے پیر حرم رسم و رہ خانقہی چھوڑ		مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت		دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے		مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی		دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا[1]

(ضرب کلیم)

پھر مصلحین و مجددین امت کا سید صاحبؒ سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا گیا تھا:۔

اگرچہ ان میں ہر ایک اپنے رنگ میں کامل تھا لیکن ان کاملوں میں بھی کامل وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ کامل ہے جن میں صحابہ کا کامل شان سب سے بڑھ کر تھی جس سے رسول اللہ صلعم کے مذہب و مقصد کی زیادہ خدمت و ترقی ہوئی جس کی صحبت تربیت سے ایسی جماعت تیار ہوئی جس نے خیر القرون کی یاد تازہ کر دی۔[1]

سید صاحب نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومت الٰہی اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں "کوہ کندن اور کاہ برآوردن" ثابت ہوں گی۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ آپ اسی نقشہ پر کام کرنا چاہتے تھے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین نے کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائیدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کے لیے وہی نظام عمل ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں۔ اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد و رسوم کا نام نہیں، وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ زمانہ کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ، اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار اور زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق ہو اس کے صحیح نمائندے ہی دنیا کے لیے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا	یہ (مظلوم مسلمان) وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز کو قائم کریں گے۔

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ ص۳

عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ○　　زکوٰۃ کی ادائیگی میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیاں روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے

(الحج)

دوسرے نہایت اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا دنیا میں ایک مستقل نظام ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ بغیر حکومت کے قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی بغیر قوت ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام عملی دیوانی و فوجداری معطل ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن غلبہ و عزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لیے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی ہے اور اس کو اکابر صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز تکفین پر مقدم رکھا جس کو بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لیے حضرت حسینؓ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نا اہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت کی بعثت کا مقصد یہی بتایا گیا

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر　　تم بہترین قوم ہو جو دنیا میں اس لیے ظاہر کی گئی ہے کہ تم بھلائی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اور قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے۔

ولتكن منكم امة يدعون الى الخير ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر　　تم میں ایک جماعت رہنی چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دیتی رہے نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے امر (حکم) اور نہی (ممانعت) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور تحکم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا

کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کے لیے درخواست و عرض کریں گے پس امر و نہی کے لیے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے

صحیحین کی مشہور حدیث ہے

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان (بخاری و مسلم)	جو تم میں سے کوئی برا کام دیکھے اس کو ہاتھ سے روک دے اور اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ آخری درجہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے

ظاہر ہے "تغییر بالید" ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح کے لیے قوت و اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لیے کچھ قوت اور آزادی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں ہے تو تیسرے درجہ پر قناعت کرنی پڑے گی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد بعض روایات کے مطابق ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا۔ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں دل سے برا سمجھنا اور زشت و نیک کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اگرچہ سید صاحبؒ کی تاریخ میں اس کا رنامۂ جہاد اور احیاءِ خلافت اسلامیہ نے اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے کہ عام لوگ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے لیکن خواص کی بھی اس کے مقاصد و اسرار پر نظر نہیں۔ خدا کو بھی ہماری ناقدری اور ناانصافی کی سزا دینی تھی ورنہ دنیا خلافت راشدہ کے بعد ہندوستان میں "حکومت راشدہ" کا نقشہ دیکھتی۔

اس کے بعد سید صاحب کی ایک اور خصوصیت پر نظر ڈالیے اور وہ یہ کہ آپ نے تھوڑے زمانہ میں ایک دینی فضا قائم کر دی اور ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ تیرھویں صدی میں صحابہؓ کا نمونہ تھے۔ ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک سانچہ میں ڈھلے ہوئے۔ اللہ کے لیے جان دینے والے شریعت پر چلنے اور مرنے والے، بدعت سے نفرت

شرک کے دشمن، جہاد کے نشہ میں سرشار، متقی و عبادت گزار اور بڑی بات یہ کہ ہم رنگ و یک آہنگ، تاریخ اسلام میں ایک جگہ اتنی بڑی تعداد میں اس پختگی اور جامعیت کی کوئی جماعت صحابہ و تابعین کے بعد مشکل سے ملے گی۔[1]

ان آخری صدیوں میں ہم کو دنیائے اسلام کی کسی ایسی مذہبی تحریک کا علم نہیں جو ہندوستان کی اس تحریک احیاء سنت و جہاد سے زیادہ منظم اور وسیع ہوا و رجس کے سیاسی و مذہبی اثرات اتنے ہمہ گیر اور دور رس ہوں۔ مشرقی بنگال سے لیکر افغانستان کے حدود تک لاکھوں مسلمان اس تحریک سے وابستہ تھے۔ بنگال کے کمشنر پولیس کی رپورٹ ہے کہ اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیروؤں کی تعداد اسی اسی ہزار ہے۔ سرولیم ہنٹر اپنی کتاب "مسلمانان ہند" میں لکھتا ہے:۔

صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دار نیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لیے علیحدہ کرکے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کے لیے ستھانہ جاکر خدمت کرتے تھے جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (پرکھوں) کے شرادھ کے لیے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انہیں فریضہ جہاد ادا کرنے کے لیے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔

ہندوستان کی کوئی اصلاحی اور سیاسی تحریک نہیں جو اس تحریک سے متاثر نہ ہو اور ہندوستان میں موجودہ اسلامی زندگی، مذہبی اصلاح، مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ملک میں مسلمانوں کے وجود کی اہمیت اور ان کا سیاسی وزن بڑی حد تک اسی طویل جہاد کا رہین منت ہے۔[2]

تیرہویں صدی ہجری جس میں سید صاحب نے اپنی تحریک جہاد کا آغاز کیا تھا اس میں پورے ہندوستان کی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی حالت کا جو نقشہ مولانا علی میاں صاحب نے اپنی کتاب میں کھینچا تھا وہ یہ تھا:۔

---

[1] چراغ خطوط نمبر ۱۰۔ ۱۲ مئی ۱۹۳۴ء و نمبر ۵۰، ۷ جون ۱۹۳۴ء

[2] سیرت سید احمد شہیدؒ، ص۔ ۳۲ تا ۳۷

تیرہویں صدی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مذہبی اخلاقی اور سیاسی حالت تھی اس کے تصور کے لیے موجودہ حالت ذہن میں لانی چاہیے۔ یہ خیال رہے کہ یہ حالت بڑی حد تک اصلاح و تجدید کا نتیجہ ہے پھر بھی شاید بیک وقت سب گوشے نظر میں نہ آسکیں اس لیے ہم اس کا ایک ناقص اور دھندلا سا خاکہ کھینچتے ہیں۔

اگر شرک و بت پرستی دنیا میں کوئی چیز ہے اور لغت و عرف و شرع میں اس کے کچھ معنے ہیں تو وہ صاف صاف مسلمانوں میں کثرت سے موجود تھی۔ قبروں اور مردوں کے متعلق ایک مستقل شریعت بن گئی تھی جس کے واجبات اور مستحبات میں ان کا سجدہ کرنا، ان سے دعا مانگنا، بوسہ دینا، نذریں اور چادریں چڑھانا، منتیں مانگنا، قربانیاں کرنا، طواف کرنا گانا بجانا، میلہ لگانا، تہوار منانا، چراغاں کرنا، عورتوں کا جمع ہونا اور مختصر اور صحیح الفاظ میں اس کو قبلہ و کعبہ اور ملجا و ماوی سمجھنا تھا۔ اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے متعلق وہ سب عقائد و خیالات موجود تھے جن کی وجہ سے نصرانی یہودی اور مشرکین عرب بدنام ہیں، ہندوؤں اور شیعوں کی تمام رسوم مسلمانوں کی معاشرت کا جزو بن گئی تھیں اور ان سے کوئی گھر خالی نہ تھا، ان کی پابندی قرآن و حدیث و اسلامی فرائض سے زیادہ کی جاتی تھی، شرک و بدعت اور اسراف و جہالت ان کے اجزائے ترکیبی تھے......

ہر مسلمان کو شریعت میں ترمیم و تنسیخ اور تشریع (قانون سازی) کا حق تھا اور جس کو مسلمان اچھا سمجھ لیں وہ تو مستند شریعت تھی۔ ما راٰہ المومنون حسنا فھو عند اللہ حسنٌ

شعائر و آداب اسلام کے زوال و انحطاط کا حال اس سے معلوم ہوگا کہ معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلام مسنون کی رسم سارے ہندوستان سے اٹھ گئی تھی حتی کہ شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شریعت کدہ میں بھی آداب عرض و تسلیمات عرض کا رواج تھا۔ ان کی معاشرت اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ مورخ کا قلم بھی اس کی تصویر کھینچتے شرماتا ہے۔ فسق و معصیت ان کے آداب و تہذیب میں داخل ہوکر معاشرت کا جز بن گئی تھی اور وہ اس پر علانیہ فخر کرتے تھے۔

غربا بھی امرا کی نقالی کرتے تھے اور امرا کی تو دنیا ہی الگ تھی ان کے لیے نہ قانون

شریعت تھا نہ قانون فطرت ع

سزاوار ہے ان کو جو نا سزا ہے

غرض کہ مسلمانوں کے گناہ اس وقت اتنے بڑھ گئے تھے کہ قلم کی اس جنبش تک ان کی سزا ختم نہیں ہوئی۔

سلطنت مغلیہ کا شیرازہ مدت ہوئی بکھر چکا تھا کسی حکومت کا زوال کہنے کو تو دو لفظ ہیں لیکن یہ کسی ملک وقوم کی تاریخ میں قیامت سے کم نہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی ساکھ گر چکی تھی اور اب وہ اپنے باپ دادا کی زمین پر بھاری تھے۔ ان کا کوئی قائد اور شیرازہ بند نہ تھا۔ تیموری سلاطین صرف خانقاہ نشین ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کو اپنا سنبھالنا دوبھر تھا مسلمانوں کو کمزور پاکر بیسیوں فتنوں نے سر اٹھایا۔ دکن سے لیکر دہلی تک کا ملک اور جو کچھ ملک میں ہوتا ہے، مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔ پنجاب سے افغانستان کے حدود تک سکھوں کا راج تھا اور سواحل پر انگریز قابض تھے جو اندرون ہند کی سیاسیات میں شریک اعظم تھے۔ اس منحوس طرز حکومت میں رعایا لوٹ مار و ظلم و پامالی سے نالاں تھی[1]



[1] سیرت سید احمد شہید ص ۴۵ تا ۵۰

تصحیح

ماہ نومبر ۸۳ء کے شمارے کی چند غلطیاں ٹھیک کر لیجیے۔ ص ۶ پر اشارات کی آخری سطر میں اولئک ھم الصادقون بے محل ہے اس کو حذف کر دیجیے۔ ص ۳۷ سطر ۹ دین عربی غلط ہے۔ "ابن عربی" بنا لیجیے۔ ص ۴۲ آخری سطر ۵ "خیالی" کے بعد ترنگ کا لفظ بڑھا لیجیے۔



عالمی سطح پر فکری تبدیلیاں

جناب انعام الرحمن خاں بھوپالی

یہ مقالہ ۲۹ر ستمبر ۸۳ء کو اجتماع حلقہ جماعت اسلامی مدھیہ پردیش منعقدہ جبل پور میں پڑھا گیا :۔

یہ بات ہر سوچنے والا آدمی جانتا ہے کہ انسان کے اور انسانی قافلہ کے سفر کا رخ اس کا فکر متعین کرتا ہے۔ اور انسان کو اور انسانی قافلہ کو چلانے والی حرکت اس کے ارادہ اور جذبے سے پیدا ہوتی ہے جو اس کے فکر سے پیدا ہوتا ہے یا اس کا تابع ہوتا ہے۔ انسان پہلے سوچتا ہے پھر ارادہ کرتا ہے اس کے بعد چلتا یا عمل کرتا ہے تمثیل کے پیرائے میں اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ فکر کا عمل یہ ہے کہ منزل کا تعین کرے اور سفر کا رخ بتائے۔ علم کا کام جو بالعموم اسی فکر کے زیر اثر ہوتا ہے یہ ہے کہ پٹری بچھائے اور انجن تیار کرکے اس پٹری پر کھڑا کر دے اور جذبہ جو اسی فکر و عمل سے پیدا ہوتا ہے اس انجن کو اس پٹری پر چلاتا ہے یعنی اسٹیم کا کام کرتا ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر زمانے میں ایک فکر غالب و محیط ہوتا ہے جسے ام الافکار اور ام الاعمال کہنا چاہیے۔ جو اپنے وقت کے علوم و افکار کو معیار و اقدار کو، اخلاق و کردار کو غرض یہ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے سایہ میں لے لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وقت کا فکری دھارا انسان سے متعلق ہر چیز کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افکار کی دنیا میں بھی عمل اور ردعمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور فکری دھارا اپنا رخ بدلتا رہتا ہے۔ یہاں ہیگل والی افکار و تصورات کی کشمکش کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فکری دھارا بدلتا بدلتا رہتا ہے اور انسان

کی پوری زندگی وقت کے اس دھارے کے اثر میں آجاتی ہے۔ یہ تبدیلی کیونکر آتی ہے؟ آیا ہیگل کا "خیال مطلق" یا جانِ جہان "خود اپنی ذات کی تکمیل کے لیے افکار و تصورات کے درمیان یہ کشمکش کرا رہا ہے یا کیا بات ہے۔ اور یہ کہ مارکس کے مطابق وقت کے معاشی تقاضے افکار و تصورات کو اور معیار اعتقاد کو اپنے سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ یا یہ کسی اور طرح پیدا ہونے والے فکر کی طاقت ہے جو دوسری چیزوں کی طرح معاشی سانچے بھی اپنے مزاج کے مطابق ڈھالتی رہتی ہے۔ ان بحثوں کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہاں تو بس یہ صاف نظر آنے والی چیز دیکھنا ہے کہ ہر زمانے میں ایک فکر غالب ہوتا ہے جس کی قہرمانی انسان کی ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

کسی زمانے میں یونان کی تہذیب اور اس کے افکار کو فکر غالب کا مقام حاصل تھا۔ اس وقت کی معلوم دنیا پر اسی کے فکر و عمل کی چھاپ تھی۔ یونان کے فلسفہ کو وہ برتری حاصل تھی کہ دلیل اسی کے فلسفے سے لائی جاتی تھی، غلط و صحیح کا معیار وہی تھا۔ یہی حال رومی تہذیب کا اس کے عروج کے زمانہ میں رہا۔ جو طریقہ اس کی پیروی کرتے ہوئے اختیار کیا جاتا اسی کو ترقی یافتہ طریقہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ مسیحیت جب وہاں پہنچی تو وہ بھی کچھ مخصوص تحفظات کے ساتھ اسی رنگ میں رنگ گئی۔

پھر اسلام کا آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے اور اس کا عملی نمونہ سنت رسولؐ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور اسلام کے اولین خادموں نے سرزمین عرب سے نکل کر دنیا کے بہت بڑے حصہ میں اسے متعارف کرایا۔ اور اس بلند اور شوخی فکر و کردار کے وہ نمونے دنیا کے سامنے آئے جو عقیدہ توحید اور قرآنی فکر سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت کی دنیا کا اجتماعی ضمیر گویا ان کا منتظر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین و اخلاق میں، قانون و انصاف میں، معاشرت و معیشت میں، آئین و سیاست میں اور ایسے ہی دوسرے معاملات میں ان بنیادی تصورات کی چولیں ہل گئیں جن پر اس وقت کی پوری عمارت قائم تھی۔ بعض قومیں اسلام کی مخالفت اور مسلمانوں سے برسرپیکار تو رہیں لیکن انھوں نے بھی اسلامی فکر کی عظمت و بلندی کو مانا اور غیر شعوری طور پر ہی اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ عورت کا مقام ہو یا غلامی کا مسئلہ۔ آئین حکمرانی ہو یا ہیئت حاکمہ۔ تجارت کے اصول ہوں، یا عدل و انصاف کے تقاضے۔ اخلاقی قدریں ہوں یا معاشرتی ضوابط۔ فکر و ضمیر کی آزادی ہو یا اختلاف رائے کے حدود۔ عبادات کی اہمیت ہو یا ذہن و فکر کا استعمال۔ غرضکہ یہ اور ایسے تمام بنیادی امور میں ذہنوں نے اسلام کی پیش کردہ قدروں کا اثر قبول کیا۔ اور افکار کی

گاڑی غیر ارادی طور پر اس رخ پر چلنے لگی جو رخ اسلام نے دیا تھا۔ اسلام نے کیسا فکری انقلاب پیدا کیا؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے مذہب اور مذہبی تصور کو لیجیے۔

آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یا انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکٹ کے طور پر کام آئے اس کا تعلق صرف اس رشتے سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے۔ مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں محض نجات مطلوب ہو اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اس پر نظر عنایت رکھے اور اس کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور اس کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے اور ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز۔"

مذہب کے اس تصور نے عملی طور پر کیا آفت ڈھائی ہے، اس نے بندہ اور خدا کے درمیان کتنے پردے ذریعہ و وسیلہ جیسے ناموں سے ڈال رکھے ہیں۔ اور اس کے پیٹ سے مذہبی القاب کے ساتھ کتنی جونکیں پیدا ہوئیں جنھوں نے مدتوں انسانوں کا خون چوسا۔ یہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں تو صرف اتنا جان لیجیے کہ یہ تھا ساتویں صدی عیسوی تک مذہب کا تصور۔ مگر اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عقلی فکری تصور پیش کیا۔" آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے۔ اگر وہ انسانی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ رہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو۔ فہم و شعور اور فکر و نظر ہو صحیح اور غلط کا امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو۔ زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر سیدھے راستے اور ٹیڑھے راستوں کے درمیان فرق کر کے دکھلائے اور راہ راست پر استقامت و پیش قدمی کی طاقت بخشے اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے۔ انسان کو ہر مرحلہ میں کامیابی

سعادت کے ساتھ گزار دے۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا لیکن افسوس کہ عملی طور پر یہ تصور زیادہ عرصہ تک اپنی صحیح شکل میں باقی نہیں رہ سکا۔ اگرچہ دنیائے انسانیت اس تصور سے متاثر ہو رہی تھی اور کسی نہ کسی شکل میں اسے اپنانے پر بھی آمادہ تھی لیکن خود اسلامی معاشرے میں جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی مشیت ایزدی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ دین و دنیا کے پرانے جاہلی تصور کو اسلامی معاشرے میں دبے پاؤں گھس آنے کا موقع مل گیا۔ اگرچہ ذہنوں میں اور بہت بڑی حد تک انفرادی عمل میں بھی مذہب کا وہی جامع تصور کار فرما رہا جو اسلام نے عطا کیا تھا۔ بلکہ حکمراں طبقے میں بھی اس کے جلوے نظر آتے رہے۔ لیکن حکومت کی سطح پر ایسی تبدیلیاں آئیں جس کے نتیجے میں بلا ارادہ بلکہ مذہبی اکابر کی خواہش کے علی الرغم دو طرح کے دائرے بن گئے۔ ایک حکومت و سیاست کا دائرہ اور دوسرے علم و فکر کا اور اسلامی تربیت کے دائرے۔ ان دینی دائروں نے یہ کارنامہ بھی انجام دیا کہ حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود دینی تعلیمات و احکام کو ایک مرتب نے دستوری شکل میں مدون کر دیا۔ جو اس وقت تک نصوص و روایات کی شکل میں کام کر رہے تھے۔ البتہ مجتہدین کی یہ خدمت تاریخ کا ایسا حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی مثال شاید نہ ملے۔ ہدایت الٰہی کی اساس پر بنا ہوا یہ قانون حکومت کی طاقت کے بغیر امت کے دلوں میں گھر کر گیا اور بعد میں ہزار بارہ سو سال تک یہی آئین امت مسلمہ پر ایسی حکومت کرتا رہا کہ وہ جابر حکمراں بھی جو اپنی فطرت کے اعتبار سے آزاد منش تھے اجتماعی اصول و امور میں اس کی گرفت سے اتنے آزاد نہیں ہو سکے کہ بالکل اپنی من مانی کر سکتے۔ دوسری طرف اسی دینی تعلیم و تربیت نے ایسے اکابر رجال کو جنم دیا جن کے مقابلہ میں کم ہی شخصیتوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور قرآنی افکار و اقدار پر قائم شدہ اس تہذیب نے دنیا کو یہ حیرت انگیز تجربہ دکھایا کہ اس تہذیب کے علمبرداروں کو اور ان کے ملکوں کو تاتاریوں کے مردم خور سیلاب نے تہ و بالا تو کر دیا لیکن یہی غالب قوم اپنی مفتوح قوم کی تہذیب سے مسخر ہو گئی اور

پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے"

یہ باتیں "ہم نے پتنگ اڑائی ایروپلین سے پہلے" جیسی افیون کی گولیاں نہیں ہیں۔ خود یورپ کے منصف مزاج مصنفین و مفکرین نے بھی بیان کیا ہے کہ یورپ کو صدیوں کی گہری نیند سے بیدار کرنے میں

اسپین کے مسلم مفکرین اور ان کے علوم و افکار کا بڑا ہاتھ ہے۔

یہ سب کچھ تو ہوا لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حکومتوں کی غیر فطری تبدیلیوں کے نتیجہ میں ایسے حکمراں آتے رہے جو ملک گیری و حکمرانی کی صلاحیتوں سے تو مالا مال تھے لیکن دینی بصیرت اور تقویٰ اور طہارت کے اعتبار سے ان کا مقام یہ نہیں تھا کہ امت کے دلوں پر اپنی قیادت و امامت کا سکہ بٹھا کر دین اور سیاست دونوں کو ایک ہی مرکز سے وابستہ رکھ سکتے۔ تا کہ اس کا نظم انسان سازی کی وہ مشین بنا رہتا جس میں ڈھل ڈھل کر ایسے انسان نکلتے رہتے جو دنیا پر ابر رحمت کی طرح چھائے رہتے اور دنیا والوں پر باران رحمت برستی رہتی۔ غالباً وہ حکمراں اپنی حیثیت کو خود بھی سمجھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے دینداروں کو استعمال کرنے کی چاہے کوشش کی ہو لیکن ان کے دائرے میں مجتہد بن کر قدم رکھنے کی جرأت کبھی نہیں کی۔

اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مستقل طور پر دینی دائرے علیحدہ اور سیاسی دائرے علیحدہ ہو گئے۔ اگرچہ ان دونوں دائروں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا بھی اور اثر قبول بھی کیا اور چاہے ذہنی طور پر دونوں اداروں نے دین و دنیا کی تقسیم کو نہ مانا ہو لیکن عمل کی دنیا میں دین الگ ہو گیا اور دنیا الگ۔ دین دینداروں کے لیے اور دنیا دنیاداروں کے لیے مخصوص ہو گئے۔ عمل کی دنیا اگر ذہن و فکر کے مطابق نہ ہو تو یہ صورت زیادہ دن باقی نہیں رہتی۔ غیر شعوری طور پر ذہن و فکر بھی عملی تشکل کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہی کچھ یہاں بھی ہوا۔ ہوتے ہوتے زوال کے بعد تو اسی صورت حال کو یعنی دین و دنیا کی تفریق کو بالعموم ذہن و فکر نے بھی معقول مان لیا۔

حکمرانوں میں بادشاہ ضرور متقی و پرہیزگار پیدا ہوئے۔ اور انھوں نے حکومت بھی حتی الامکان دیانت سے کی لیکن بیشتر بادشاہوں کا حال یہ رہا کہ ایک طرف تو خوشامدی علماء نے یہ تصور پیدا کیا یا ان سے کرایا گیا کہ بادشاہ اگرچہ خدا تو نہیں مگر خدا کا سایہ ضرور ہے۔ اللہ نہیں ظل اللہ ہے۔ اس لیے اس ظل اللہ کی اطاعت بے چون و چرا ہونی چاہیے۔ چنانچہ کہا گیا ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں   بباید گفت اینک ماہ و پرویں

یعنی بادشاہ اگر دن کو رات کہے تو کہنا چاہیے کہ جی ہاں چاند اور تارے نظر آ رہے ہیں

اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا مقام حاصل کرے۔ اگرچہ بعض قوی الایمان بزرگوں نے سلطان جابر کے سامنے کلمہ حق کہنے کی سعادت پائی۔ اور کبھی کبھی وقتی طور پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا بھی

لیکن عام حالت یہی رہی کہ "کون سنتا ہے فغان درویش" بہرحال اس صورت حال میں ہوتا یہی تھا کہ حکمران اقتدار کے نشے میں مست ہوکر عیش وعشرت میں ڈوب جائیں اور اقتدار کی دیوی پر ہر قیمتی متاع کو بھینٹ چڑھادیں اس طرح جب اقتدار کا چسکہ لگ گیا تو وہ خلق خدا کو اپنا غلام بنانے لگے۔ خود خواہش اقتدار کے غلام بن گئے۔ اور اقتدار کے نشے میں سرشار ہوکر دین سے دور ہوتے چلے گئے۔ حتی کہ بعض نے تو اس کی خاطر اپنا ایک نیا دین بھی گھڑ ڈالا۔ البتہ کچھ بادشاہ وقتاً فوقتاً ایسے بھی آئے جنھوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ذریعہ فتوحات بھی کیں اور اندرونی نظم کو بہتر طور پر قائم کرکے اپنی حکومت کے جلال وجبروت کا سکہ بٹھادیا۔ اس سے اسلام کا بھی کچھ بھرم قائم رہا اور مسلمانوں کا بھی لیکن بعد کے زوال وانحطاط کے دور میں تو بعض بادشاہ اس طرح غفلت میں کھوئے رہے کہ جب انھیں خبر دی گئی کہ دشمن بڑھتا ہوا پایۂ تخت کے قریب آگیا ہے تو انھوں نے جواب دیا "این دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ"

دوسری جانب دینی امامت کا معاملہ یہ رہا کہ کبھی سیاسی قیادت سے مسلح تصادم کی شکل میں اور کبھی اس کے بغیر برابر کوشش ہوتی رہی کہ دین ودنیا کی عملی تقسیم ختم ہو اور دینی سیاست اور دنیوی قیادت یکجا ہوں تاکہ اسلام کا منشا پورا ہو اور دنیا والے اس کی برکات سے شادکام ہوسکیں لیکن یہ کوششیں کافی خون اور کافی صلاحیتیں صرف کرکے بھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ کیوں کامیاب نہیں ہوئیں؟ یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ یہاں تو بس یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ان ناکامیوں نے دینی حلقوں پر بہت خراب اثر ڈالا۔ ایک تو مایوسی کی کیفیت پیدا ہوئی۔ دوسرے آرام طلب عناصر نے بعض خوشنما تاویلات کے سایہ میں پناہ لے لی۔ پھر اتفاق سے اسی زمانے میں یونانی علوم مسلمانوں میں گھس آئے۔ جنھوں نے اسلام کے سادہ اور دل نشین عقائد کو فلسفہ کی پیچ درپیچ گتھیوں میں الجھا دیا۔ اگرچہ مسلمان علماء نے ان فلسفیوں کا مقابلہ انہی علوم کے ہتھیاروں سے کیا جس سے ایک مستقل علم کلام وجود میں آگیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ قیاسی علم سے بنے ہوئے یہ پیچ وخم یقینی علم سے پیدا ہونے والے یقین کو ہلاکر یکسوئی کو منتشر کردیں چنانچہ یہی ہوا۔ حرب عقائد کا ہنگامہ کھڑا ہوا اور ایک کلمہ پر جمع ہونے والی امت بہت سے فرقوں میں بٹ گئی۔ ان فرقوں کے علماء کی ذہنی صلاحیتیں اور عوام کی عملی طاقتیں باہم دست وگریباں رہنے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگ گئیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں رہا کہ اپنے اصل کام کی طرف توجہ دیں اور اپنے دین کو کارفرما طاقت بنانے کی کوشش کریں۔ بادشاہوں اور امراء

کی اکثریت دنیا میں غرق ہو کر من مانی کرنے کے نتیجہ میں امت کے سوادِ اعظم کی نظروں سے گر چکی تھی اس لیے جو لوگ بھی ان درباروں سے وابستہ ہوتے وہ اپنا اعتبار کھو دیتے تھے۔ اس صورت حال نے امت میں ترک دنیا اور رہبانیت کے جراثیم کو اپنا کام کرنے کا موقع دیا۔ ساتھ ہی تزکیہ اور ایمان بالشہود اور مشاہدۂ حق اور سیر مقامات وغیرہ کی طلب میں دوسری قوموں کے جاہلیت زدہ تصورات اور طریقے غیب پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں میں گھس آئے اور نہایت مقدس و دل آویز ناموں سے ترک لذات کی لذت میں گم کر دینے والے اشتغال میں جب عملی جدوجہد پر جان دینے والے مسلمان مشغول ہو گئے تو فکر و عمل کی دنیا ہی بدل گئی۔ تزکیہ نفس کا تصور اور نقشہ ہی کچھ اور بن گیا۔ "سیروا فی الارض" کی تعمیل تصوراتی سیر کی شکل میں کی جانے لگی۔ قرآن کے علمی معجزہ پر ایمان رکھنے والے عجائب کی دنیا میں کھو گئے۔ اگرچہ خود انہی کے ذمہ دار بزرگ روکتے رہے مگر کشوف و کرامات کی مدد سے ایک نئی میتھالوجی تیار ہو گئی جو ہر طرح دوسروں کی میتھالوجی سے لگا کھاتی ہے۔ بلا شبہ اس دور میں اور انہی حلقوں میں ایسے ایسے نفوس زکیہ پیدا ہوئے جن پر ہم بجا طور پر فخر کرتے ہیں لیکن یہ بلند و بالا شخصیتیں بھی لوگوں کو اس مقام پر جانے سے نہیں روک سکیں کہ وہ گھوڑے کی طرح زیر بار چلنے کے بجائے جنازے کی طرح کاندھوں پر چلنے لگے۔ اور یہ عظیم بزرگ ہی نہیں امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہا جو حق پر قائم رہتے ہوئے اسے سربلند کرنے کی دھن میں لگا رہا۔ مگر امت کی اکثریت کا حال یہ ہو گیا تھا کہ وہ سعادت و خلافت کے زمانے کی ہر نقل و حرکت کو مبہوت ہو کر سنتے تھے۔ مگر اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس زمانے میں جو کچھ ہوا وہ فرشتوں کی مدد سے ہوا۔ اس لیے اب جب کہ "فرشتے" نہیں آئیں گے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ "مردے از غیب" کی آمد کے منتظر تھے اور انہوں نے خندقیں کھودنے اور قلعے بنانے کے بجائے خانقاہیں بنانا شروع کر دیا اور حال و قال کی مجلسوں ہی میں اپنی نجات دیکھنے لگے۔ ان کے علماء اور حکماء نے احتساب کائنات کی جدوجہد چھوڑ کر پرانی کتابوں پر حاشیے چڑھانے ہی کو کمال علم سمجھ لیا اور اجتہاد کا دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔

اس طرح جب سلاطین و امراء میں سے روح جہاد غائب ہو گئی اور علماء و حکماء کے اندر اجتہاد کی گرمی سرد پڑ گئی تو وہ دنیا کی فکری امامت اور عملی سیادت سے گویا خود دست بردار ہو گئے۔ اس کے بعد سنت اللہ کے مطابق کسی نہ کسی کو اس مقام پر آنا ہی تھا۔ چنانچہ یورپ اٹھا اور نئی ذہنی توانائی اور علمی طاقت سے کام لے کر فکری امامت اور سیاسی قیادت کی خالی مسند پر قابض ہو گیا۔

پاپائے اعظم کے ماتحت مقدس سلطنت روما کا قیام دراصل مذہب اور سیاست کو یکجا کرنے کے ادارے کو ختم نہیں کر سکا اور اس سے سمجھوتہ کر لینے پر اکتفا کیا۔ مگر ساتھ ہی اس پر اپنا تسلط رکھنا بھی ضروری سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برابر کی طاقت کے دو ادارے باہم متصادم رہنے لگے کبھی ایک کا پلہ بھاری رہا کبھی دوسرے کا۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ آٹھویں صدی سے لیکر سولھویں سترھویں صدی تک یورپ کی تاریخ پاپائیت اور بادشاہت کے تصادم کی داستان ہے۔

اس عرصہ میں یورپ کے ذہن و فکر کے بند کھولنے میں دو چیزوں نے بڑا کام کیا۔ ایک تو اسپین کے راستے سے اسلامی علوم و افکار کے اثرات یورپ میں پہنچے۔ دوسرے ۱۴۵۳ء میں جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا تو وہاں کے امراء اور رؤساء کے ساتھ وہاں کے صاحبان علم و فضل نے بھی اندرون یورپ کا رخ کیا جو عرصہ سے علم و فضل کے خزانے دبائے بیٹھے تھے۔ یورپ نے جو اس وقت جہل کی تاریکی میں گم تھا، ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور آہستہ آہستہ یورپ ان علمی خزانوں سے مالا مال ہونے لگا جو اس وقت تک یونان سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے اور یہ حسن اتفاق تھا کہ ۱۴۳۸ء میں جرمنی کے ایک شخص نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں بہت آسانی ہوگئی اور علم کی روشنی یورپ کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے لگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پندرھویں صدی کے آخر سے لیکر سولھویں صدی تک کے عرصہ میں کایا پلٹ ہوگئی اسی لیے یورپ کی تاریخ میں اس زمانہ کو احیائے علوم کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

اب تک یورپ کا دماغ پاپائیت کی خود ساختہ مذہبی پابندیوں اور افسانہ تراشیوں میں جکڑا ہوا تھا لیکن احیائے علوم کی اس تحریک نے یہ بندشیں ڈھیلی کیں۔ کلیسا کا یہ عالم تھا کہ جہاں کسی نے اس سے ہٹ کر منھ سے کوئی بھاپ نکالی کہ اس پر الحاد و بے دینی کا الزام لگا اور اسے عدالت تفتیش کے حوالے کر دیا گیا جو ۱۲۳۲ء سے جگہ جگہ اسی نام سے قائم تھیں۔ یہ عدالتیں ذرا سی چوں و چرا کرنے کی بھی بیحد سنگین سزائیں دیتی تھیں لیکن جب احیائے علوم کے نتیجہ میں ذہنی بیداری پیدا ہوئی تو ان عدالتوں نے سچ مچ بوچڑخانوں کا کام کیا اور نئی دریافت کرنے والوں کو جن کی تحقیق چاہے کتنی ہی معقول اور انسانوں کے لیے کتنی ہی مفید ہو ایسی ایسی ہولناک سزائیں دیں جنھیں پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہنا پڑتا ہے کہ ان تعذیب خانوں کو عدالت کہنا لفظ عدالت کی توہین ہے۔ مگر ان مظالم نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ احیائے علوم سے جو بیداری پیدا ہوئی وہ چونکہ فطری اور حقیقی تھی اس لیے چاہے بہترین دماغوں کو آگ کے

شعلوں میں جھونک دیا گیا ہو لیکن بیداری کی اس لہر کو دبایا نہیں جا سکا۔ بلکہ جیسے جیسے یہ مظالم بڑھتے رہے ویسے ہی ویسے یہ ذہنی بیداری کلیسا کے خلاف بیزاری بنتی گئی۔ اس طرح یہ لاوا پکتا رہا۔ بالآخر پاپائیت کے قلعے سے ایک شخص مارٹن لوتھر اٹھا اور اس نے کلیسا کی چولیں ہلا دیں۔ اگرچہ وہ خود ایک پادری تھا اور ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن غیر معمولی ہمت و صلاحیت کا مالک تھا۔ پہلے تو کلیسا کی خود ساختہ مذہبی پابندیوں کے خلاف پھر اس کے طبع زاد عقائد کے خلاف اس کے دل میں جذبات پیدا ہوئے۔ اس کے بعد پوپ کے جاری کردہ "دستاویز مغفرت" نے تو اس کے ان جذبات کو نکلنے کا راستہ دیا اور ۱۵۱۷ء میں وہ کھلم کھلا پوپ کے مقابلہ میں آ گیا۔

دوسری طرف عوام سیاسی رخ سے میگنا کارٹا اور اعلان حقوق کے مرحلوں سے گذرتے ہوئے ایک نئی زندگی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ انقلاب فرانس کے زلزلے نے یورپ کے پورے معاشرے کی بساط ہی الٹ دی اور بالکل نئی بنیادوں پر نئی تعمیر شروع ہوئی۔

لیکن یہ بنیادیں قطعی طور پر منفی تھیں۔ ایسی مثبت فکر جس پر لوگوں کو انشراح ہوا اور وہ معاشرے کی مستحکم بنیادیں بن سکے۔ اُن کو نہیں ملی۔

یہ حقیقت تو لوگوں نے سمجھ لی کہ انسان اور خدا کے درمیان کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پوپ ہو یا بادشاہ کسی کی آواز خدا کی آواز نہیں ہے۔ یہ بھی طے ہو گیا کہ کسی شخص کو خدا نے انسانوں کا حاکم بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ یہ بھی جان لیا گیا کہ حکومت اصول و قانون کی ہونا چاہیے، نہ کہ ایک یا چند افراد کی۔ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ ہر انسان کے حقوق ہیں اور ان میں کسی مصنوعی بنیاد پر تفریق کرنا منشائے قدرت کے خلاف ہے۔ غرضکہ اس طرح کی باتیں تو لوگوں نے سمجھ لیں اور پاپائیت کے جبر سے بھی بڑی حد تک نجات مل گئی مگر یہ کہ اب کیا ہو؟ انسانیت کے جہاز کی منزل کون سی ہے؟ اس کے سفر کا رخ کون متعین کرے اور اسے ڈوبنے سے کون سی طاقت بچائے؟ وغیرہ — ایسے سوالات کا وہ کوئی واضح جواب نہیں پا سکے۔

ابھی پاپائیت اور اصلاح مذہب کی کشمکش اور عوامی بیداری اور ملوکیت کے تنازعہ کا جو مختصر ذکر ہوا اس سے یہ کوئی نہیں سمجھے گا یہ سب کچھ کسی "خیال مطلق" یا "جانِ جہاں" کا کھیل تھا اور اس نے اپنی ذات کے ارتقا کی خاطر افکار و تصورات میں یہ کشمکش کرائی تھی۔ نہ کوئی یہ بات مانے گا کہ اس اکھیڑ پچھاڑ میں روٹی کی چھین جھپٹ کارفرما تھی۔ مگر کہا کچھ ایسا ہی گیا اور اندھیرے میں بھٹکنے والے محروم ہدایت انسانوں نے ایسے خیالی فلسفوں کو چراغ سمجھ کر تھام لیا۔

(باقی آئندہ)

ملکی، ملی اور عالمی مسائل پر

مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کے تاثرات

مرکزی مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۰ر نومبر تا ۵ر دسمبر ۸۳ء میں ملکی، ملی اور بین الاقوامی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیکر درج ذیل تاثرات ظاہر کیے ہیں۔

۱۔ فرقہ وارانہ صورت حال

ملک میں آباد مختلف تہذیبی اور مذہبی اکائیوں کے درمیان پائی جانے والی بدگمانیوں اور شکوک شبہات کی خلیج دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتی جارہی ہے جو ایک انتہائی افسوسناک اور تشویشناک بات ہے بعض تنظیمیں پیشرو ڈالر اور عرب سازش کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے ذریعے اکثریت کے ذہنوں کو مسلسل مسموم کررہی ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک ایسی فضا بنتی جارہی ہے جس میں سنجیدگی، متانت اور غیر جانبداری کے ساتھ مسائل کو سمجھنا اور ان سے نمٹنا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے۔ نتیجہ کے طور پر بہت ہی معمولی نوعیت کے واقعات اور بالکل بے بنیاد افواہیں جنھیں عام حالات میں کسی بھی درجہ میں لائق اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا۔ بسا اوقات فرقہ وارانہ قتل و غارت کا سبب بن رہی ہیں۔ فرقہ پرست تنظیمیں اپنے گمراہ کن اور اشتعال انگیز پروپیگنڈہ کے ذریعے جو ذہن بنارہی ہیں اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مساجد کی تعمیر و مرمت اور مدرسوں کے قیام تک کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان کی تعمیر کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں۔

مالیگاؤں، ٹانڈہ، بہرائچ، حیدرآباد، مئوناتھ بھنجن، سدھارتھ نگر وغیرہ کے حالیہ اندوہناک واقعات اس بات کی تازہ مثال ہیں کہ فرقہ واریت کا زہر کس حد تک پھیل چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ مظلومین کو صبر و استقامت عطا

فرمائے اور شہدا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

جارحانہ تنگ نظری اور عدم رواداری کے اس خطرناک رجحان کو قومی پریس کے ذریعے مسلسل غذا پہنچائی جا رہی ہے اور اقلیتوں خاص کر مسلمانوں کے تعلق سے دیانت، صحافتی غیر جانبداری اور خبروں کی چھان پھٹک کے اصولوں کو بری طرح نظر انداز و پامال کیا جا رہا ہے۔ پریس کے جانبدارانہ بلکہ بعض حالات میں انتہائی معاندانہ رول، نیز مذہب کو سیاسی اور گروہی مفادات کے لیے استعمال کرنے والی فرقہ پرست تنظیموں کی جارحانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں جو فضا بنتی جا رہی ہے وہ ملک کے وسیع تر مفادات نیز ملک میں آباد مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی کوششوں کے منافی ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد کو نظر انداز کرنے کے رویہ نیز نوجوانوں کے ایک بڑے طبقے کے اندر مایوسی و محرومی کے شدید احساس کے نتیجے میں تشدد کا وہ عام رجحان پیدا ہوا ہے جس نے پورے سماج کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا سماج قوت برداشت اور رواداری کے جذبے سے تیزی کے ساتھ محروم ہوتا جا رہا ہے۔

حکومت کو اس رجحان کا بھی سختی کے ساتھ نوٹس لینا چاہیے۔ نیز تمام سمجھ دار، دردمند اور ملک کے سچے بہی خواہ افراد کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر اس ناپسندیدہ اور انتہائی خطرناک مضمرات کی حامل صورت حال کو بدلنے کی کوشش کریں۔

۲۔ غیر ملکی شہریوں کا مسئلہ

آسام کے بعد اب مغربی بنگال اور بہار میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کی نام نہاد گھس پیٹھ کے مسئلے کو پوری شدت کے ساتھ ابھارا جا رہا ہے۔ اکثریت کی جارحیت پسند تنظیموں نے غالباً یہ محسوس کر لیا ہے کہ اس حربے کو فرقہ وارانہ تعلقات میں تلخی گھولنے اور سادہ لوح افراد کو ورغلانے اور مشتعل کرنے کے لیے آسانی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس نسخے کو سرحدی ریاستوں میں پوری قوت کے ساتھ آزما رہی ہیں۔ انتظامیہ اور پولس کا جانبدارانہ رویہ ان عناصر کی سرگرمیوں کو مزید تقویت پہنچا رہا ہے۔ حکومت بہار کی ایما پر الیکشن ایجنسی نے بہار کے پورنیہ اور کٹیہار کے اضلاع میں ہزاروں افراد کو اپنی شہریت کا ثبوت فراہم کرنے سے متعلق نوٹس دے کر فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈے کو موثر بنا دیا ہے۔ علاوہ ازیں حکومت بہار اور الیکشن کمیشن نے ریاستی انتظامیہ اور پولس کو دیہات کے ان پڑھ اور بے سہارا لوگوں کو ستانے اور مالی پریشانیوں میں مبتلا کرنے کا ایک اور موقع بھی فراہم کر دیا ہے۔ اس غیر منصفانہ اور نتائج کے اعتبار سے انتہائی تباہ کن اور خطرناک سلسلہ کو بلا تاخیر ختم کیا جائے۔

۳۔ تبدیلیٔ مذہب اور تامل ناڈو حکومت کا قابل مذمت رویہ

ریاست تامل ناڈو کے ضلع رام ناتھ پورم کے ایک گاؤں میں چند ہریجن خاندانوں کے قبول اسلام کے بعد پولس اور انتظامیہ نے نومسلموں اور مقامی مسلمانوں سے انتقامی کارروائی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہ انتہائی افسوسناک اور قابل اعتراض ہے۔ اطلاعات کے مطابق چار پارٹیوں کے ایک مشترکہ وفد کی رپورٹ کے مطابق متعدد مسلمانوں کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ پولس رات میں مسلم بستیوں پر چھاپہ مارتی ہے اور شریعت مبنی قصور لوگوں کو بلا سبب تنگ کرتی ہے ان لوگوں کے ساتھ جرائم پیشہ افراد جیسا سلوک کیا جا رہا ہے حالانکہ ملک کے آئین نے شہریوں کو عقیدہ کی آزادی دی ہے جس میں رضا و رغبت مذہب و عقیدہ تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔ حکومت تامل ناڈو اپنے اس نامناسب اور افسوسناک رویہ سے آئین کی روح کو پامال کرنے اور شہریوں کے اپنے ایک حق کو استعمال کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی سنگین غلطی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے۔

۴۔ پنجاب کی تشویشناک صورت حال

پنجاب کے انتہا پسند عناصر کی سرگرمیوں اور دوسری ریاستوں میں ان کے ردعمل کے نتیجہ میں پنجاب کا مسئلہ انتہائی خطرناک مضمرات کا حامل بنتا جا رہا ہے۔ تشدد توڑ پھوڑ اور معصوم شہریوں کے قتل نیز عبادت گاہوں کی بے حرمتی کے واقعات اور ان کے نتیجے میں سکھوں اور ہندوؤں میں صف آرائی جیسی فضا نیز آپسی بدگمانیوں میں روز افزوں اضافہ کی صورت حال کو ختم کرنے کے لیے مؤثر اور بھرپور قدم اٹھائے جانے چاہئیں۔ اس صورت حال کا شدید تقاضا ہے کہ اس کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کیا جائے اور اصلاح حال کی مؤثر کوششوں کا آغاز کیا جائے۔ حکومت اور تمام متعلقہ فریقوں کو چاہیے کہ سیاسی مفادات و مصلحتوں سے بالاتر ہو کر اور کسی بھی مسئلہ کو وقار کا مسئلہ بنائے بغیر سنجیدہ فضا میں گفت و شنید کے ذریعے مسائل کو حل کریں۔ ملک کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر سیاسی پارٹیوں اور قومی پریس کی بھی بڑی ذمہ داری ہے کہ ان کی طرف سے فضا کو پرسکون اور سازگار بنانے کی پوری پوری کوشش کی جائے۔

۵۔ اتحاد ملت

ان دنوں جو مشکل و سنگین حالات ملک کو درپیش ہیں اور جن اہم ترین مسائل سے مسلمانان ہند دوچار ہیں ان کا شدید تقاضا ہے کہ ہماری صفوں میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا ہو۔ کسی وجہ سے جب بھی

فروعی، گروہی اور مسلکی مفاد کو ملت کے وسیع تر مفادات پر ترجیح حاصل ہوئی ہے تو اس کا نتیجہ انتشار و افتراق اور اس سے آگے بڑھ کر ملت کی رسوائی اور بے وزنی کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ حالات اور اسلامی تعلیمات دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ اختلافی مسائل کو ابھرنے نہ دیا جائے اور اس کے بجائے وہ نکتے تلاش کیے جائیں جن سے اتحاد و یگانگت اور اشتراک و تعاون کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملت کے مختلف مکاتب و عناصر کی طرف سے وقتاً فوقتاً اس ضرورت کی اہمیت کا اظہار ہوتا رہتا ہے لیکن صورت حال سے صاف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے جس یکسوئی اور پیہم جدوجہد کی ضرورت ہے اس کی بڑی کمی ہے۔ اس بنیاد پر ارکان مجلس شوریٰ نے اپنے اس شدید اور مخلصانہ احساس و تاثر کا اظہار کیا ہے کہ اس ضمن میں ملت کے تمام مکاتب فکر اور اس کی مختلف تنظیموں اور اداروں کی مزید سنجیدہ توجہ اور موثر جدوجہد نہایت ضروری ہے اور ساتھ ہی یہ توقع بھی ظاہر کی ہے کہ وہ اس معاملے میں اپنا دینی و ملی فریضہ پورے اہتمام سے ادا کرنے کی سعی و تدبیر کریں گے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حالات رفتہ رفتہ جو صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں، جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ اسے نہایت تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس پر اپنے گہرے رنج و افسوس کا اظہار کرتی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، غیر تدریسی عملہ اور انتظامیہ کے درمیان صف آرائی کسی بھی ادارے کے حق میں مفید نہیں ہوتی۔ وائس چانسلر کی حمایت و مخالفت اور اسی طرح حمایت و مخالفت کرنے والوں کی طرف سے بھی ایک دوسرے کے خلاف بیانات اور الزام تراشیوں سے صورت حال پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے جس سے ادارے کے اہم تر مفادات اور خود ملت اسلامیہ کے وقار اور اس کی امنگوں کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہے۔ مجلس شوریٰ نہایت ضروری سمجھتی ہے کہ یہ ناپسندیدہ سلسلہ فی الفور ختم ہو۔

مجلس شوریٰ انتظامیہ بالخصوص وائس چانسلر صاحب سے مخلصانہ اپیل کرتی ہے کہ نازیبا سخت گیری اور غیر ضروری ضابطہ پرستی کے بجائے زیادہ سے زیادہ شفقت و محبت اور عفو و درگزر کا رویہ اپنایا جائے۔ جن طلبہ کا اخراج کیا جا چکا ہے ان کے معاملات پر اس حیثیت سے نظر ثانی کی جائے کہ ان کے خلاف کی جانے والی کارروائی ان کے قصور سے متجاوز تو نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجلس شوریٰ اپنے عزیز طلبہ سے بھی اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا احترام پوری طرح ملحوظ رکھیں۔ نظم و ضبط کی پابندی کریں اور اپنی اصل توجہ تعلیمی مصروفیا

اور اپنی دینی و ملی اقدار کے تحفظ پر مطمئن ہو سکیں۔

مجلس شوریٰ کا خیال ہے کہ اقلیتی کردار کی بحالی کے بعد اب یونیورسٹی کورٹ ہی وہ واحد ادارہ ہے کہ جسے یونیورسٹی کے انتظامی امور میں آخری فیصلے کرنے کا اختیار ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسے جلد از جلد کام کرنے کا موقع ملے اور اس راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لیے وائس چانسلر صاحب بھی اپنے طور پر کوشش کریں مجلس شوریٰ کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ پولس کو یونیورسٹی کے احاطے سے جلد از جلد ہٹا لیا جائے تاکہ یونیورسٹی میں خوشگوار اور پرسکون فضا بحال ہو سکے۔

۷۔ افغانستان اور روسی جارحیت

افغانستان کے خلاف روسی جارحیت کے چار سال گزر جانے کے باوجود اس کے خاتمہ کی کوئی واضح صورت حال سامنے نہیں آسکی ہے۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے اہتمام و نگرانی میں جو مذاکرات ہوئے ہیں وہ اگرچہ ایک اچھی کوشش کی حیثیت رکھتے ہیں اور عام طور پر ان کا خیر مقدم بھی ہوا ہے مگر ابھی تک ان کے نتیجہ خیز ہونے کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی ہے۔ حق و انصاف کے علمبردار آزادی کے متوالے غیور افغان اگرچہ خدا کے بھروسے پر وقت کی سب سے بڑی جابر قوت کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں اور جان و مال کی قربانی کے زبردست جذبے سے سرشار ہو کر جارحیت کے اس سیلاب کو بڑی حد تک روک بھی دیا ہے لیکن اس کا رخ موڑ دینے میں ابھی کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ ان کی قربانیوں اور حق و انصاف پران کی استقامت کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور انھیں کامرانی و کامیابی سے ہمکنار کرے۔

اس ننگی جارحیت کی یوں تو عام طور سے مذمت ہی کی گئی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذمت کرنے والے ممالک بھی زبانی ہمدردی اور کچھ محدود نوعیت کی مالی امداد سے آگے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا اظہار ہمدردی اور نہایت معمولی درجہ کی امداد افغانستان جیسے اہم مسئلہ کے حل کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

مجلس شوریٰ اقوام متحدہ، غیر جانبدار تحریک، اسلامی کانفرنس اور تمام اسلامی و جمہوری ملکوں کو ان کی ذمہ داری پر توجہ دلاتی ہے اور توقع کرتی ہے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لیکر بلا تاخیر ٹھوس عملی منصوبہ تیار کریں گے اور حالات کو مزید خرابی اور پیچیدگی سے اور امن عالم کو تباہ و برباد ہونے سے بچائیں گے۔

۸۔ گرینیاڈا

کریبیائی خطے کے ایک چھوٹے سے ملک گرینیڈا میں امریکی مداخلت ایک اہم حقیقت کی مظہر اور اس امر کا ایک تازہ ثبوت ہے کہ بڑی طاقتیں اپنے مفاد کی خاطر بین الاقوامی قوانین وضوابط کو پامال کرنے میں کوئی جھجک اور شرم محسوس نہیں کرتی ہیں۔ گرینیڈا اور افغانستان میں ان طاقتوں نے جو قابل مذمت رویہ اختیار کیا ہے اس نے ان کے ناپاک عزائم اور ظالمانہ کردار کو ایک بار پھر بے نقاب کر دیا ہے۔

جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ تمام جمہوری ملکوں خاص طور پر تیسری دنیا کے ممالک کو توجہ دلانا ضروری سمجھتی ہے کہ وہ ان شرمناک واقعات و اقدامات کو سطحی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ ان سے سرسری طور پر گذر جانا نہ صرف کمزور اقوام کی محرومی کا سبب بنتا رہے گا بلکہ اس سے عالمی امن کو سخت خطرات لاحق ہو جائیں گے۔

مجلس شوریٰ کے نزدیک حق و انصاف کا عین تقاضا ہے کہ گرینیڈا کے عوام کو اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنے کا موقع ملے اور امریکہ اپنی فوجیں کوفی الفور واپس بلائے۔

۹۔ پی ایل او کی اندرونی کش مکش

قبلہ اول کی بازیابی اور ارض فلسطین کی آزادی کا مسئلہ ایک مدت سے یوں ہی خاصا پیچیدہ، دشوار اور صبر آزما بنا چلا آرہا تھا مگر اب پی ایل او کی اندرونی کش مکش نے اسے اور زیادہ مشکل اور پرخطر بنا دیا ہے۔ لبنان میں جناب یاسر عرفات کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان مسلح تصادم حد درجہ افسوسناک ہی نہیں سخت تشویشناک بھی ہے۔ اس ناعاقبت اندیشانہ کش مکش اور تصادم کے نتیجہ میں فلسطین کی تحریک مزاحمت کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی تلافی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ یہ بدبختانہ اور ناعاقبت اندیشانہ کش مکش بلا تاخیر ختم ہو۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اس صورت حال سے بالواسطہ ان بڑی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہو رہے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور افتراق کے ہمیشہ خواہاں اور اس کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں اور فلسطینیوں کو آزادی اور مسلمانوں کو قبلۂ اول کی بازیابی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ کربناک اور قابل مذمت کروٹ اسرائیل کے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے۔

اس موقع پر مرکزی مجلس شوریٰ عالم اسلام کو اس صورت حال کی طرف شدت کے ساتھ متوجہ کرنا ضروری سمجھتی ہے اور اس توقع کا اظہار کرتی ہے کہ پی ایل او کے اختلافات کو دور کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے اسی طرح مختلف فلسطینی گروہوں اور ان کے حامیوں پر زور دیتی ہے کہ وہ صبر و تحمل، دوراندیشی اور بالغ نظری

نظری سے کام لیتے ہوئے اپنے مقاصد پر نظر جمائے رہیں اور رایوں کے معمولی اختلافات کو حدود میں رکھیں اس سلسلہ میں اسلامی کانفرنس اور غیر جانبدار تحریک پر بھی خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے مجلس شوریٰ کو توقع ہے کہ یہ دونوں ہی ادارے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کریں گے۔

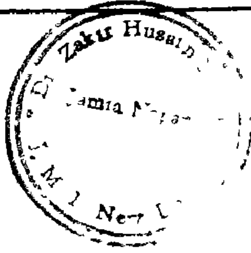
آخر میں وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہے کہ وہ عرب بھائیوں کو بالعموم اور فلسطینی بھائیوں کو بالخصوص سوجھ بوجھ سے کام لینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

مسلم مجلس مشاورت

مسلم مجلس مشاورت ہندوستانی مسلمانوں کا ایک مشترک پلیٹ فارم ہے اسے اس غرض کے لیے وجود میں لایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر ان کی جماعتیں اور تنظیمیں اپنے مشترک امور و مسائل پر مل جل کر غور کریں اور انہیں باہمی اشتراک و تعاون سے حل کیا جائے ۱۹۶۲ء کے حالات میں جب مجلس مشاورت قائم ہوئی تھی ان کے مقابلہ میں آج کے حالات جن سے ملک و ملت دوچار ہیں کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہیں اس کا عین تقاضا ہے کہ ان پر زیادہ سنجیدگی اور اہتمام سے غور ہو اور موثر تدابیر اختیار کی جائیں۔

اگرچہ یہ خود حکومت کی ایک بے حد اہم ذمہ داری ہے کہ وہ کسی پہلو سے بھی حالات کو بگڑنے نہ دے اور اس امر کے قابل اطمینان مواقع فراہم کرتی رہے کہ ملک کا ہر گروہ اپنے نظریہ و مسلک کے مطابق ایک طرف خود اپنے متعلقہ مسائل آسانی سے حل کر سکے اور دوسری طرف ملک کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں بھی بھرپور حصہ لینے کے قابل ہو جائے۔ مگر بظاہر حالات اس کی توقع بہت مشکل ہے۔ اس بنا پر جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر، ان کی جماعتوں اور فہم و شعور رکھنے والے خاص صلاحیتوں کے تمام افراد سے پر خلوص گزارش کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ وہ اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کریں اور مجلس کے مشترک پلیٹ فارم کو زیادہ سے زیادہ مضبوط و مستحکم بنانے کی فکر و تدبیر کریں مسلمانوں کو دینی و ملی تقاضوں اور ملک کی تعمیر و ترقی کے کاموں سے واقف کرائیں۔

مجلس شوریٰ ملک کے دوسرے صاف ذہن انسان پسند اور ان تمام لوگوں سے بھی اس معاملہ میں بھرپور تعاون کی اپیل کرتی ہے جو بلا تفریق ملک کے تمام گروہوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے حامی و مؤید ہوں اور جو اصل ضرورت کے کامل اتفاق کے ذریعے حکومت کو اس کی ذمہ داری پر متوجہ کرنے کے لیے مؤثر آواز اٹھا سکیں۔



مغربی ذرائع ابلاغ اور اسلام

(وزیراعظم ملیشیا)

اس موضوع پر وزیراعظم ملیشیا نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب مسلمان ملکوں کا با اقتدار طبقہ بھی اسلام سے واقفیت حاصل کر رہا ہے اور مغرب سے اس کی مرغوبیت کم ہو رہی ہے۔ (ادارہ زندگی)

مسلمانوں کی اس وقت پچاس آزاد ریاستیں ہیں جن کی آبادی ۷۰ کروڑ کے قریب ہے۔ ان کے علاوہ تیس کروڑ مسلمان غیر مسلم ممالک میں رہتے ہیں جہاں وہ اقلیت شمار ہوتے ہیں ان مسلمانوں کی اقتصادی ترقی عالم اسلام کی دلچسپی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور توقع ہے کہ اس سے ایک نیا نظام وجود پذیر ہوگا لیکن افسوس کہ اتنی بڑی آبادی کے بارے میں اب تک بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں مسلمانوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ان کے مذہبی اور ثقافتی اثرات کیا ہو سکتے ہیں لیکن ان کی حقیقت سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔

مغربی ذرائع مسلمانوں کے بارے میں خصوصی تعصب رکھتے ہیں وہ احیاء اسلام کی مساعی کو یوں دیکھتے ہیں کہ گویا وہ بڑی خوفناک کھانے کی چیز ہے۔ اسلام کے اصل اصولوں کو بروئے کار لانے کے لیے جو بھی جدوجہد ہو رہی ہے اس کو اصل رنگ میں سمجھنے کی بجائے ان لوگوں نے اسے بنیاد پرستی کا عنوان دے دیا ہے گویا یہ معاشرے کی اصلاح کی کوشش نہیں ہے کسی از کار رفتہ چیز کو دوبارہ لانے پر اصرار ہے مغربی ڈکشنریوں میں بنیاد پرستی FUNDAMENLALISM کا مفہوم یوں ہے کہ:۔

پروٹسٹنٹ فرقہ کا یہ موقف کہ بائبل صرف معنًی ہی نہیں لفظًا بھی درست ہے اور اپنے پرانے عقیدے پر مضبوطی

سے جسے رہنما ساگر بنیاد پرستی کا یہی مفہوم ہے تو مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ ہر مسلمان بنیاد پرست ہے، ہم ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن ہر زمانہ کی کتاب ہے اور اس کا ہر ہر حرف حق ہے اور جہاں تک اسلام کی روایت کا تعلق ہے کہ اس نے ہر زمانے میں باطل اور جھوٹ کا مقابلہ کیا ہے۔

اسلام کے احیا کی تحریک اس وقت اٹھی ہے جب دنیا پر چھائے ہوئے نظریوں مثلاً سوشلزم اور سرمایہ داری کی کمزوریاں اور ناکامیاں سب پر تجربے سے واضح ہو گئیں اور یہ صرف مسلمان ہی کا فرض نہیں ہے بلکہ غیر مسلموں کے اپنے مفاد کا تقاضا بھی ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کا کھلے دل سے مطالعہ کریں۔

اگر اسلام کے پاس کوئی دینے کی چیز نہیں ہے تو پھر تشویش اور ڈر کا ہے کا ہے اور اگر اس کے پاس ہے تو اس سے اپنے آپ کو محروم کیوں کرتے ہیں۔

ملائشیا میں ہم نے اسلامی بنک یونیورسٹی قائم کی ہے تو مغربی ذرائع ابلاغ نے اس کی عجیب وغریب معنی پہنائے اور اس کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلائیں انھوں نے اسلام کو کھلے دل و دماغ کے ساتھ سمجھنے کی بجائے اس کو یوں پیش کیا گویا وہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے جس سے بچاؤ ضروری ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہر مذہب اور نظریے میں انتہا پرست ہوتے ہیں لیکن یہ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اسلام کے انتہا پسند دوسرے مذہب اور نظریے کے انتہا پسندوں کے تناسب میں کہیں کم ہیں۔ کیا عہد گذشتہ میں پوپ کی جانب سے احتساب کی ظالمانہ کارروائیاں نہیں ہوئی تھیں ؟

اسلئے اسلام کے ناقدین کا یہ موقف قطعی غلط ہے کہ اسلام کا شعور جوں جوں ترقی کرے گا غیر مسلموں کے حقوق خطرے میں پڑتے جائیں گے۔

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے کہ جو اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کو حق دیا کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کریں۔ تاریخ گواہ ہے مسلمانوں نے اپنے قلمرو میں بسنے والی تمام اقلیتوں کو تحفظ دیا اور ان کے حقوق کا اعتراف کیا کہ ہر مذہب والا اسلامی حکومت میں امن و سکون سے رہتا تھا اور اپنے عقائد کی پابندی پوری آزادی سے کرتا تھا حقیقت میں اسلامی ریاست ہی اولین ریاست تھی جس نے مختلف مذاہب کو امن و سکون کے ساتھ باہم مل کر رہنے کی تربیت دی تھی۔ اسلام کا یہ نظریہ روئے زمین پر عدیم النظیر ہے اور تاریخ میں آپ کو اس کی مثال نہیں ملے گی۔ یہی متعصب مغربی ذرائع ابلاغ اسلئے اسلام کو یوں پیش کرتے ہیں گویا یہ آگ برسانے کا عمل ہے جس سے بڑی طاقتوں کے مفادات کو

بڑا خطرہ ہے۔ بہتر ہوتا کہ یہ ذرائع ابلاغ اسلام کے سیاسی سماجی اور اقتصادی تعلیمات کا مطالعہ کرتے اور دیکھتے کہ اس نے اس سلسلے میں کتنی مفید اور بہتر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی بجائے ان کا پریس ریڈیو اور ٹی وی اسلام کی جدوجہد کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے میں کوشاں ہے صرف یہی نہیں کہ اسلام کی تعلیمات ان کی تنقید کا نشانہ بنتی ہے بلکہ وہ احیائے اسلام چاہنے والوں پر حملہ کرتے ہیں۔

مغرب کے جو اہل علم اپنے آپ کو اسلام کا ماہر سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد کا بھی صحیح طور پر علم نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ انسانیت کو درپیش اہم مسائل کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے اور نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ کیا ہے۔

میں مثال میں صرف ایک کتاب کا ذکر کروں گا۔ حال میں ایک مغربی مصنف نے ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ ایران کے زیر اثر ملائشیا کے بعض بنیاد پرست مسلمانوں نے اپنی کاروں کے گدے پھینک دیے اور اپنے ٹی وی سیٹ دریا میں بہا دیے۔

میں اس کے جواب میں غیر جانبدار افراد کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ملائشیا میں تشریف لائیں اور بچشم خود ملائشیا کے دریاؤں کو دیکھیں کہ کہاں ٹی وی سیٹ پھینکے گئے ہیں اور کس کار سے گدا نکال کر لکڑی کی سیٹ رکھی گئی ہے۔

اسلام کے مخالفین یہ بھی چاہتے ہیں کہ مسلمان قرآن کو سمجھنا ترک کر دیں اور ایسا کریں گے تو ترقی کر سکیں گے مغربی ذرائع ابلاغ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ احیائے اسلام کی ہر چیز کو توڑتا مروڑتا اور اس کے خلاف ہر خبر کو اچھالتا اور مسخ کرتا ہے اور نمایاں کرتا ہے جو مسلمان اپنا تشخص قائم کرنے کے لیے ظالم حکومت کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں ان کو حریت پسند کہنے کی بجائے انہیں دہشت گرد باغی، علیحدگی پسند اور جارح کا نام دیا جاتا ہے گویا یہ انتہا پسند ہیں، اعتدال پسندوں کے مقابلے میں — اور بنیاد پرست ہیں ترقی پسندوں کے مقابلہ میں اسلام کے بارے میں اطلاعات کو مسخ کرنے کی ان کی یہ شرارت ہمارے لیے بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس کا مقابلہ کیسے کیا جائے اور غلط اطلاعات کی جگہ صحیح اطلاعات کیسے دی جائیں، مسلمانوں کو اس پر غور کرنا چاہیے۔

مجھے افسوس ہے کہ مسلم اقلیتوں کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے غیر مسلم اقلیتوں کو مسلم ممالک میں جتنی مراعات حاصل ہیں اتنی مسلم اقلیتوں کو غیر مسلم ممالک میں نہیں ہیں۔ آسام اور بیروت میں جو کچھ ہوا ہے وہ بتانے کے لیے بہت کافی ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو محترم نہیں سمجھی جاتی ہے۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں مسلمانوں کا بھی قصور ہے۔ آج کی دنیا طاقت کی دنیا ہے اس میں کمزور کا نشان نہیں ہے۔ مسلمان ہر معاملہ میں پسماندہ ہیں صنعت میں، حرفت میں، تعلیم میں اور پھر متحد و متفق رہنے کی بجائے انتشار کا شکار ہیں وہ اپنی کمزوریوں کو بھی جانتے ہیں اور ان کا علاج بھی ان کو معلوم ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں پر قابو پانے میں بھی کمزور ہیں۔ ہم اہل ملائشیا اپنے مسلمان بھائیوں کی ترقی کے لیے جہاں تک ممکن ہو ہر مدد کے لیے تیار ہیں۔

آج کی جدید دنیا کے چیلنج بھی جدید ہیں۔ آج جیت اس کی ہے جو کہ جرات مندی کے ساتھ مقابلہ کے لیے کھڑا ہو اور دکھی دنیا کے لیے مدد کے لیے آمادہ ہو۔ مسلمان اس کردار کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں۔ پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانیں۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ وہ دکھی انسانیت کا ہاتھ بٹائیں۔ اگر ہم نے یہ کام کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نصرت ہمارے ساتھ ہو گی۔　　("ریاض" ملتان)

حوالہ جات (بقیہ صفحہ ۴۴)

قرآن میں حضرت یعقوبؑ کا اپنے فرزند یوسفؑ سے یہ قول مذکور ہے۔ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ (یوسف ۶) "اسی طرح تیرا رب تجھے منتخب کرے گا۔ اور باتوں کو (اپنے مقصد کی طرف) پھیرنا سکھائے گا۔" یہی بات یوسفؑ نے اس قصہ کے آخر میں اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے کہی ہے۔ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ (یوسف: ۱۰۱) "میرے رب تو نے مجھے سکونت بخشی اور مجھ کو باتوں کا پھیرنا سکھایا۔"

۹ تفہیم القرآن جلد دوم ص ۴۰۳، ۴۰۴۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱۰ تفصیل کے لیے دیکھیے برنا باس اردو ترجمہ آسی ضیائی طبع اول ۱۹۸۲ء مرکزی مکتبہ دہلی

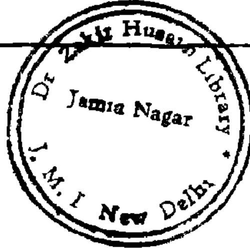
۱۱ اعجاز القرآن والبلاغۃ النبویہ مصطفےٰ صادق رافعی ص ۳۳۳ طبع دوم ۱۳۸۹ھ

۱۲ سیرت سرور عالم مولانا مودودی ص ۹۸ جلد دوم۔ طبع سوم ۱۹۸۰ء لاہور

۱۳ رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب سید اسعد گیلانی بحوالہ کتاب الشفاء از قاضی عیاض

۱۴ بخاری جلد دوم ص ۶۲۰

۱۵ احمد ذکی صفوت جمہرہ خطب العرب جلد اول ص: ۵۱ نیز انساب الاشراف۔ بلاذری جلد اول ص: ۱۱۸، ۱۱۹ نیز الکامل ۲/ ۱۱، ۱۲، ۱۱۰ اقد ۲۷۶، ۲۷۷



رسائل و مسائل

زمین کو بٹائی یا کرائے پر دینے کا معاملہ

(سید احمد قادری)

خط:-

ایک صاحب نے ایک رسالے میں یہ مضمون لکھا ہے کہ کوئی فرد زمین کا مالک نہیں ہوتا۔ زمین کا مالک اللہ ہے۔ نیز یہ کہ زمین کو بٹائی پر یا کرائے پر دینا حرام ہے کسی کے پاس کھیت ہے تو وہ کاشت خود کرے یا کسی کو کاشت کرنے کے لیے مفت دے دے۔ دلیل کے طور پر انھوں نے حضرت جابر اور حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہما کی حدیثیں پیش کی ہیں جن میں کھیت کو فصل کی بٹائی پر دینے کی ممانعت ہے اور اس میں یہ ہے کہ کسی کے پاس زمین ہو تو خود فصل اگائے یا دوسرے کو مفت بغیر کسی معاوضے کے فصل اگانے کے لیے دے دے۔ جن صاحب نے وہ مضمون مجھے دکھایا۔ میں ان میں پیش کی ہوئی حدیثوں کا جواب نہیں دے سکا۔ مضمون ہے تو کسی کمیونزم زدہ شخص کا لکھا ہوا، لیکن احادیث کی تطبیق دوسری احادیث سے کیا ہے۔ مہربانی کر کے آپ اس کا جواب دیں۔

جواب

یہ کوئی نئی بحث نہیں ہے۔ یہ آپ نے ٹھیک سمجھا کہ مضمون کسی اشتراکیت زدہ شخص نے لکھا ہے۔ جو شخص بگلا اپنے گھڑے ہوئے کسی خیال کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے پر تُل جاتا ہے وہ پورے قرآن اور تمام احادیث کو اپنے سامنے نہیں رکھتا بلکہ اپنے مطلب کے مطابق جو چیزیں ہوتی ہیں ان کو سیاق و سباق سے کاٹ کر جمع کر دیتا ہے۔ مضمون نگار صاحب نے بھی یہی "خدمت" انجام دی ہے کیسی بھی غلط خیال کیا اس "خدمت" کے بغیر

قرآن و حدیث سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی موضوع پر اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" ۱۹۵۰ء میں شائع کی تھی۔ اگرچہ یہ بحث ۱۹۵۰ء سے بھی پرانی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان تمام احادیث کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے جن سے اشتراکیت زدہ لوگ یہ ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ زمین کا مالک کوئی فرد نہیں ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ زمین کو بٹائی یا کرائے پر دیا جائے۔ میں اس کتاب کے بڑے عنوانات یہاں لکھتا ہوں آپ کو اس سے اندازہ ہو گا کہ اس موضوع پر اس کتاب میں کتنی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

زمین کی شخصی ملکیت از روئے قرآن — زمین کی شخصی ملکیت از روئے حدیث، مزارعت کا مسئلہ مزید تائیدی روایات۔ فقہا کے مذاہب۔ مذہب حنفی۔ مذہب حنبلی۔ مذہب مالکی۔ مذہب شافعی — اصلاح کے حدود اور طریقے۔

اس طرح اس موضوع پر یہ ایک جامع کتاب بن گئی ہے۔ یہ حقیر محنت کر کے اگر اس موضوع پر لکھے تو وہ اس کتاب سے بہتر ہرگز نہ ہو گا اسلئے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ اس کتاب کا بغور مطالعہ کریں اشتراکیت زدہ لوگ عوام مسلمانوں کے ذہنوں میں جو وسوسے ڈالتے ہیں ان سب کا تسلی بخش جواب اس کتاب میں موجود ہے۔ "تحقیق مسئلہ" کے ذیلی عنوان سے مولانا مغفور نے جو کچھ لکھا ہے اس کے صرف دو اقتباسات یہاں دے رہا ہوں۔

(۱) اسلام اس تخیل سے قطعی نا آشنا ہے کہ زرعی جائداد کی ملکیت دوسری تمام اقسام کی املاک اور جائدادوں سے کوئی الگ نوعیت رکھتی ہے جس کی بنا پر اس سب کے برعکس اس کی جائز ملکیت کے لئے رقبے کے لحاظ سے کوئی حد مقرر کر دی جائے یا یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ ہر شخص اور ہر خاندان کے قبضے میں صرف اتنی ہی زمین رہنی چاہیئے جس میں وہ خود کاشت کر سکے یا خود کاشتی سے زائد ملکیت کا حق دینے کے بعد دوسری ایسی پابندیاں لگادی جائیں جن کی وجہ سے یہ حق بے معنی ہو کر رہ جائے ایسی حد بندیوں کیلئے فی الحقیقت کتاب و سنت میں کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

(۲) جو شخص خود کاشت نہ کرے یا نہ کر سکتا ہو یا خود کاشتی کی حد سے زائد زمین رکھتا ہو اسکو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اپنی زمین دوسرے لوگوں کو زراعت کیلئے دے اور پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف جس پر فریقین میں معاہدہ ہو اپنا حصہ مقرر کرے۔

تنقید و تبصرہ

احتساب جماعت اسلامی حلقہ مدھیہ پردیش کی چہار سالہ رپورٹ صفحات ۴۸۔ آفسٹ کی طباعت کاغذ عمدہ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ۔ دفتر جماعت اسلامی ندیم روڈ بھوپال۔

شروع کے ۳ صفحات میں رپورٹ پیش کرنے کا مقصد اور جماعت اسلامی کا تعارف ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مرتب کا نام تو نہیں ہے لیکن جو لوگ جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب کے اسلوب تحریر سے واقف ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ یہ رپورٹ انھوں نے مرتب کی ہے اور اس کو ایک مفید کتاب بنا دیا ہے۔ اس میں ان کے فکر و فن کے ادب پارے بکھرے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ نگاہ ان پر رکتی ہے۔ مثال کے طور پر "موانع و مشکلات" کے ذیلی عنوان کے تحت پہلے یہ عبارت سامنے آتی ہے۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ اس راستے میں موانع و مشکلات کا آنا ضروری ہے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ چیزیں کسی دعوت کے حق ہونے کی علامت بھی ہیں ظاہر ہے کہ حق اگر حق ہے تو باطل اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ اپنی موت پر راضی ہو جائے اور کوئی مزاحمت نہ کرے، اگر شرار بولہبی چراغ مصطفوی سے ستیزہ کاری کے بجائے اسے اپنے دامن میں لے لے اور حق بے ضرر بن کر باطل کے سایہ تلے پھلنے پھولنے لگے تو اس کے معنے یہ نہیں کہ باطل شریف ہو گیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ حق کا مزاج وہ نہیں رہا جس کا علم بردار کہہ سکتا ہے ؎

میں کھٹکتا ہوں دل شیطان میں کانٹے کی طرح

ٹمٹماتے ہوئے دیے تو ہوا کی ذرا سی لہر سے بجھ جاتے ہیں لیکن بھڑکتے ہوئے الاؤ ہوا کے مخالف جھونکوں سے اور زیادہ بھڑکتے ہیں" (ص ۳۴)

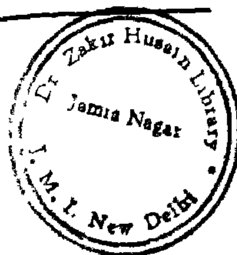
امید ہے کہ جماعت اسلامی ہند کے متوسلین اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

تبلیغی نصاب کا ایک مطالعہ تابش مہدی، صفحات ۱۳۶۔ آفسٹ کی طباعت، قیمت سات روپیہ
ملنے کا پتہ: مکتبہ الایمان دیوبند ۲۴۷۵۵۴

جناب تابش مہدی نے تبلیغی نصاب جلد اول و دوم کے درج ذیل موضوعات کا ایک مطالعہ پیش کیا ہے۔

(۱) حکایات صحابہ (۲) فضائل نماز (۳) فضائل قرآن (۴) فضائل ذکر (۵) فضائل درود۔ (۶) فضائل صدقات۔

زیر تبصرہ کتاب کا یہ تیسرا اڈیشن ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "تبلیغی نصاب" کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش ملک کے اندر پہلے سے موجود تھی۔ اس کتاب میں پہلے "تمہید گفتنی" کے عنوان سے مصنف نے اپنی اس تصنیف کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید انور علی صاحب کا پیش لفظ ہے اور پھر مصنف کا مقدمہ ہے۔ اس مقدمہ سے تبصرہ نگار کو تبلیغی جماعت اور تبلیغی نصاب کے بارے میں بعض ایسی باتیں معلوم ہوئیں جو پہلے معلوم نہ تھیں۔ اصل کتاب میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تبصرہ نگار مصنف کی ہر بات سے متفق ہو۔ "تبلیغی نصاب" سے جو بہت بڑا نقصان پہنچ رہا ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اسے پڑھ کر دین اسلام کے ایک محدود مفہوم اور محدود دائرۂ عمل پر مطمئن ہو جاتے ہیں بلکہ آگے بڑھ کر اس کے وسیع مفہوم کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح اعلائے کلمۃ اللہ کی راہ کے پتھر بن جاتے ہیں۔ یہ کتاب ایک حد تک اس ذہن کی اصلاح کے لیے مفید ہے۔



MONTHLY ZINDAGI



R N I./2188/57
MRD. 66
JAN. 1984

صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا


ماہنامہ
زندگی
رامپور





ماہنامہ

زندگی

مدیر: سید احمد قادری

چندہ سالانہ		چندہ سالانہ
ہندوستان سے -/30		بیرون ملک سے
ششماہی		بذریعہ ہوائی جہاز -/100
ہندوستان سے -/15		بذریعہ بحری جہاز -/60
قیمت فی پرچہ 00-/3		

جلد-۲ ۷	ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ مطابق فروری ۱۹۸۴ء	شمارہ- ۲

اس دائرہ ◯ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ

آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ چندہ ارسال کریں۔ اگر خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے پرچہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ انشاءاللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔

منیجر زندگی۔ نئی دہلی ۲

مالک دعوت ٹرسٹ۔ ایڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر محمد حبیب اللہ قادری مطبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی
مقام اشاعت دفتر ماہنامہ زندگی چاندنی محل دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

قرآن کریم ایک ایسا جہان معنی ہے جس میں داخل ہوتے ہی آسمان و زمین کی تمام وسعتیں نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں، کبھی خدا کے فرماں بردار اور معصوم بندے۔ فرشتے۔ پرفشاں نظر آتے ہیں اور کبھی خدا کے نافرمان اور سراپا شرارت بندے۔ شیاطین۔ پائے کوب دکھائی دیتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام کے سر پر نیابت الٰہی کا تاج زرنگار لمعہ فگن نظر آتا ہے۔ کبھی انبیائے کرام علیہم السلام کی پاکیزہ ترین مجلسیں آراستہ دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی نظر آتا ہے کہ باطل، حق کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو رہا ہے۔ باطل کی صفوں میں کفار و مشرکین بھی ہیں اور منافقین بھی، مجوس بھی ہیں، یہود بھی، اور نصاریٰ بھی ہر گروہ اپنی صفتوں اور خصلتوں کے ساتھ متحرک نظر آتا ہے۔ ہم اعداء اللہ کے خصائل و صفات سے سرسری نہیں گذرتے بلکہ رک کر ان سے پناہ مانگتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ان صفات و خصائل سے ہمیں محفوظ رکھنا۔ دو مقامات ایسے ہیں جہاں ہمیں "حزب اللہ" اور ان کی صفات بھی نظر آتی ہیں۔ ایک مقام سورۂ مائدہ میں اور دوسرا سورۂ "المجادلہ" میں ہے۔ ہماری نگاہ ان پر رک گئی ہے ہم اس وقت اسی گروہ کی صفات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مومنین صادقین سے الگ کوئی گروہ نہیں ہے۔ وہی گروہ ہے جسے حزب اللہ کے خطاب سے نوازا گیا ہے حزب اللہ میں داخل وہ لوگ ہیں جو اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے سربراہ ہیں۔ یہ جن صفات سے آراستہ ہیں انہیں صفات سے متصف کوئی جماعت دین حق کو ادیان باطلہ پر غالب کر سکتی ہے۔ یہ صفتیں موجود نہ ہوں تو ایسی جماعت سب کچھ کر سکتی ہے لیکن فریضۂ اقامت دین سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ سورۂ مائدہ میں آٹھ یا نو صفات کا ذکر ہے اور ان صفات کی تعریفات و تفصیلات اسی جہان معنی۔ قرآن عزیز۔

ین موجود ہیں۔ ڈھونڈیئے اور تلاش کیجئے کہیں کوئی صفت چمک رہی ہوگی اور کہیں کوئی صفت دمک رہی ہوگی۔ انہیں اپنے دلوں میں آتاریے اور اپنے جوارح میں پیوست کیجئے۔

سورۂ المائدہ کی تین آیتوں کے ترجمے یہ ہیں :-

اے ایمان لانے والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) اللہ اور بہت سے لوگ ایسے پیدا کر دے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ جو مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں

اور جو اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو اپنا دوست بنالے اسے معلوم ہو کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔ (المائدہ - ۵۴-۵۵-۵۶)

یہاں حزب اللہ کی سب سے پہلی صفت محبت الٰہی ہے۔ روحانی زندگی نام ہی ہے محبت الٰہی کا۔ محبت کے بعد کی صفات محبت ہی کے دلائل اور اس کے ثمرات ہیں۔ درحقیقت وہ کسوٹی ہیں محبت الٰہی کی۔ اگر کسی بندے کے دل میں اپنے منعمِ حقیقی اور اپنے رحیم و کریم مالک کی محبت نہ ہو تو وہ کیسا بندہ ہے؟ کیا ناشکرا بھی کوئی بندہ ہوتا ہے؟ جو مالک ہی نہیں، ہمارا خالق بھی ہے، جس نے ہمیں وجود بخشا، صلاحیتیں عطا کیں، دیدۂ بینا اور گوش شنوا دیا، جس نے دھڑکنے والا دل اور سوچنے والا دماغ دیا۔ اور جس کی نعمتیں اتنی ہیں جنہیں ہم گن نہیں سکتے۔ اس کا زندہ احساس ہو تو مالک کی محبت دل سے ابلتی، آنکھوں سے بہتی، رگوں میں پیوست ہوتی اور جوارح سے ٹپکتی ہے۔ محبوب مجازی کے ہجر و فراق میں آہ نیم شبی اور نالہ سحر بالکل بے معنی، بے روح اور فنا پذیر ہے۔ اس آہ نیم شبی اور نالہ سحر کے مقابل جو محبوب حقیقی کے شوق دیدار اور اشتیاق ملاقات میں دل سے نکلتی ہے اور زبان پر نالہ بن جاتی ہے۔ مالک کی طرف سے دل نوازی اور سرفرازی یہ ہے کہ اس نے پہلے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے (یُحِبُّهُمْ) یہ کیسی جاں نواز

اور یہ کیسی سرفرازی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ وہ اس کی والہانہ اطاعت میں سرگرم اس کی رضا و قربت کا طالب اس کے دیدار کا شائق اور اس کی نگاہ لطف و کرم کا آرزو مند ہو اور بندے سے اللہ کی محبت کے معنے یہ ہیں کہ دنیا میں وہ اس کا حامی و ناصر و کارساز ہو اور آخرت میں وہ اس پر اپنی رضا انڈیل دے اور اپنے دیدار جاں نواز سے سرفراز فرمائے۔ یہ وہ دیدار جو جنت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ بات بھی سامنے رکھیے کہ محبت صرف محبوب کے دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ دل لبھانے والی گفتار سے بھی جاگ اٹھتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے محبوب حقیقی کی دل ربا، شیریں اور سرمدی آواز ہی سنکر بیکار اٹھے تھے۔ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ (اے رب مجھے یارائے نظر دے، کہ میں تجھے دیکھوں) یہ قرآن اللہ کا کلام ہی تو ہے، اس کی گفتار ہی تو ہے کتنی دل ربا، کتنی شیریں، سرمدی دل میں اتر جانے والی، فصاحت کی روح اور بلاغت کی جان۔ کیا یہ کلام اپنے متکلم سے محبت پیدا نہیں کرتا؟

"مومنوں پر نرم" یعنی مومنوں کے لیے نرم خو، نرم مزاج۔ یہ خوبی اللہ کی دوسری صفت ہے اور اتنی اہم ہے کہ سورۃ الفتح کے اخیر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام کی صفت بتائی گئی ہے۔ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (وہ آپس میں مہربان و نرم دل ہیں) یہ بات ذہن میں تازہ رکھیے کہ قرآن کریم میں یا اَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا سے تو کہیں ان لوگوں کو بھی مخاطب کیا گیا ہے جو ضعف ایمان یا نفاق میں مبتلا تھے لیکن "المؤمنون" ہر جگہ مخلص اور حقیقی مومنوں ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اب اس پر غور کیجیے کہ خدا سے محبت کرنے والے لوگ، مومنوں پر نرم کیوں ہوتے ہیں؟ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر مومن خدا سے محبت رکھتا ہے۔ اس لیے سب کے سب ایک ہی محبوب کے چاہنے والے ہوتے ہیں اور ہر مومن جو خدا سے محبت کرتا اور محبت رکھتا ہے وہ خدا کا محبوب ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی مومن خدا کے محبوب بندہ پر سختی نہیں ہو سکتا۔ یہ مجازی محبت نہیں ہے۔ جہاں رقابت کا عمل دخل ہوتا ہے بلکہ یہاں ہر چاہنے والا دوسرے چاہنے والے کا معاون ہوتا ہے۔ وہ محبوب حقیقی کی رضا حاصل کرنے میں دوسرے کا مددگار ہوتا ہے یہاں محبوب کے ساتھ ہم آغوشی نہیں ہے۔ اس کا وصل و وصال نہیں ہے کہ کشاکش یا رقابت کا کوئی سوال پیدا

ہو۔ یہاں تو سب صرف اس کی رضا چاہتے ہیں۔ اس کی نظرِ عنایت کے امیدوار ہیں۔ چاند سب کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ سورج سب کو روشنی اور گرمی دیتا ہے۔ کیا چاند کی ٹھنڈک اور سورج کی گرمی پانے والوں کے درمیان رقابت ہوتی ہے؟ کیا اس میں غیرت کا سوال پیدا ہوتا ہے؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ محبوبِ حقیقی نے اپنے چاہنے والوں کو ایک مقصد دیا ہے، ایک نصب العین دیا ہے ایک منزل بتائی ہے اور سارے کے سارے مومن ایک ہی مقصد، ایک ہی نصب العین اور ایک ہی راہ کے رہرو ہوتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی راہ کے راہی ایک دوسرے کے لیے سخت ہوں، ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے والے ہوں اور ایک دوسرے سے کینہ رکھنے والے ہوں؟ کیا اس طرح وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں

"کفار پر سخت" یعنی دشمنانِ اسلام کے سامنے پتھر کی چٹان — یہ حزب اللہ کی تیسری صفت ہے اور اس کی اہمیت بھی یہ ہے کہ سورہ فتح کے آخر میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس ساتھیوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (کفار پر سخت) کفار پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ان کا رویہ اور سلوک کافروں کے ساتھ تند خوئی اور کرختگی کا ہوتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصدِ زندگی، اپنے نصب العین، اپنی منزلِ مقصود اور اپنے دین کے معاملے میں مداہنت نہیں کرتے۔ کفار اگر ان کو ایمان و اسلام اور اس کے تقاضوں سے کسی لالچ یا کسی دھمکی کے ذریعے ہٹانا چاہیں تو وہ ان کو پتھر کی چٹان پائیں۔ ترغیبات و ترہیبات کا کوئی طوفان بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ موٹی بات ہے کہ ایمان و اسلام کے معاملے میں مداہنت کرنے اور اپنا موقف چھوڑ دینے والی کوئی جماعت حزب اللہ نہیں ہو سکتی۔ وہ نہ اقامتِ دین کر سکتی ہے اور نہ اپنے محبوبِ حقیقی کی نظرِ عنایت کی مستحق ہو سکتی ہے۔

"اللہ کی راہ میں جہاد" یعنی اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جدوجہد اور سرگرمِ عمل۔ یہ حزب اللہ کی چوتھی صفت ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ ہی اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کا وہ ذریعہ ہے جس کی اساس پر یہ بشارت سنائی گئی ہے۔ فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (اور اللہ ہی کی پارٹی ہے جو غالب رہنے والی ہے) یہی بات سورۂ صافات کے آخر میں کہی گئی ہے۔ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (اور ہمارا لشکر بے شک وہی غالب رہنے والا ہے) "ہمارا لشکر" سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو حزب اللہ کے لقب سے نوازا گیا ہے "جُندُ اللہ" اور "حزبُ اللہ" ہم معنےٰ الفاظ ہیں۔ بلاشبہ فرشتے بھی اللہ کا لشکر ہیں۔ لیکن یہاں جن

لوگوں کو حزب اللہ قرار دیا گیا ہے وہ اللہ رب العزت کے وہ وفادار بندے ہیں جو اس کے دین کو غالب کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں ۔ "جہاد" سے مراد صرف قتال نہیں ہے بلکہ ہر وہ جد و جہد مراد ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کی جائے ۔ جہاد جسم و جان سے بھی ہوتا ہے اور مال و دولت سے بھی اور زبان و بیان سے بھی ۔ دشمنان حق کے مقابلہ میں زبان کے تیر لوہے کے تیر سے کم نہیں ہوتے بلکہ بعض اوقات ان سے بھی بڑھ جاتے ہیں ۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان سے جو جہاد کیا تھا اس کی اہمیت کم نہیں ہے ۔ حدیث میں ہے :۔

"شرک کرنے والوں سے جہاد کرو ۔ اپنے مالوں سے اپنی جانوں سے اور اپنی زبانوں سے ۔"

(ابوداؤد، نسائی)

"ملامت گروں کی ملامت سے بے خوفی" یہ حزب اللہ کی پانچویں صفت ہے غلبۂ دین کیلئے اللہ کی راہ میں ۔ جہاد اس صفت کے بغیر یا تو ہو نہیں سکتا یا ناقص ہوتا ہے ۔ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ اقامت دین کی راہ کا یہ پہلا مرحلہ ہے ۔ اس راہ میں قدم رکھتے ہی ملامت کرنے والوں اور ناصحوں سے سابقہ پیش آتا ہے یہ ناصحان مشفق ہر طرح کے خطرات و نقصانات کی بھیانک تصویر پیش کر کے اس راہ سے ہٹانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں ۔ اللہ کی محبت اگر دوسری محبتوں پر غالب نہ ہو ۔ اسی طرح اللہ کی ناراضی کا خوف اگر دوسری تمام ناراضیوں کے خوف پر مستولی نہ ہو تو راہ محبت سے قدم ہٹ سکتے یا ہٹ جاتے ہیں ۔

میں نے جب راہ محبت میں قدم رکھا تھا　　　دور تک آئے تھے ناصح مجھے سمجھانے کو

یہ پہلا مرحلہ ختم نہیں ہوتا ، مجاہدین کے ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہر مرحلہ میں پاؤں پھسل جانے کا اندیشہ موجود رہتا ہے اسی لیے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا (اے ہمارے رب ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ کرنا) کی دعا سکھائی گئی ہے ۔ ہاتھ پھیلا کر پورے خلوص اور استحضار معنی کے ساتھ ہمیشہ یہ دعا مانگتے رہنا اس راہ کا بہت بڑا سہارا ہے ۔

"اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ" یہ حزب اللہ کی چھٹی اور ساتویں صفت ہے ۔ قرآن عزیز پر تدبر کرنے والے محققین نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ پورے دین پر عمل کرنے کی ایک تعبیر ہے ۔ انسان کے پاس صرف دو چیزیں ہیں جان اور مال ۔ نماز جسم و جان سے متعلق تمام عبادات و ریاضات کی تعبیر اور زکوٰۃ

مال سے متعلق تمام احکام کی تعبیر ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان پر دو حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق۔ نماز، اللہ کے حقوق، اور زکوٰۃ بندوں کے حقوق کی تعبیر ہے یہ ایک پہلو ہے ۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے بغیر تو کسی شخص کا مومن و مسلم ہونا بھی محلِ نظر ہے، اس کے حزب اللہ میں داخل ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تیسرا پہلو یہ ہے نماز جسم و جان کی طہارت و طاقت کا خزانہ اور زکوٰۃ تزکیۂ مال کا وسیلہ ہے۔

اس مقام میں اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۝ کا فقرہ بھی ہے۔ رکوع کا لفظ یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں ہے بلکہ اس کا لغوی معنے مراد ہے۔ اس کے لغوی معنے فروتنی، نیازمندی عاجزی اور دل شکستگی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مارے باندھے کی نماز و زکوٰۃ، خشوع اور خضوع اور حضورِ قلب کے بغیر نماز و زکوٰۃ حزب اللہ کی صفت نہیں ہو سکتی، بلکہ ان کی نمازیں اور ان کی زکوٰتیں خلوص دل جھکاؤ، فروتنی، عاجزی اور نیازمندی کے ساتھ ادا ہوتی ہیں۔ اگر "وھم راکعون" کو ایک مستقل فقرہ مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صرف اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ ہی میں نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی میں ہر وقت اور ہمیشہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکے رہتے ہیں ان میں سرکشی پیدا نہیں ہوتی اس طرح فروتنی اور عاجزی حزب اللہ کی آٹھویں صفت بن جائے گی۔

"اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی"۔ یہ حزب اللہ کی آٹھویں یا نویں صفت ہے۔ صاف بات ہے کہ کسی نظریاتی اور مقصدی پارٹی کی دوستی اس پارٹی سے نہیں ہو سکتی جو اس کے مقصد اور نظریے کی مخالف اور دشمن ہو بلکہ اس کی دوستیاں اور محبتیں، اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہونگی اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ رسول اللہ اور اولیاء اللہ کی محبت، محبت الٰہی کی فرع ہے۔ جو شخص رسول اللہ سے بحیثیت رسول اور اہل ایمان سے بربنائے ایمان محبت کرتا ہے وہ اللہ ہی سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے۔ اس لیے جو اللہ کا دوست ہے وہ ہر اس شخص کا دوست ہے جو اللہ سے محبت رکھتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:-

"جس نے اللہ کے لیے محبت کی، جس نے اللہ کے لیے نفرت کی، جس نے اللہ کے لیے دیا اور جس نے اللہ کے لیے روکا اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کرلی۔" (ابوداؤد)

سورۃ المائدہ کی یہ تین آیتیں قدآدم آئینہ ہیں۔ یہ وہ آئینہ نہیں ہے جو صرف ہماری صورتوں اور ہمارے اجسام کو سامنے لاتا ہے اور نہ یہ وہ ایکسرے ہے جو صرف جسم کے پھوڑوں، دھبّوں، پتھروں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کا پتہ دیتا ہے، بلکہ یہ وہ آئینہ ہے جو ہمارے اندر کی تمام صفات، کیفیات، جذبات اور محرکات کو ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیتا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم ایمان و ایقان کے کس مرحلے میں ہیں، کہاں چل رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟

میرے عزیز ساتھیو! سب سے پہلے مجھے جو تمہارا حقیر ترین ساتھی ہے اور پھر تمہیں اس آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھنا چاہیے۔

دوسری جگہ جہاں "حزب اللہ" کی قرآنی اصطلاح آئی ہے، سورۃ المجادلہ کی آخری آیت ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہل خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔"

اس آیت سے پہلے کئی آیتوں میں منافقین کا ذکر جو مخالفین اسلام اور دشمنانِ خدا و رسول سے محبت کی پینگیں بڑھاتے اور ان سے دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اسی لیے ان کو حزب الشیطٰن (شیطان کی پارٹی) قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ مجادلہ کی اس آیت کو سورۃ مائدہ کی مذکورہ بالا تینوں آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھیے۔

یہ آیت خود اتنی مفصل ہے کہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس آیت نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ یہ بات ناممکن ہے کہ ایمان اور دشمنان خدا و رسول کی محبت ایک دل میں جمع ہو جائیں۔ جس دل میں ایمان ہو گا اس میں دشمنان خدا و رسول کی محبت نہ ہو گی اور جس دل میں دشمنان خدا و رسول کی محبت ہو گی اس میں ایمان نہ ہو گا۔

تدبرِ قرآن پر ایک نظر

(مولانا جلیل احسن ندوی ؒ)

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ ــــــ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ۝

(آل عمران: ۳۱، ۳۲)

اس کا ترجمہ مولانا اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہے :-

کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشے گا۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ (تدبر قرآن اول صفحہ ۶۶۹)

مولانا اصلاحی کے نزدیک اس کے مخاطب وہی مذبذب قسم کے لوگ ہیں جو یہود کے آلۂ کار بن جاتے تھے اور صفحہ ۶۷۲، ۶۷۳ میں جو کچھ بھی تشریح کی ہے وہ انھیں کچے لوگوں کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ ہم کو اس سے سخت اختلاف ہے ہمارے نزدیک اس کے مخاطب اہل کتاب بالخصوص یہود ہیں جو اللہ کے محبوب و محبت بننے کے مدعی تھے۔ ان سے نبی علیہ السلام کی زبانی زبان سے کہا جا رہا ہے کہ اے اہل کتاب اگر تم اللہ کے محب ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو اس کی واحد شکل یہ ہے کہ مجھے اپنا امام مانو جس راستے پر میں چلاؤں اس راستے پہ چلو تب خدا تمہیں اپنا محبوب بنائے گا اور تمہارے جرائم کو معاف فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے تمہاری غلطیوں کو معاف کر دے گا۔ اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ خود متکلم ہے کہتا ہے کہ اللہ و رسول کے نظام اطاعت میں داخل ہو یعنی رسول اللہ کو مطاع مطلق مانو اس رسول کو مانے بغیر کوئی شخص خدا کو پا نہیں سکتا لیکن اگر یہ لوگ اب بھی نہ

مانیں تو یہ کافر ہوں گے اور کافروں سے اللہ بغض رکھتا ہے اور جس سے اللہ بغض رکھے اس کا کہاں ٹھکانا۔ غرض ہمارے نزدیک انھیں علمائے تفسیر کی رائے صحیح ہے جنھوں نے ان دونوں آیتوں کا مخاطب اہل کتاب بالخصوص یہود کو مانا ہے۔

سورۂ آل عمران آیت ۳۹ (فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ــــ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝) کا ترجمہ یہ ہے:-

فرشتوں نے زکریا کو آواز دی اور یہ بشارت سنائی کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے۔ یہ بات فرشتوں نے اس وقت کہی جبکہ وہ بیت المقدس کے بالائی کمرے میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یحییٰ اللہ کے ایک کلمہ کے مصداق سردار لذات دنیا سے کنارہ کش و زمرۂ صالحین سے نبی ہوں گے۔

صاحب تدبر نے لفظ ملائکہ کے جمع لانے کا یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے اوپر سے آہنی آواز سنی تھی۔ تعیین کے ساتھ انھوں نے فرشتے کو نہیں پہچانا تھا اس ابہام کے سبب سے قرآن نے کسی خاص فرشتے کے بجائے فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ زکریا کو جو آواز سنائی دی وہ ملکوتی تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ وہ محض ایک قلبی آواز تھی جو اُن کے کانوں میں پڑی۔

ہمارے نزدیک یہ نکتہ سنجی کی بات ہے۔ ملائکہ کے جمع لانے کی شکل میں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ جو قلبی آواز انھوں نے سنی تھی تو فرشتے کو انھوں نے نہیں پہچانا تھا دراصل شکل یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ پیغام پہنچانے والے فرشتوں کے سردار ہیں وہ اکیلے نہیں آیا کرتے بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ آتے ہیں۔ چاہے خیر و برکت کا حکم لانا ہو چاہے عذاب کا پیغام لانا ہو دونوں شکلوں میں ایک اکیلا کوئی فرشتہ نہیں آتا۔ جب زکریا نبی ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ فرشتوں نے ان کو بشارت دی تو اس نکتہ آفرینی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن مولانا تو رات و انجیل بکثرت پڑھتے رہے ہیں اور اس میں انھیں معلومات بھی ہیں اور غلو بھی۔ اس لیے انھوں نے یہ بات کہی ورنہ انبیاء علیہم السلام پورے یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ ان کے پاس جو آیا ہے وہ فرشتہ ہی ہے اور یہ بشارت وہ خدا ہی کی طرف سے دے رہا ہے۔ آگے چل کر آیت ۴۱ کا ترجمہ یہ ہے:-

زکریا نے کہا، اے میرے رب میرے لیے ایک نشانی مقرر فرما دیجیے۔ اللہ نے فرمایا کہ تمہارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک صرف اشارے سے بات کر سکو گے اور اپنے رب کو یاد کرو وہ بہت زیادہ صبح و شام......"

اس کی صاحب تدبر نے تشریح یہ کی ہے:۔

حضرت زکریا نے یہ باتیں ایک ہاتف غیبی سے سنی تھیں اور اچھی ساعت اور اچھے حالات میں سنی تھیں اس وجہ سے ان کو گمان تو یہی تھا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے لیکن وہ نہایت متواضع، متقی اور محتاط بندے تھے۔ اس وجہ سے دل کے ایک گوشے میں ایک کھٹک یہ بھی تھی کہ ممکن ہے یہ اپنے ہی گنبد دل کی صدائے بازگشت سنائی دی ہو، ممکن ہے ان کے اندر کی مخفی آرزوؤں کو کوئی دخل ہو جن سے شیطان نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے رب میرے لیے کوئی ایسی نشانی دے ٹھہرا دے جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت تیرے ہی طرف سے ہے۔ اس میں نفس یا شیطان کا کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور فرمایا کہ تمہارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شبانہ روز کسی سے کوئی بات زبان سے نہ کر سکو گے صرف اشارے سے کر سکو گے البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کر سکو گے۔ سو اس دوران میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنا اور شام و صبح اپنے پروردگار کی تسبیح میں مشغول رہنا۔

(تدبر قرآن جلد اول صفحہ ۶۸۴، ۶۸۵)

یہ ہے مولانا اصلاحی کا مندرجہ بالا اقتباس ــــ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت زکریا نے کسی نشانی کی درخواست کی وہ اس وجہ سے کی کہ ممکن ہے کہ یہ بشارت من جانب اللہ نہ ہو، ممکن ہے کہ اپنے ہی گنبد دل کی صدائے بازگشت سنائی دی ہو، ممکن ہے کہ اس میں نفس کی مخفی آرزوؤں کا کوئی دخل ہو جن سے شیطان نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو لیکن معلوم ہے کہ وہ نبی ہیں۔ غیر نبی کو اس طرح کا اشتباہ اور التباس تو پیش آسکتا ہے لیکن کسی نبی کے لیے تو یہ بات ناممکن ہے۔ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اچھے حالات میں ہوتے ہیں ان کو اس طرح کے وساوس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مولانا اصلاحی کی بات صحیح ہوتی۔ اگر یہ

خیرنبی سے تعلق رکھتی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اناجیل بکثرت پڑھنے کے نتیجے میں یہ بات قلم سے نکلی ہے۔

سورۂ آل عمران ۳۹ میں حضرت یحییٰ کی بشارت دیتے ہوئے فرشتوں نے ان کی بعض صفات گنائیں اور آخر میں فرمایا کہ وہ نبی ہوں گے۔ خدا کے نیک بندوں میں سے ہوں گے۔ اس پر مولانا اصلاحی کی یہ تشریح پڑھیے :-

"چوتھی یہ کہ وہ نبی ہوں گے نبی کا مفہوم واضح ہے۔ البتہ اس کے ساتھ مِنَ الصّٰلِحِیْن کی جو وضاحت ہے اس سے مقصود ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ وہ باہمہ صفات و کمالات تھے۔ زمرۂ صالحین ہی میں سے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہو گیا ہو۔ درآں حالیکہ کمالات و فضائل کے علاوہ حضرت عیسٰی سے رشتہ داری کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور ان کی ولادت بھی حضرت عیسٰی کی ولادت سے بہت اشبہ ہے بلکہ انجیلوں سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہی نے حضرت عیسٰی کو بپتسمہ دیا اور حضرت عیسٰی نے ان کی بابت فرمایا کہ ماؤں نے جن کو جنا ان میں یوحنا سے بڑا کوئی نہیں۔ (تدبر قرآن جلد اول ص۶۹۴)

مولانا اصلاحی کی رائے میں من الصّٰلحین کی قید یہ بتلانے کے لیے لگا دی گئی ہے کہ حضرت یحییٰ خدا کے بندے ہی تھے ان کے اندر الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا تھا۔ نہ انھوں نے اپنی الوہیت کی دعوت دی اور نہ کسی شخص نے ان کو اللہ بنایا۔ جب کسی شخص نے انھیں الٰہ نہیں بنایا تو ان کی الوہیت کی تردید کرنے کے کیا معنے۔ اصل بات یہ نہیں ہے بلکہ معاملہ اسلوب کا ہے جس کی طرف مولانا کا ذہن نہیں گیا وہ اسلوب یہ ہے کہ جب کسی شخص کے کچھ نمایاں اوصاف بیان کر لینے کے بعد آخر میں من الصّٰلحین کا لفظ آتا ہے تو یہ بتانا ہوتا ہے کہ کہاں تک ان کے تمام صفات گنائے جائیں۔ دو چار صفات بیان کر کے ایک جامع لفظ الصالحین کا لفظ لگا دیا جاتا ہے جس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جامع الصفات بندہ تھا۔ یہی لفظ حضرت عیسٰیؑ کی صفات کے آخر میں آیا ہے۔ وہاں بھی مولانا نے یہی نکتہ تحریر فرمایا ہے تو مسیحؑ کے ذکر میں تو یہ نکتہ کچھ کام دے سکتا ہے لیکن یحییٰؑ کے بارے میں یہ نکتہ کام نہیں دے سکتا۔

سورۂ آل عمران آیت ۷۳ میں اَوْ یُحَاجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس کی تشریح

کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے کہ :-

"یہود اپنے آدمیوں کو بڑے شد و مد کے ساتھ یہ سبق پڑھاتے تھے کہ وہ کسی حال میں بھی کسی غیر اسرائیلی نبی کے دعوے کی صداقت تسلیم نہ کریں۔ یہ باطنی محرک ہے کہ ان کے دل میں یہ چور تھا کہ کہیں اس طرح کی دینی سیادت و پیشوائی نبی اسمٰعیل کو بھی حاصل نہ ہو جائے جس طرح کی سیادت اب تک صرف ان کو حاصل رہی ہے اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دل میں تھا کہ اگر ہماری طرف سے کوئی اعتراف اس دین اور اس نبی کے حق میں زبان سے نکل گیا تو مسلمان اس کو قیامت کے دن ہمارے خلاف حجت بنائیں گے کہ ہم نے حق واضح ہونے کے باوجود اس کی تکذیب کی۔ قرآن نے ان کے دل کے اس چور کو ایک دوسرے مقام میں بھی پکڑا ہے جہاں یہ واضح فرمایا ہے کہ یہود اپنے لوگوں کو اس بات کی سخت تاکید کرتے رہتے تھے کہ آخری نبی اور آخری دین کے باب میں تورات کے کسی اشارے کو مسلمانوں پر نہ کھولا جائے ورنہ وہ اس چیز کو قیامت کے روز ان کے خلاف دلیل بنائیں گے چنانچہ سورۂ بقرہ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝

(بقرۃ : ۷۶، ۷۷)

اور جب یہ مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تمہارے اوپر کھولی ہیں تاکہ مسلمان ان کی بنا پر تمہارے رب کے سامنے تمہیں قائل کریں، کیا تم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کی اس بات کو بھی جانتا ہے جو آپس میں رازدارانہ طور پر کہتے ہیں اور اس بات کو بھی جانتا ہے جو وہ مسلمانوں سے علانیہ کہتے ہیں

تدبر جلد اول ص۲۴۷

اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک لیحاجوکم بہ عند ربکم
میں جس محاجہ یعنی استدلال کا ذکر ہے اس کا تعلق آخرت سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پیرو یہود
تم مسلمانوں کو تورات کی پیشین گوئیاں نہ بتانا ورنہ یہ لوگ قیامت میں خدا کی عدالت میں تمہارے خلاف
حجت قائم کریں گے کہ اے خدا ان کی کتاب تورات میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی پیشین گوئیاں
موجود تھیں مگر یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب کے نزدیک
یہ بہت زیادہ اللہ سے ڈرنے والے اور روز جزا کی رسوائی سے بچنے والے لوگ تھے۔ یہ غلط فہمی عند
ربکم کی وجہ سے پیش آئی ہے جو اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہر جگہ روز قیامت ہی ہو۔
سورۂ بقرہ میں (اتخذتم عند اللہ عهدا) (کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی معاہدہ لے لیا ہے)
ظاہر ہے خدا سے اگر کوئی معاہدہ لیا گیا ہو تو اس کا ذکر تورات میں ہوگا ورنہ خدا سے کوئی عہد
لینے کی کوئی اور شکل ممکن نہیں ہے۔

صحیح ترجمہ صرف وہ ہے جو مولانا تھانوی نے بقرہ اور آل عمران دونوں جگہ اس ٹکڑے کا کیا ہے
ان کا ترجمہ یہ ہے:—

"تم یہ کیا غضب کرتے ہو کہ مسلمانوں کو خوشنا دیں وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو ان کے مفید
مذہب اللہ نے توریت میں تم پر منکشف کر دی ہیں گو ہم مصلحت پوشیدہ رکھتے ہیں نتیجہ
یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ دیکھو یہ مضمون اللہ کے پاس سے
تمہاری کتاب میں آیا ہے۔ کیا تم اتنی موٹی بات نہیں سمجھتے"

(بیان القرآن جلد اول صلا)

اور یہی مفہوم سورۂ آل عمران کی آیت زیر بحث کا بھی لیا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب کو سوچنا چاہیے
تھا کہ جب یہودی علماء کے منع کرنے کے باوجود ان کے پیرو قرآن اور نبی کی پیشین گوئیاں مسلمانوں کو بتا دیں
گے تو کیا مسلمان یوں ہی چپکے بیٹھے رہیں گے یا علمائے یہود کو زچ کریں گے کہ جب تمہاری کتاب میں اس کتاب
پر اور اس نبی پر ایمان لانے کا تم سے عہد لیا گیا ہے تو تم لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے ہو سب سے پہلے تو
مسلمان دنیا میں یہود پر حجت قائم کریں گے۔ پھر آخرت میں بھی ان کو رسوا کریں گے۔
غرض دونوں مقامات پر حجت قائم کرنے کا تعلق آخرت سے نہیں ہے۔

رسولؐ کا طریقِ انقلاب

(ترجمہ۔ خلیل حامدی)

قرآن کریم کا وہ حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے پورے تیرہ[13] سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نازل ہوتا رہا۔ اس پوری مدت میں قرآن مجید کا مدارِ بحث صرف ایک مسئلہ رہا۔ اور اس کی نوعیت میں
وئی تبدیلی نہ ہوئی۔ مگر اسے پیش کرنے کا انداز برابر بدلتا رہا۔ قرآن نے اسے پیش کرنے میں ہر مرتبہ
اسلوب اور نیا پیرایہ اختیار کیا اور ہر مرتبہ یوں محسوس ہوا کہ گویا اسے پہلی بار ہی چھیڑا گیا ہے۔

قرآن کریم پورے مکی دور میں اسی مسئلے کے حل میں لگا رہا۔ اس کی نگاہ میں یہ مسئلہ اس نئے دین کے
ام مسائل میں اولین اہمیت کا حامل تھا۔ عظیم تر مسئلہ تھا۔ اساسی اور اصولی مسئلہ تھا۔ عقیدہ کا مسئلہ تھا۔
سئلہ دو عظیم نظریوں پر مشتمل تھا۔ ایک اللہ تعالیٰ کی الوہیت' اور انسان کی عبودیت اور دوسرے ان
ے باہمی تعلق کی نوعیت۔ قرآن کریم اسی بنیادی مسئلہ کو لیکر انسان سے بحیثیت انسان خطاب کرتا
ا۔ کیونکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ اس سے تمام انسانوں کا یکساں تعلق ہے۔ وہ چاہے عرب کے رہنے والے
سان ہوں' یا غیر عرب' نزول قرآن کے زمانے کے لوگ یا کسی بعد کے زمانے کے لوگ۔ یہ وہ انسانی مسئلہ
جس میں کسی قسم کی ترمیم و تغیر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اس کائنات میں انسان کے وجود و بقا کا
ئلہ ہے۔ اسی مسئلہ کی بنیاد پر یہ طے ہو گا کہ انسان کا اس کائنات کے اندر کیا مقام ہے؟ اور اس
ئنات میں بسنے والی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اور خود کائنات اور موجودات کے
لق کے ساتھ اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ وہ پہلو ہے جس کی وجہ سے اس مسئلے میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی،
س لیے کہ یہ اس کائنات اور کائنات کے ایک حقیر "جز" انسان کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

بنیادی مسئلہ

مکی زندگی میں قرآن انسان کو یہ بتاتا رہا کہ اس کے اپنے وجود اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ انسان کو یہ بتاتا ہے کہ وہ کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ اور کس غرض کے لیے آیا ہے؟ اور آخر کار وہ کہاں جائے گا؟ وہ معدوم تھا اسے کس نے خلعت وجود بخشا؟ کون سی ہستی اس کا خاتمہ کرے گی؟ اور خاتمہ کے بعد اسے کس انجام سے دوچار ہونا ہوگا؟ وہ انسان کو یہ بھی بتاتا ہے کہ اس وجود کی حقیقت کیا ہے جسے وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے؟ اور وہ کون ہستی ہے جسے وہ پردۂ غیب میں کارفرما محسوس کرتا ہے لیکن دیکھ نہیں پاتا؟ اس طلسماتی کائنات کو کس نے وجود بخشا اور کون اس کا مدبر اور منتظم ہے؟ کون اسے گردش دے رہا ہے؟ کون اسے بار بار نیا پیراہن بخشتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ان تغیرات کا سررشتہ ہے جس کا ہر چشم بینا منہ دیکھ رہی ہے ـــ؟ وہ اسے یہ بھی سکھاتا ہے کہ خالق کائنات کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہونا چاہیے اور خود کائنات کے بارے میں اسے کیا روش اختیار کرنا چاہیے؟ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات کیسے ہونا چاہییں؟

یہ ہے وہ اصل اور بنیادی مسئلہ جس پر انسان کی بقا اور وجود کا دارومدار ہے اور رہتی دنیا تک اس عظیم مسئلہ پر انسان کی بقا اور وجود کا انحصار رہے گا۔ اس اہم مسئلہ کی تحقیق و توضیح میں مکی زندگی کا پورا ۱۳ سالہ دور صرف ہوا۔ اس لیے کہ انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ یہی ہے اور اس کے بعد جتنے مسائل ہیں وہ اسی کے تقاضے میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی حیثیت اس کی تفصیلات اور جزئیات سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن نے مکی دور میں اسی بنیادی مسئلے کو اپنی دعوت کا مدار بنائے رکھا اور اس سے صرف نظر کرکے نظام حیات سے متعلق فروعی اور ضمنی بحثوں سے تعرض نہیں کیا اور اس وقت تک انہیں نہیں چھیڑا جب تک علم الٰہی نے یہ فیصلہ نہیں فرما دیا کہ اب اس مسئلہ کی تحقیق و توضیح کا حق ادا ہوچکا ہے اور یہ اس انتخاب روزگار جماعت کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں ہوچکا ہے جسے قدرت الٰہی اقامت دین کا ذریعہ بنا کر اس کے ہاتھوں اس دین کو عملی شکل میں برپا کرنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

جو لوگ دین حق کی دعوت لیکر اٹھے ہیں اور دنیا کے اندر ایک ایسا نظام برپا کرنا چاہتے ہیں جو بالفعل اس دین کی نمائندگی کرے انہیں اس عظیم حقیقت پر پہروں غور کرنا چاہیے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے راسخ کرنے کے

لیے قرآن کریم نے مکی زندگی کے پورے تیرہ سال صرف کیے اور اس دوران میں کبھی اس سے توجہ ہٹا کر نظام زندگی کی دوسری تفصیلات کو نہیں چھیڑا نہ ان قوانین و احکام بیان کرنے کی حاجت محسوس کی جو آگے چل کر مسلم معاشرے میں نافذ ہونے والے تھے۔

کارِ رسالت کا آغاز

یہ عین حکمت خداوندی تھی کہ آغاز رسالت ہی میں اس اہم مسئلہ کو جو عقیدہ و ایمان کا مسئلہ ہے دعوت کا محور و مرکز بنایا جائے یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم راہ حق میں پہلا قدم ہی اس دعوت سے اٹھائیں۔

"لوگو! گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے"

اور پھر اسی دعوت پر اپنا تمام وقت صرف کر دیں، انسانوں کو ان کے حقیقی پروردگار سے آگاہ کریں اور انھیں اسی کی بندگی کی راہ پر لگائیں۔

اگر ظاہر بیں نگاہ اور محدود انسانی عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ عرب اس طریق دعوت سے بآسانی رام ہونے والے نہیں تھے۔ عرب اپنی زبان دانی کی بدولت "الٰہ" کا مفہوم اور لا الٰہ الا اللہ کا مدعا خوب سمجھتے تھے۔ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ الوہیت سے مراد حاکمیت اعلیٰ ہے۔ وہ اس امر سے بھی کماحقہ آگاہ تھے کہ الوہیت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کر دینے کے معنے یہ ہیں کہ اقتدار قوت کا پورا کا پورا کاہنوں، پروہتوں، قبائل کے سرداروں اور امراء و حکام کے ہاتھ سے چھین کر اللہ کی طرف لوٹا دیا جائے، ضمیر و قلب پر، مذہبی شعائر و مناسک پر، معاملات زندگی پر، مال و دولت اور عدل و قضا، الغرض ارواح و اجسام پر بہمہ وجوہ اللہ اور صرف اللہ کا اقتدار ہو۔ وہ خوب جانتے تھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا اعلان درحقیقت اس دنیاوی اقتدار کے خلاف ایک چیلنج ہے جس نے الوہیت کی سب سے بڑی خصوصیت و حاکمیت کو غصب کر رکھا ہے۔ یہ ان تمام قوانین و نظاموں کے خلاف اعلان بغاوت ہے جو اس قبضہ غاصبانہ کی بنیاد پر وضع کیے جاتے ہیں، اور تمام ان قوتوں کے خلاف اعلان بغاوت ہے جو غاصبانہ سازشوں کی بدولت دنیا میں کوس لمن الملک بجاتی ہیں۔ عرب اپنی زبان کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھے اور وہ لا الٰہ الا اللہ کے حقیقی مفہوم کو پوری طرح سمجھ رہے تھے۔ ان سے یہ امر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ ان کے خود ساختہ نظاموں اور ان کی

اور قبائلیت کے ساتھ یہ دعوت کیا سلوک کرنا چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس دعوت کا یا بالفاظ دیگر اس پیام انقلاب کا اس تشدد اور غیظ و غضب کے ساتھ استقبال کیا اور اس کے خلاف وہ معرکہ آرائی کی جس سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوت کا آغاز اس انداز سے کیوں ہوا؟ اور حکمت الٰہی نے کس بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ اس دعوت کا افتتاح ہی مصیبتوں اور آزمائشوں سے ہو؟

قومیت کا نعرہ کیوں نہیں؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب اللہ کی طرف سے دین حق کو لیکر مبعوث ہوئے تو اس وقت حالت یہ تھی کہ عربوں کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز اور مالدار علاقے عربوں کے ہاتھ میں نہیں تھے بلکہ دوسری اقوام ان پر قابض تھیں۔ شمال میں شام کے علاقے رومیوں کے زیر نگیں تھے جن پر عرب حکام رومیوں کے زیر سایہ حکومت چلا رہے تھے جنوب میں بے آب و گیاہ صحرا تھے جن میں اکا دکا نخلستان پائے جاتے تھے۔ یہ بات بھی محتاج دلیل نہیں ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں صادق اور امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ آغاز رسالت سے ۱۵ سال قبل اشراف قریش حجر اسود کے تنازعہ میں آپ کو اپنا حَکَم بنا چکے تھے اور آپ کے فیصلہ کو بخوشی مان چکے تھے۔ نسب کے لحاظ سے بھی آپ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے جو قریش کا معزز ترین خاندان تھا۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس بات پر پوری طرح قادر تھے کہ اپنے ہم وطنوں کے اندر عرب قومیت کے جذبے کو ابھارتے اور اس طرح ان قبائل عرب کو اپنے گرد جمع کر لیتے جنھیں باہمی جھگڑوں نے پارہ پارہ کر رکھا تھا اور کشت و خون اور انتقام کی چکی میں بری طرح پسے ہوئے تھے۔ حضورؐ اگر چاہتے تو ان سب عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے انھیں قومیت کا درس دیتے اور شمال کے رومی اور جنوب کے ایرانی استعمار کے تسلط سے عرب سرزمین کو آزاد کرانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ عرب کے تمام اطراف و اکناف کو ملا کر متحدہ عرب ریاست کی داغ بیل ڈال دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قوم پرستی کے نعرے کو لیکر اٹھتے تو عرب کا بچہ بچہ اس پر لبیک کہتا اور آپؐ کو وہ مصائب و آلام نہ سہنے پڑتے جو آپؐ کو تیرہ سال تک صرف اس بنا پر سہنے پڑے کہ آپ کی دعوت اور نظریہ جزیرۃ العرب کے فرماں رواؤں کی خواہشات سے متصادم تھا۔ مزید برآں

یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود تھی کہ جب عرب آپؐ کی قومی دعوت کو جوش و خروش کے ساتھ قبول کر چکتے، قیادت کا منصب آپ کو سونپ دیتے اور اقتدار کی ساری کنجیاں پوری طرح آپ کے قبضہ آجاتیں اور رفعت و عظمت کا تاج آپ کے مبارک سر پر رکھ دیا جاتا تو آپؐ اپنی اس بے پناہ طاقت اور اثر کو عقیدۂ توحید کا سکہ رواں کرنے کے لیے استعمال کرتے اور لوگوں کو اپنے انسانی اقتدار کے سامنے سرنگوں کرنے کے بعد بالآخر جا کر خدا کے آگے سرنگوں کر دیتے لیکن خدائے علیم و حکیم نے اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو اس راستے پر نہیں چلایا۔ بلکہ انہیں حکم دیا کہ صاف صاف اعلان کر دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور ساتھ ہی متنبہ کر دیا کہ اس اعلان کے بعد آپؐ خود اور وہ مٹھی بھر افراد جو اس اعلان پر لبیک کہیں ہر قسم کی تکلیف و اذیت برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہیں۔

آخر کٹھن راستہ اللہ تعالیٰ نے کیوں اختیار فرمایا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کے حق میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تشدد و ظلم کا نشانہ بنیں لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ اس دعوت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہے اور نہ یہ کوئی صحیح بات ہوتی کہ مخلوقِ خدا رومی یا ایرانی طاغوت کے پنجے سے نجات پا کر عربی طاغوت کے پنجے میں گرفتار ہو جائے۔ یہ ملک اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس پر اقتدار صرف اللہ ہی کا قائم ہونا چاہیے اور اللہ کا اقتدار صرف اس صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی فضاؤں میں صرف لا الٰہ الا اللہ کا پرچم لہرائے۔ یہ بات کیونکر مقبول اور درست ہو سکتی تھی کہ خدا کی زمین پر بسنے والی مخلوق رومی اور ایرانی طاغوتوں سے نجات پاتے ہی عربوں طاغوت کا طوقِ غلامی اپنے گلے میں ڈال لے۔

طاغوت جس قبا میں بھی ہو وہ طاغوت ہے۔ انسان صرف خدائے واحد کے بندے اور غلام ہیں۔ اور وہ صرف اس صورت میں بندے اور غلام رہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں صرف اللہ کی الوہیت کا بول بالا ہو۔ ایک عرب لا الٰہ الا اللہ کا لغوی لحاظ سے جو مفہوم سمجھتا تھا وہ یہ تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو۔ اللہ کے سوا کوئی ہستی قانون اور شریعت کا منبع و ماخذ نہ ہو اور انسان کا انسان پر غلبہ و اقتدار باقی نہ رہے۔ کیونکہ اقتدار بہمہ وجوہ اللہ ہی کے لیے ہے اور اسلام انسانوں کے لیے جس "قومیت" کا علمبردار ہے وہ اسی عقیدہ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ تمام اقوام خواہ وہ کسی رنگ و نسل کی ہوں، عربی ہوں یا رومی اور ایرانی، سب اس عقیدے کی نگاہ میں پرچمِ الٰہی کے تحت مساویانہ حیثیت

رکھتی ہیں۔ قرآن کے نزدیک اسلامی دعوت کا یہی صحیح اور فطری طریق کار ہے۔

اقتصادی انقلاب کیوں نہیں؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور عدل و انصاف کے صحت مندانہ نظام سے یکسر بیگانہ ہو چکا تھا۔ ایک قلیل گروہ تمام مال و دولت اور تجارت پر قابض تھا اور سودی کاروبار کے ذریعے اپنی تجارت اور سرمائے کو برابر بڑھاتا اور پھیلاتا جا رہا تھا اس کے مقابلہ میں ملک کی غالب اکثریت مفلوک الحال اور بھوک کا شکار تھی۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت تھی وہی عزت و شرافت کے اجارہ دار تھے۔ رہے بیچارے عوام تو وہ جس طرح مال و دولت سے تہی دامن تھے اسی طرح عزت و شرافت سے بے بہرہ تھے۔

اس صورت حال کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی اجتماعی تحریک کیوں نہ اٹھائی اور دعوت کا مقصد دولت کی منصفانہ تقسیم پھر اکر امراء و شرفاء کے خلاف طبقاتی جنگ نہ چھیڑ دی تاکہ سرمایہ داروں سے محنت کش عوام کو ان کا حق دلواتے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دور میں ایسی کوئی اجتماعی تحریک اور دعوت لیکر اٹھتے تو عرب معاشرہ لازماً دو طبقوں میں بٹ جاتا مگر غالب اکثریت آپ کی تحریک کا ساتھ دیتی اور سرمایہ و جاہ و ثروت کی ستم کیشیوں کے سامنے ڈٹ جاتی اور آپ کے مقابلے میں وہ معمولی سی اقلیت ہی رہ جاتی جو اپنے پشتینی مال و جاہ سے چمٹی رہتی۔ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ نہج اختیار فرماتے تو زیادہ موثر اور کارگر ہوتا اور یہ صورت پیش نہ آتی کہ پورا معاشرہ لا الٰہ الا اللہ کے اعلان کے خلاف صف آرا ہو جاتا اور صرف چند نادر روزگار ہستیاں ہی دعوت حق کے افق تک پہنچ سکتیں۔

کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم میں یہ صلاحیت بدرجۂ کمال موجود تھی کہ جب اکثریت آپ کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی زمام قیادت آپ کے ہاتھ میں دے دیتی اور آپ دولت مند اقلیت پر قابو پا کر اس کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکتے تو آپ اپنے اس منصب و اقتدار کو اور اپنی پوری قوت و طاقت کو اس عقیدہ توحید کے منوانے اور راسخ و قائم کرنے میں استعمال کر لیتے جس کے لیے دراصل اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تھا۔ آپ انسانوں کو پہلے انسانی اقتدار کے آگے جھکا کر پھر انھیں پروردگار حق کے آگے جھکا دیتے۔

لیکن خدائے علیم و حکیم نے آپ کو اس طریق کار پر بھی چلنے کی اجازت نہ دی۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ طریق کار دعوتِ اسلامی کے لیے موزوں و مناسب نہیں ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معاشرے کے اندر حقیقی اجتماعی انصاف کے سوتے صرف ایک ایسے ہمہ گیر نظریے کے چشمۂ صافی سے ہی پھوٹ سکتے ہیں جو معاملات کی زمام کار کلیۃً اللہ کے ہاتھ میں ہو اور معاشرہ ہر اس فیصلے کو برضا و رغبت قبول کرتا ہو جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی کفالت کے بارے میں بارگاہ الٰہی سے صادر ہوا اور معاشرے کے ہر فرد کے دل میں، پانے والے کے دل میں بھی اور دینے والے کے دل میں بھی یہ بات پوری طرح منقش ہو کر وہ جس نظام کو نافذ کر رہا ہے اس کا شارع اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اس نظام کی اطاعت سے اسے نہ صرف دنیا کے اندر فلاح کی امید ہے، بلکہ آخرت میں بھی وہ جزائے خیر پائے گا۔ معاشرے کی کیفیت نہ ہو کہ کچھ انسانوں کے دل حرص و آز کے جذبات سے امنڈ رہے ہوں اور کچھ دوسرے انسانوں کے دل حسد و کینہ کی آگ میں جل رہے ہوں۔ معاشرے کے تمام معاملات تلوار اور ڈنڈے کے زور پر طے کیے جا رہے ہوں تخویف اور دھونس اور تشدد کے بل پر فیصلے نافذ کیے جا رہے ہوں۔ انسانوں کے دل ویران اور ان کی روحیں دم توڑ رہی ہوں جیسا کہ آج ان نظاموں کے تحت ہو رہا ہے جو غیر اللہ کی الوہیت کے قائل ہیں۔

اصلاحِ اخلاق کی مہم کیوں نہیں ؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت جزیرۃ العرب کی اخلاقی سطح ہر پہلو سے انحطاط کے آخری کنارے تک پہنچی ہوئی تھی۔ صرف چند بدویانہ فضائل اخلاق خام حالت میں موجود تھے۔ ظلم اور جارحیت نے معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جاہلی دور کا نامور شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ اسی معاشرتی فساد کی طرف اپنے اس شعر میں حکیمانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے۔

"جو ہتھیار کی طاقت سے اپنا دفاع نہیں کرے گا، تباہ و برباد ہو گا۔ اور جو خود بڑھ کر لوگوں پر ظلم نہیں کرے گا تو وہ خود (بالآخر) ظلم کا شکار ہو جائے گا۔

اسی خرابی کی طرف جاہلی دور کا یہ مشہور و معروف مقولہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ: "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظلم کر رہا ہو یا اس پر ظلم ہو رہا ہو۔"[1]

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں بھی یہ ٹکڑا وارد ہوا ہے۔ مگر آپ نے اس میں واضح فرمایا ہے کہ ظالم کی مدد سے مراد اسے ظلم سے روکنا ہے۔ (مترجم)

شراب خوری اور جوا بازی معاشرتی زندگی کی روایت بن چکے تھے اور ان پر فخر کیا جاتا تھا۔ جاہلی دور کی تمام شاعری خمر اور قمار کے محور پر گھومتی ہے۔ طرفہ ابن العبد کہتا ہے :-

"اگر تین چیزیں جو ایک نوجوان کی زندگی کا لازمہ ہیں' نہ ہوتیں' تو مجھے کسی چیز کی پرواہ نہ رہتی بشرطیکہ مجھے تا سدِّ رمق غذا ملتی رہتی۔"

"ان میں سے ایک میرا اپنے رقیبوں سے مے نوشی میں سبقت لے جانا ہے اور مے بھی وہ دو آتشہ جس میں اگر پانی ملایا جائے تو اس پر کف آجائے۔"

"شراب نوشی' لذت پرستی اور بذل و اسراف پہلے بھی میری گھٹی میں پڑے ہوئے تھے اور آج بھی ہیں۔"

"آخر میں وہ دن آگیا کہ میرا پورا قبیلہ مجھ سے دور ہٹ گیا اور مجھے الگ تھلگ کر دیا گیا جیسے خارش زدہ اونٹ کو گلے سے الگ کر دیتے ہیں۔"

زناکاری مختلف شکلوں میں رائج تھی اور اس جاہلی معاشرے کی قابلِ فخر روایت بن چکی تھی۔ یہ ایک ایسا حمام ہے جس میں ہر دور کا جاہلی معاشرہ ننگا نظر آتا ہے خواہ وہ دورِ قدیم کا جاہلی معاشرہ ہو یا عہدِ حاضر کا (نام نہاد مہذب معاشرہ)

سوال کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ایک اصلاحی تنظیم کے قیام کا اعلان کر کے اس کے ذریعے اصلاحِ اخلاق' تزکیہ نفوس اور تطہیرِ معاشرے کا کام شروع کر دیتے۔ کیونکہ جس طرح ہر مصلحِ اخلاق کو اپنے ماحول کے اندر چند پاکیزہ اور سلیم الفطرت نفوس ملتے رہے ہیں۔ اسی طرح آپ کو بھی ایک ایسا پاک سرشت گروہ بالیقین دستیاب ہو جاتا جو اپنے ہم جنسوں کے اخلاقی انحطاط اور زوال پر دلی دکھ محسوس کرتا۔ یہ گروہ اپنی سلامتیٔ فطرت اور نفاستِ طبع کے پیشِ نظر آپ کی دعوتِ تطہیر و اصلاح پر لازماً لبیک کہتا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کام کا بیڑا اٹھاتے تو بڑی آسانی سے اچھے انسانوں کی ایک جماعت کی تنظیم میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ جماعت اپنی اخلاقی طہارت اور روحانی پاکیزگی کی وجہ سے دوسرے انسانوں سے بڑھ کر عقیدہ توحید کو قبول کرنے اور اس کی گراں بار ذمہ داریوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہوتے اور اس طرح آغازِ رسالت ہی کی یہ دعوت کہ الوہیت صرف خدا کے لیے مخصوص ہے' پہلے ہی مرحلہ میں تند و تیز مخالفت سے دوچار نہ ہوتی۔

لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ یہ راستہ بھی منزلِ مقصود کو نہیں جاتا۔ اسے معلوم تھا کہ اخلاق کی تعمیر صرف

عقیدہ ہی کی بنیاد پر ہوسکتی ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جو ایک طرف اخلاقی اقدار اور معیار رد و قبول فراہم کرے اور دوسری طرف اس "طاقت" (ENERGY) کا تعین بھی کرے جس سے یہ اقدار و معیار ماخوذ ہوں، اور انھیں سند کا درجہ حاصل ہو اور اس جزا و سزا کی نشان دہی بھی کرے جو ان اقدار و معیارات کی پابندی یا ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس "طاقت" کی طرف سے دی جائے گی۔ دلوں پر اس نوعیت کے عقیدے کی ترسیم اور بالاتر قوت کے تصور کے بغیر اقدار و معیارات خواہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں مسلسل تغیر کا نشانہ بنتے رہیں گے اور ان کی بنیاد پر جو بھی اخلاقی نظام قائم ہوگا وہ ڈانواڈول رہے گا اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہوگا، کوئی نگراں اور محتسب طاقت نہ ہوگی۔ کیونکہ دل جزا و سزا کے کسی لالچ یا خوف سے بالکل خالی ہوں گے۔

ہمہ گیر انقلاب

صبر آزما کوششوں سے جب عقیدۂ الوہیت دلوں میں راسخ ہوگیا اور اس طاقت کا تصور بھی دلوں میں اتر گیا جس سے اس عقیدہ کو سند حاصل ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جب انسانوں نے اپنے رب کو پہچان لیا اور صرف اسی کی بندگی کرنے لگے، جب انسان خواہشات نفس کی غلامی سے، اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی آقائی سے آزاد ہوگئے اور لا الٰہ الا اللہ کا نقش دلوں میں پوری طرح مرتسم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کے ماننے والوں کے ذریعے وہ سب کچھ فراہم کردیا جو وہ تصور کرسکتے تھے خدا کی زمین رومی و ایرانی سامراج سے پاک ہوگئی لیکن اس تطہیر کا مدعا یہ نہیں تھا کہ اب زمین پر عربوں کا سکہ رواں ہو بلکہ اس لیے کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ چنانچہ زمین خدا کے سب باغیوں سے، خواہ وہ رومی تھے یا ایرانی یا عربی پاک کردی گئی۔

نیا اسلامی معاشرہ اجتماعی ظلم اور لوٹ کھسوٹ سے بالکل پاک تھا۔ یہ اسلامی نظام تھا اور اس میں عدل الٰہی پوری طرح جلوہ گر تھا۔ یہاں صرف میزان الٰہی میں ہر خوب و زشت اور صحیح و غلط کو تولا جاتا تھا۔ اس عدل اجتماعی کی بنیاد توحید تھی اور اس کا اصطلاحی نام "اسلام" تھا۔ اس کے ساتھ کسی اور نام یا اصطلاح کو کبھی گوارا نہیں کیا گیا۔ اس پر صرف یہ عبارت کندہ تھی "لا الٰہ الا اللہ"

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

نفوس اور اخلاق بھی نکھار آگیا۔ قلوب و ارواح کا تزکیہ ہوگیا۔ اور یہ اصلاح اس انداز سے

ہوئی کہ چند مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ان حدود و تعزیرات کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئی جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا تھا۔ اس لیے کہ اب ضمیروں کے اندر پولیس کی چوکیاں قائم ہو گئیں۔ اب خدا کی خوشنودی کی طلب، اجر کی خواہش، خدا کے غضب اور عذاب کا خوف محتسب کا فرض انجام دے رہا تھا۔ الغرض انسانی نظام، انسانی اخلاق اور انسانی زندگی کمال کی بلندی تک پہنچ گئی جس تک نہ پہلے پہنچی تھی اور نہ صدرِ اوّل کے بعد آج تک پہنچ سکی ہے۔

یہ انقلابِ عظیم کیسے برپا ہوا

یہ انقلابِ عظیم اور کمالِ انسانیت صرف اسی بنا پر حاصل ہوا کہ جن لوگوں نے دینِ حق کو ایک ریاست، ایک نظام اور جامع قانون و شریعت کی شکل میں قائم کیا تھا۔ وہ خود پہلے اسے اپنے قلب و ضمیر اور اپنی زندگی میں قائم کر چکے تھے اسے عقیدہ اور فکر کے طور پر تسلیم کر چکے تھے۔ اپنے اخلاق کو اس سے آراستہ و پیراستہ کر چکے تھے۔ اپنی عبادات میں اسے سند دے چکے تھے اور اپنے معاملات میں اس کا سکہ رواں کر چکے تھے۔ اس دین کے قیام پر ان سے صرف ایک ہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وعدہ میں غلبہ و اقتدار عطا کر دینے کا کوئی جز شامل نہیں تھا حتیٰ کہ یہ جز بھی شامل نہ تھا کہ یہ دین انھیں کے ہاتھوں غالب ہوگا۔ ان سے جو کچھ کہا گیا وہ صرف اتنا تھا کہ اقامتِ دین کے عوض انھیں جنت ملے گی۔ جو صبر آزما جہاد ان لوگوں نے کیا۔ جو زہرہ گداز آزمائشیں ان لوگوں نے سہیں جس پامردی و استقامت کے ساتھ وہ راہِ دعوت پر رواں دواں رہے۔ اور پھر بالآخر جس طرح انھوں نے جاہلیت کے مقابلہ میں اس حقیقت کبریٰ کا ساتھ دیا جو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے اندر پنہاں ہے۔ اور جو ہر زمان و مکان کے فرمانرواؤں کو ناگوار رہی ہے ان سب خدمات کے عوض ان سے صرف ایک وعدہ کیا گیا جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یعنی فقط وعدۂ فردا

جب اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش کی بھٹی میں ڈالا اور وہ ثابت قدم رہے اور ہر نفسانی خواہش اور حظ سے دست بردار ہو گئے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ وہ اس دنیا کے اندر کسی طور جزا اور صلہ کے منتظر نہیں ہیں اور نہ انھیں اس کا انتظار ہے کہ یہ دعوت لازماً ان ہی کے ہاتھوں غلبہ حاصل کرے اور یہ دین ان ہی کی قربانیوں اور کوششوں سے بالا و برتر ہو۔ ان کے دلوں میں نہ آباء و اجداد کا تفاخر باقی رہا، نہ قومی گھمنڈ کے جراثیم، نہ وطن و ملک کی بڑائی کا جذبہ رہا اور نہ قبائلی اور نسبی عصبیتوں کی خو بو رہی۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انھیں ان خوبیوں سے آراستہ دیکھا تب جا کر ان کے حق میں یہ فیصلہ دیا کہ یہ لوگ

اب "امانت عظمیٰ" یعنی خلافت ارضی" کے بار کو اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اس عقیدے کے حامل ہیں جس کا تقاضا ہے کہ ہر طرح کی حاکمیت صرف خدائے واحد کے لیے مخصوص ہو۔ دل ضمیر پر اخلاق و عبادات پر، جان و مال پر اور حالات وظروف پر صرف اسی کی حاکمیت ہو۔ خدا کو معلوم تھا کہ یہ اس سیاسی اقتدار کے سچے محافظ ثابت ہوں گے۔ جو ان کے ہاتھوں میں اس غرض کے لیے دیا جائے گا تاکہ شریعت الٰہی کو نافذ کریں اور عدل الٰہی کو قائم کریں۔ مگر اس اقتدار میں سے ان کی اپنی ذات کے لیے یا اپنے قبیلے اور برادری کے لیے یا اپنی قوم کے لیے کوئی حصہ نہ ہو، بلکہ وہ ہمہ اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہوا اور اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی خدمت کے لیے ہو کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقتدار کا منبع صرف اللہ ہے اور اسی نے ان کی تحویل میں دیا ہے۔

اگر دعوت اسلامی کا قافلہ اس انداز سے روانہ سفر نہ ہوتا اور دوسرے تمام جھنڈوں کو پھینک کر صرف اسی جھنڈے یعنی "لا الٰہ الا اللہ" کے پرچم توحید کو بلند نہ کرتا اور اس راہ کو اختیار نہ کرتا جو ظاہر میں دشوار گذار اور جان گسل راہ تھی مگر حقیقت میں آسان اور پربرکت بدامان تھی تو اس مبارک اور پاکیزہ نظام کا کوئی جز بھی اتنے بلند معیار کے ساتھ ہرگز بروئے عمل نہ آسکتا تھا اسی طرح اگر یہ دعوت اپنے ابتدائی مراحل میں قومی نعرہ بنکر سامنے آتی یا اقتصادی تحریک کے لبادہ میں ظاہر ہوتی یا اخلاقی مہم کا قالب اختیار کرتی یا لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے شعار اور نعرے بھی شمار کر لیتی تو یہ مبارک و پاکیزہ نظام جو اس دعوت کے نتیجہ میں قائم ہوا کبھی خالص ربانی نظام بنکر جلوہ گر نہ ہو سکتا۔

شعب ابی طالب

جب قریش کو معلوم ہوا کہ نجاشی بادشاہ حبشہ مہاجر مسلمانوں کے ساتھ الطاف واکرام سے پیش آیا ہے تو انھیں بہت گراں گذرا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ پر سخت ناراض ہوئے۔ یہاں تک کہ آپؐ کے قتل کرنے پر اتفاق کیا۔ بنو ہاشم کے خلاف یہ عہد نامہ لکھا کہ نہ تو ان سے شادی بیاہ اور خرید و فروخت کریں گے اور نہ ان سے میل جول رکھیں گے۔ یہ تحریر منصور بن عکرمہ عبدری نے لکھ کر کعبہ میں لٹکا دی اس شقی کا ہاتھ شل ہو گیا۔

محرم ۷ نبوی کی چاند رات کو شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کا محاصرہ کر لیا گیا۔ بنو عبدالمطلب بھی دہیں بھاگ آئے سوائے ابولہب ان میں سے نکل کر قریش سے جا ملا۔ ان لوگوں کا غلہ اور ضروری اشیاء بند کر دی

گئیں۔ موسم حج کے سوا وہ باہر نہ نکلتے تھے۔ ان پر سخت مصیبت آگئی۔ شعب سے بچوں کے رونے کی آوازیں آتیں تو بعض قریش خوش ہوتے اور بعض کو ناگوار ہوتا۔ آپؐ نے فرمایا:۔

"منصور بن عکرمہ پر جو مصیبت آئی اسے دیکھو۔" تین سال تک جو لوگ شعب ابی طالب میں محصور رہے۔ آخر اللہ نے اپنے رسولؐ کو خبر دی کہ دیمک نے اس عہد نامے کے ظلم و جور والے مضمون کو کھا لیا جو اللہ کا ذکر تھا وہ رہ گیا۔ آپ نے ابوطالب کو بتایا۔ انھوں نے اپنے بھائیوں سے بیان کیا۔ سب لوگ مسجد حرام میں آگئے۔ قریش کو اطلاع دی، عہد نامہ منگایا۔ کھولا تو اس کی وہی حالت تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھی۔ دیکھ کر سب حیران و سرنگوں رہ گئے۔ آخر قریش کے کچھ لوگ باہم ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ چند لوگ ہتھیار پہنکر بنو ہاشم کے پاس گئے اور کہا کہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو جاؤ۔ انھوں نے ایسا ہی کیا دشمنوں نے دیکھا تو حیران رہ گئے اور کہنے لگے "کہ وہ ہرگز ان لوگوں کو بے یار و مددگار نہ کر سکیں گے۔"

ہفتہ وار قومی آواز لکھنؤ

رسولِ خدا کے اخلاقِ عالیہ کی ایک مثال

بخاری مسلم اور مسند احمد کی روایت ہے کہ یمامہ کے سردار ثمامہ بن اثال جب گرفتار ہو کر آئے تو حضورؐ نے ان سے پوچھا ثمامہ تمہارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا۔ اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو ایسے شخص کو قتل کریں گے جس کا خون کچھ قیمت رکھتا ہے۔ اگر مجھ پر احسان کریں گے تو ایسے شخص پر کریں گے جو احسان ماننے والا ہے۔ اور اگر آپ مال لینا چاہتے ہیں تو مانگیے، آپ کو دیا جائے گا۔ تین دن تک آپ ان سے یہی بات پوچھتے رہے اور وہ یہی جواب دیتے رہے۔ آخر کو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو۔ رہائی پاتے ہی وہ قریب کے ایک نخلستان میں گئے، نہا دھو کر واپس آئے، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوئے اور عرض کیا کہ "آج سے پہلے کوئی شخص میرے لیے آپ سے اور کوئی دین آپ کے دین سے بڑھ کر مبغوض نہ تھا مگر اب کوئی شخص اور کوئی دین مجھے آپ سے اور آپ کے دین سے بڑھ کر محبوب نہیں ہے۔" اور پھر وہ عمرہ کے لیے مکہ گئے اور وہاں قریش کے لوگوں کو نوٹس دے دیا کہ آج کے بعد کوئی غلہ تمہیں ثمامہ سے نہ پہنچے گا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مکہ والوں کو حضورؐ سے التجا کرنی پڑی کہ ثمامہ سے ہمارے غلہ کی رسد بند نہ کرائیں

عالمی سطح پر فکری تبدیلیاں

(۲)

(جناب نعام الرحمٰن خاں بھوپال)

عیسائی متکلمین نے اپنے مذہبی عقائد کی عمارت اپنی بائبل اور یونانی فلسفہ کے ملے جلے تصور کائنات وانسان پر تعمیر کر رکھی تھی اور ان کا خیال یہ تھا کہ ان بنیادوں کو ذرا سی ٹھیس لگی کہ پوری عمارت ڈھیر ہوئی۔ اس لیے وہ کسی ایسی تنقید وتحقیق کو برداشت نہیں کر سکتے تھے جس کی وجہ سے اہل کلیسا کو اپنے علم کلام پر نظر ثانی کرنی پڑ جائے۔ اس طرح کی ہر چیز کو وہ مذہب کے لیے براہ راست خطرہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف جو لوگ احیائے علوم کا کام کر رہے تھے۔ انھیں ہر ہر قدم پر اس فلسفہ کی کمزوریاں معلوم ہو رہی تھیں جن پر عقائد وکلام کا یہ پورا نظام قائم تھا مگر وہ جوں جوں آگے بڑھتے تھے اہل کلیسا اپنی طاقت کے بل پر ان کی راہ روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ آنکھوں کو پچھلے زمانہ کی پائی ہوئی حقیقتوں کے خلاف بہت سی چیزیں روز روشن میں نظر آ رہی تھیں۔ مگر اہل کلیسا کو اصرار تھا کہ ان مسلمات پر نظر ثانی کے بجائے دیکھنے والی آنکھیں پھوڑ دی جائیں۔ دماغوں کو بہت سے ان نظریات میں جھول محسوس ہو رہا تھا جن کو پہلے بعض عقائد کی اٹل دلیل سمجھا گیا تھا۔ مگر اہل کلیسا کہتے تھے کہ ان دلائل پر غور کرنے کے بجائے ان دماغوں کو پاش پاش کر دینا چاہیے جو ایسی باتیں سوچتے ہیں۔

جیسا کہ ابھی اشارہ ہوا اس کش مکش کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علمی بیداری میں اول روز ہی سے مذہب اور اہل مذہب کے خلاف ایک ضد سی پیدا ہو گئی اور یہ ضد مسیحیت ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ نفس مذہب اس کا نشانہ بن گیا۔ علوم جدیدہ کے علمبرداروں نے یہ سمجھ لیا کہ مذہب بجائے خود ایک ڈھونگ ہے اس کے عقائد دلیل پر قائم نہیں ہیں۔ اس لیے علم کی روشنی سے وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی پول نہ کھل جائے

ہے یہ کہ ان علوم سے پیدا ہونے والی تہذیب کی رگ رگ میں خدا بیزاری اور لامذہبیت کی ذہنیت
پیدا ہو گئی۔ علوم و فنون اور ادب کا جو کچھ بھی ارتقا ہوا اس کی جڑیں وہ خدا بیزاری موجود رہی جو علمی بیداری
کے شروع میں مذہب کے خلاف پیدا ہو چکی تھی۔ سوچنے کا انداز یہ ہو گیا کہ مذہب جو چیز بھی پیش کرے وہ شک
کے لائق ہے۔ اور ہر وہ چیز جو دنیوی علوم کے استادوں کی طرف سے آئے وہ مان لینے کی مستحق ہے۔ اس
طرح وہ تمام اجتماعی فلسفے اور اجتماعی نظام جو اس طرز فکر کی بنیاد پر وجود میں آئے وہ خدا کے تخیل سے
خالی اور آخرت کے تصور سے عاری ہے اور اسی چیز نے ان کے فلسفہ زندگی کو ظاہر پرست بنا دیا۔
انھوں نے سمجھا کہ انسان ایک طرح کا حیوان ہے وہ نہ کسی کا تابع ہے اور نہ اس کو کہیں اوپر سے ہدایت
ملتی ہے۔ اسے اگر ہدایت مل سکتی ہے تو قوانین طبعی سے یا حیوانی زندگی کی معلومات یا انسانی زندگی کے
تجربات سے۔ انھوں نے سمجھا کہ انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اپنی طبیعت کے تقاضوں
کو زیادہ سے زیادہ آزادی سے پورا کرے۔ ان کی ظاہر بیں نگاہ نے انہیں بتایا اور ان کے مادہ پرست
ذہن نے یہ رائے قائم کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے انہی چیزوں کی ہے جن کو ناپا یا تولا جا سکے اور جو چیزیں
ہمارے پانچوں حواس میں سے کسی کی گرفت میں نہ آئیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں منفی ہیں یا عقل کی خود ناشناسی کا نتیجہ جن سے انسانی ذہن اتنا ہی
مطمئن ہو سکتا ہے جتنا ریت میں منہ چھپا لینے سے شتر مرغ مطمئن ہوتا ہوگا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ
روٹی اور کپڑے کے ساتھ بلکہ کبھی اس سے بھی پہلے کائنات کے معمہ کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس سلسلہ
میں یہ ابتدائی سوالات اس کے سامنے آتے ہیں کہ یہ کائنات جس میں وہ رہتا ہے خود بخود پیدا ہو گئی
ہے یا اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔ اگر ہے تو وہ کون ہے اور کیسا ہے۔ کائنات کی یہ مشین خود بخود
چل رہی ہے یا اسے کوئی چلا رہا ہے۔ انسان کی حیثیت اس کائنات میں کیا ہے۔ اس کا آغاز کیسے
ہوا اور انجام کیا ہونا ہے۔ یہ آزاد ہے یا کسی کے سامنے جواب دہ۔ وغیرہ ـــ یہ اور ایسے ہی دوسرے
سوالات فلسفی اور مفکر ہی کے سامنے نہیں آتے بلکہ عام آدمی بھی یہ بات سوچتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے
کہ انسانوں کی بڑی اکثریت کا ذہن ان جوابات کو قبول کر لیتا ہے جو روایتی طور پر ان کے حلقے میں
چلے آرہے ہوتے ہیں۔ اور اپنے طور پر وہ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔
پھر ایک بات اور بھی ہے۔ انسان کے ایک معاشرتی وجود ہونے کی وجہ سے وہ ایک نظام زندگی

کا محتاج ہے اور انسانی زندگی کا کوئی نظام بن نہیں سکتا جب تک کہ ان ابتدائی اور بنیادی سوالات کا کوئی ایک جواب نہ دے دیا جائے۔ وہ صحیح ہو یا غلط، مگر ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب دیے بغیر انسانی قافلہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔

یہ امورِ غیب چونکہ حواس کی گرفت میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان کے کسی بھی جواب کا ایسا ثبوت ممکن بھی نہیں جس کا انکار ممکن نہ رہے۔ اور مغرب کا علوم جدیدہ سے بنا ہوا ذہن اپنی فطرت کے تقاضے سے مجبور ہو کر یا روایتی طور پر چاہے انفرادی حیثیت سے خدا و مذہب کو مانتا ہو لیکن اجتماعی معاملات میں وہ مذہب سے آزاد ہو گیا۔ وہ ان بنیادی امور میں جنھیں جاننے کا کوئی ذریعہ انسان کے پاس نہیں ہے ہدایت الٰہی سے بے نیاز رہا۔ وہ ان حقیقتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا جو ناپی اور تولی نہ جا سکیں۔ ان میں جو سمجھ دار اور خود شناس تھے وہ لاادریت کے مقام پر رہے۔ مگر دنیائے علم کے بعض نو دولتوں نے تو آگے بڑھ کر امورِ غیب کے بارے میں "عدمِ ثبوت" کو "ثبوتِ عدم" سمجھ لیا۔ بہرحال وہ اپنی اس کیفیت کی وجہ سے مجبور تھے کہ اندھیرے میں تیر چلائیں اور جس طرف سے کوئی آواز "کھٹ" جیسی سنائی دے اسے حقیقت سمجھ بیٹھیں۔

اس صورتِ حال کے دو نتیجے سامنے آئے۔ کلیسائی نظام جیسا بھی کچھ تھا، اور اس نے اپنے ماننے والوں کو ظلم کی چکی میں کتنا ہی پیسا ہو، مگر اس کا یہ فائدہ ضرور تھا کہ عیسائی دنیا کو ایک رشتہ میں پروئے ہوئے تھا۔ جب یہ رشتہ ٹوٹا تو سارے دانے بکھر گئے اور چونکہ اجتماعی زندگی کی خود اپنی ضرورت ہے کہ کوئی اجتماعی مرکز ہو جس سے تمام افراد جڑے رہیں اور ان کے جذباتِ محبت و وفاداری بھی اسی سے وابستہ ہوں۔ اس لیے اجتماع کے نئے مرکز قومیت و وطنیت کے نام سے وجود میں آئے اور انسان کے وہ سب جذبات و احساسات جو مذہب کی دنیا میں خدا سے وابستہ تھے اس سیکولر ذہن نے قوم و وطن سے جوڑ دیے۔ اس جوڑ توڑ نے بہت سی چیزیں بدل دیں۔ اپنائیت اور غیریت کے پیمانے بدل گئے۔ پہلے فرانس کا عیسائی جرمنی کے عیسائی کا بھائی تھا اور فرانس کے غیر عیسائی کا غیر۔ اب وہ فرانس کے غیر عیسائی کا بھائی ہو گیا اور جرمنی کے غیر عیسائی کا غیر۔ پہلے وہ خدا کے لیے مرنے پر فخر کرتا تھا۔ اب وطن کے نام پر جان دینے لگا۔ پہلے خوب وہ تھا جو خدا کو پسند ہو، اب خوب وہ ہو گیا جس سے وطن سربلند ہو۔ پہلے محبت و وفاداری کا مستحق خدا تھا اب وطن بن گیا۔ اس طرح عمل کی دنیا میں ان تازہ خداؤں کا پیرہن مذہب کا کفن ثابت ہوا۔ اور اقوام میں نظریٔ خدا

ہٹ گئی اس سے۔"

دوسرا نتیجہ یہ کہ مغرب کی یہ جدید سیکولر تہذیب بغیر کسی مثبت نظریاتی بنیاد کے ادھر میں چلی تھی اس لیے کچھ نظریات اور فلسفوں سے بنی ہوئی بیساکھیاں اس تہذیب میں نیچے سے فٹ کر دی گئیں حالانکہ یہ مادہ پرست سیکولر ذہن کسی ایسی حقیقت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا جو حواس خمسہ کی پکڑ میں نہ آتی ہو۔ لیکن اس نے ان خیالی فلسفوں کو حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا جن کے حق میں عقلی ثبوت اتنا بھی نہیں جتنا مذہبی عقائد کے حق میں ہے۔

شاید ایسے ہی حالات کا تقاضا تھا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں تین فلسفیانہ نظریے ایسے اٹھے جو تفصیلات سے قطع نظر اپنی روح کے اعتبار سے پوری دنیا پر چھا گئے۔

ان نظریات پر تفصیلی گفتگو سے بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ ان میں ایک نظریہ وہ ہے جسے ہیگل نے پیش کیا اور جسے وہ (DIALECTIC PROCESS) کہتا ہے۔ جس کی رو سے افکار و تخیلات کی دنیا میں مسلسل کش مکش ہو رہی ہے۔ اس کش مکش کے نتیجے میں ایک تہذیب وجود میں آتی ہے۔ یہ دور تہذیب جب پختہ ہو جاتا ہے تو اس کی کمزوریاں واضح ہونا شروع ہوتی ہیں اور اس کے مقابلے میں کچھ دوسرے تخیلات ابھرنا شروع ہوتے ہیں اور اس سے جنگ کرتے ہیں۔ اس تنازع و کش مکش سے ایک نیا دور تہذیب جنم پاتا ہے جو گذشتہ دور تہذیب کی کچھ خوبیاں باقی رکھتے ہوئے کچھ نئی خوبیاں اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ اس کے بعد یہ دور تہذیب بھی پرانا ہو کر اپنے پیٹ سے پیدا ہونے والے دعوے کے مقابلہ میں جواب دعوے بن جاتا ہے اور اپنے اندر سے پیدا ہونے والے دعوے سے اسی طرح کش مکش کرتا ہے جس طرح جب یہ دعوے تھا تو اس کی کش مکش اپنے سے پہلے کے دور سے ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور افکار و تصورات کی تنازع و کش مکش کے بطن سے ایک کے بعد دوسرا دور تہذیب وجود میں آتا رہتا ہے اور اس طرح انسانی تہذیب برابر ترقی کر رہی ہے۔ اس کے نزدیک اس طرح انسانی تمدن و تہذیب کے ارتقاء میں روح مطلق یا جان جہاں یعنی ذات خداوندی خود ترقی کر رہی ہے اور اپنی ذات کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔ اس عمل ارتقا کو ہیگل اپنی اصطلاح میں جدلی عمل (DIALECTIC PROCESS) کہتا ہے اس کے نزدیک عرصہ حیات یا میدان دہر میں گویا ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہو رہا ہے پہلے ایک دعوے (THESIS) سامنے آتا ہے پھر اس کے مقابلہ میں جواب دعویٰ

(ANTITHESIS) پیش ہوتا ہے پھر ایک طویل جھگڑے کے بعد عقل کل یا روح کل ان کے درمیان صلح کراتی ہے۔ یعنی کچھ باتیں اس کی اور کچھ اس کی قبول کرکے ایک مرکب (SYNTHESIS) بنا دیتی ہے آگے چل کر یہ مرکب خود ایک دعوے بن جاتا ہے۔ پھر اس کا جواب دعوے مقابلے میں آتا ہے اور پھر ان کے درمیان لڑائی کے بعد صلح ہوتی ہے اور ایک نیا مرکب بنتا ہے۔

دوسرا نظریہ وہ ہے جو ڈارون کا نظریہ ارتقا کہلاتا ہے جو تنازع للبقا اور انتخاب طبیعی اور قانون بقائے اصلح نامی تصورات کے ساتھ نہ صرف مغربی دنیا کے ذہنوں پر چھا گیا بلکہ مغربی تہذیب جو بغیر پیروں کے چل رہی تھی اس کے نیچے پائے چوبیں کی طرح فٹ ہو گیا۔

یہاں اس کے حیاتیاتی پہلو پر گفتگو کا موقع نہیں۔ اس کا مختصر خلاصہ یا اس سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قائم کیا گیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جس میں ہر آن ہر طرف زندگی اور بقا کے لیے ایک ابدی جنگ برپا ہے۔ اسی کا نام تنازع للبقا ہے۔ نظام فطرت ہے ہی کچھ ایسا کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو وہ نزاع اور کش مکش کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ اس نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے اسے فنا ہی ہونا چاہیے اور جو باقی رہتا ہے وہ اس لیے باقی رہتا ہے کہ وہ طاقتور ہے اور اسے باقی رہنا چاہیے۔ یہی بقا اس کے اصلح ہونے کی دلیل ہے اور یہی عمل قانون بقائے اصلح ہے۔

اس تصور کو جب حیاتیات کے دائرے سے نکال کر انسانی اجتماعیات میں داخل کر دیا جائے اور یہ تصور دماغوں میں بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ اس فلسفہ زندگی میں عدل و انصاف، امانت و دیانت اور صدق و راستبازی کی کیا ضرورت رہے گی۔ اس میں حق کا وہ مفہوم کہاں باقی رہتا ہے جو کبھی کمزور کو بھی پہنچ سکتا ہو۔ اور ظلم کے وہ معنے کیسے ہو سکتے ہیں جن سے کبھی طاقتور بھی قصوروار بن سکتا ہو۔ دنیا میں ظلم پہلے بھی ہوتا تھا مگر پہلے وہ ظلم تھا اور اب اسے ایک ایسی منطق مل گئی جس سے وہ طاقتور کا حق بن گیا۔ اس فلسفے کے بعد یورپ والوں کو اپنے تمام مظالم کے لیے ایک دلیل ہاتھ آ گئی۔ انھوں نے اگر امریکہ اور آسٹریلیا اور افریقہ کی پرانی نسلوں کو مٹایا اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنایا تو یہ گویا ان کا حق تھا جو انھوں نے قانون فطرت کے مطابق حاصل کیا اور مٹنے والے اس کے مستحق تھے کہ انھیں مٹا دیا جائے۔ اس بارے میں اگر اہل مغرب کے ضمیر میں پہلے کوئی خلش ہو گی بھی تو اس منطق نے اسے دور کر دیا۔ حیاتیات میں اس نظریہ کی حیثیت جو کچھ بھی ہو، مگر معاشرت و سیاست میں آ کر تو اس نے انسان کو انسان کے لیے بھیڑیا بنا دیا۔

مغربی تہذیب کا آخری بچہ مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے بطن سے نکلا۔ جو فتنہ انگیزی اور شرباری میں پہلے دونوں بزرجمہروں سے بھی بازی لے گیا۔

اپنے موضوع کے اندر رہتے ہوئے یہاں اس نظریہ کا اتنا مختصر تعارف کافی ہوگا کہ انسانی ذہن کو اس نے بھی حیات دنیا کا وہی تصور دیا جو پہلے ہیگل نے پھر ڈاروِن نے دیا تھا۔ ہیگل نے فکر کی دنیا کو رزم گاہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ڈاروِن نے کائنات اور نظام فطرت کو میدان جنگ بنا کر دکھایا اور مارکس نے خود انسانی معاشرے کی وہی تصویر بنا کر دکھا دی۔ اس تصویر میں انسان شروع سے لڑتا جھگڑتا نظر آتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لیے اپنے ہم جنسوں سے لڑے مادی اور معاشی اغراض نے اسے مختلف طبقوں میں تقسیم کیا ہے سراسر خود غرضی کی بنا پر ان طبقوں میں کش مکش و نزاع برپا رہی ہے۔ اور انسانی تاریخ کا سارا ارتقاء اسی خود غرضانہ طبقاتی کش مکش کی بدولت ہوا ہے۔ قوموں اور قوموں کی لڑائی تو درکنار خود ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کی لڑائی بھی اس تصویر میں سراسر بہ تقاضائے فطرت نظر آتی ہے اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ اغراض و مفاد کے اشتراک کا رشتہ ہے۔ ان رشتہ داروں سے ملنا اور متفق ہو کر ان سب لوگوں سے لڑنا جن سے آدمی کی معاشی اغراض متصادم ہوں ـــ خواہ وہ اپنے ہی ہم قوم اور ہم مذہب کیوں نہ ہوں ـــ سراسر حق ہے اور اس حرکت کا ارتکاب نہیں بلکہ اس سے اجتناب خلاف فطرت ہے۔

ان تصورات نے جس دنیا کو جنم دیا اس میں ان مکارم اخلاق کی امید رکھنا ہی فضول ہے جو مذہب خدا پرستی کی دین ہیں بے دینی کی اس سیکولر فضا میں جس فلسفہ اخلاق کو فروغ حاصل ہو سکتا تھا وہ خالص افادیت کا فلسفہ تھا جس کے ساتھ لذتیت کے ایک مادہ پرستانہ تصور کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس اخلاق میں خیر و شر کا کوئی مستقل معیار نہیں ہے۔ ہر چیز اضافی ہے۔ ذاتی یا قومی منفعت کے لیے ہر اصول توڑا اور بنایا جا سکتا ہے۔ آج جو کچھ اچھا ہے وہ کل برا ہو سکتا ہے۔ اور آج جو برا ہے وہ کل اچھا بن سکتا ہے ایک کے لیے حق و باطل کا معیار ایک ہے اور دوسرے کے لیے دوسرا۔ جو لوگ ہیگل اور مارکس کے نظریات سے متاثر ہوتے ہیں ان کے دماغ میں دو باتیں گہرائی کے ساتھ بیٹھ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر دور کی پوری تہذیب ایک وحدت ہوتی ہے جس میں کی ہر چیز اپنے دور کے اجتماعی مزاج کی گویا ترجمان ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جب ایک تہذیب خوب پک چکتی ہے تو خود بخود تاریخی اسباب سے اس تحریک کے اندر سے

رجحانات کا ایک نیا مجموعہ نمودار ہوتا ہے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری جو نئی تہذیبیں وجود میں آتی ہیں ان میں سے ہر بعد کی تہذیب پرانی تہذیبوں سے بہتر ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ پرانی تہذیبوں کے بہترین اجزا کے ساتھ نئے افکار و نظریات کے قیمتی اجزا بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ذہن میں یہ دو خیال جم گئے ہوں وہ درحقیقت کسی ایسی تعلیم پر ایمان رکھ ہی نہیں سکتے جو اب سے صدیوں پہلے (ان کے عقیدہ کے مطابق ایک گذرے ہوئے تہذیبی دور میں) دی گئی ہوں۔ ان کے سامنے جب ابراہیمؑ موسےؑ اور محمد علیہم السلام کے نام لیے جائیں گے تو یہی جواب دیں گے کہ یہ سب لوگ اپنے اپنے دور کی پیداوار تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے عہد کی تہذیب کے مقابلہ میں ایک جواب دعوے (ANTISYNTHESIS) پیش کیا تھا جو ایک کش مکش کے بعد ایک مرکب تہذیب کا جز بن گیا۔ اس کے بعد و کتنے ہی جواب دعوے پیش ہو چکے ہیں اور کتنے ہی مرکب بن چکے ہیں۔ یہاں تک کہ انسانی تہذیب ترقی کرتے کرتے ہمارے اس دور تک پہنچی ہے۔ ہم ان لوگوں کی قدر اس لحاظ سے ضرور کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے اپنے عہد میں انسانی تہذیب کو آگے بڑھانے کے لیے کام کیا۔ مگر اب کسی پرانے جواب دعوے کو پھر سے سامنے لانے کا کون سا موقع ہے۔

یہاں اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ انسان کی فطرت خیر پسند واقع ہوئی ہے وہ کسی شر کو شر ہی کی شکل میں قبول نہیں کرتا۔ اس لیے باطل کو کچھ نہ کچھ صداقت اپنے اندر شامل کرنا ہی پڑتی ہے۔ لیکن یہ عمل اس وقت ہوتا ہے جب باطل کو قبول عام حاصل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ابتدا تو یوں ہوتی ہے کہ انسان کی خیر پسند طبیعت کسی صداقت کا مثبت طور پر اثر قبول کر کے اور کسی ظلم سے منفی طور پر متاثر ہو کر کسی ایک سچائی پر نظریں جما لیتی ہے۔ اس کے بعد ہدایت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اپنی کوتاہ نگاہی کے سبب اسی ایک سچائی کے محور پر پوری انسانیت اور اس کے معاملات کو گھما دیا جاتا ہے اس طرح وہ صداقت جو اگر اپنے حدود میں رہے تو صداقت ہی رہے گی۔ مگر حدود سے تجاوز کے بعد وہ باطل بن جاتی ہے۔ یہی کچھ اہل مغرب کے ساتھ ہوا۔ جن نظریات کا ابھی ذکر ہوا ان سب میں صداقت کے کچھ اجزا ضرور تھے۔ مگر مغرب کے انتہا پسند ذہن نے ان اجزائے صداقت کو کل صداقت سمجھ لیا۔ اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچی ہوتی تو وہ تنازع للبقا اور انتخاب طبیعی میں سے قانون بقائے اصلح کے بجائے قانون بقائے انفع اخذ کرتے اور اس طرح طاقت کی دوڑ

کے بجائے نفع رسانی کی دوڑ شروع ہو جاتی اور یہ اعلیٰ ترین دل و دماغ انسانوں کو طاقت حاصل کر کے درندہ بننے کا راستہ نہیں دکھاتے بلکہ زیادہ سے زیادہ نفع رسانی کے گر سکھاتے اور اپنی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کے ساتھ نفع رسانی کی دوڑ میں شریک ہو کر اس دنیا کو جنت کا نمونہ بنا دیتے۔

مگر اب خدا کے فضل سے اس صورت حال کا رد عمل شروع ہو گیا ہے۔ مادہ پرستی کی اس بھٹی کی تپش کو لوگ محسوس کرنے لگے ہیں۔ اور اگرچہ ابھی ان کی تعداد کم ہے لیکن اسی تہذیب کی گود میں پلے ہوئے لوگ بھی سمجھنے جا رہے ہیں کہ یہ خالص اور زیادہ پرستانہ اجتماعی سفر ہم کو بیابانِ مرگ کے قریب لے آیا ہے۔ ہم غلط نقطہ سے چلے تھے اور غلط جگہ پہنچے

پھر یہ مادہ پرستانہ سیکولر تہذیب جب اپنے افکار و نظریات سے مسلح ہو کر اور جدید ترین جنگی اسلحہ سے لیس ہو کر یورپ سے باہر نکلی تو اسے اسلامی تہذیب سے بھی واسطہ پڑا جو اس وقت اگرچہ روحِ جہاد اور روحِ اجتہاد سے محروم ہو کر اپنی تسخیر کی طاقت اور جوانی کھو چکی تھی مگر پھر بھی دنیا کی تمام تہذیبوں میں سب سے زیادہ مرتب اور مربوط تھی۔ ساتھ ہی اپنا ایک جگمگاتا ہوا ماضی رکھتی تھی جس میں تابناک مستقبل نظر آ رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ یہ تہذیب ایک مستحکم ایمان اور زندہ یقین پر قائم ہے اس لیے دوسری اکثر تہذیبیں تو اس جدید تہذیب کے سانچے میں ڈھل گئیں لیکن مسلمانوں نے ہار نہیں مانی مگر چونکہ ہتھیار بند ہاتھوں کے ذریعہ پیش کیے جانے والے خیالات و افکار جسموں سے بھی پہلے دماغوں کو مسحور و مسخر کر لیتے ہیں اس لیے ہر جگہ مقابلہ غیر مساوی رہا۔ یہ مسلح مغربی تہذیب آگے بڑھتی رہی اور غیر مسلح اسلامی تہذیب رک رک کر پیچھے ہٹتی رہی۔ لیکن ایسا کہیں بھی نہیں ہوا کہ وہ بالکل ہی مغلوب ہو کر اسی کے رنگ میں رنگ جائے۔ مغرب کے استادوں نے مسلمانوں کا یہ ذہن بنانے کی پوری کوشش کی کہ اسلام سیاست سے بلند ہے اور اس لیے دین دار مسلمانوں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ " چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات " آنکھیں بند کر کے اپنے ذکر و شغل میں مصروف رہے لیکن چونکہ یہ باتیں ان چیزوں سے میل نہیں کھاتیں جن سے مسلمان کا خمیر بنا ہے۔ اس لیے " کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے " والی کیفیت پیدا ہو گئی اور اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر فکری اعتبار سے دو گروہ بن گئے۔ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں کہ تقریباً تمام مسلم ممالک میں ایک اضطراب کی کیفیت ہے اور رائیں پچھاڑ رہی ہوئی ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ ایک طرف تو مغربی افکار سے مسحور وہ

لوگ ہیں جنھیں مغربی قومیں جلتے جلتے اپنا جانشین بنا گئی ہیں ۔ دوسری جانب وہ لوگ ہیں جو دین کو عافیت کے گوشوں سے نکال کر عملی زندگی کے میدان میں برپا کرنا چاہتے ہیں ۔

مگر جیسا کہ ابھی بیان ہوا ایک طرف تو دانائے فرنگ کی سمجھ میں آنے لگا ہے کہ عقل بے نیاز جب بال و پر کھولے تو وہ گرفتار تر ہو گئی اور اس کا بیمار مادیت کے انگشتوں سے بیمار تر ہو گیا بلکہ بعض سلیم الفطرت اہل نظر تو ہدایت طلب نگاہوں سے اپنے دائرے کے باہر بھی جھانکنے لگے ہیں ۔ دوسری طرف مسلم دنیا میں حرکت پیدا ہوئی ہے اور ان کے سمندر میں فکری لہریں اٹھنے لگی ہیں جس طرح ہزار بارہ سو سال پہلے اپنے غلبے کے دور میں انھوں نے یونانی فلسفہ اور بعض دوسرے علوم و افکار کے حملوں کا مقابلہ خود انہی علوم کے ہتھیاروں سے کیا تھا ، اس طرح اب مغلوبیت کے زمانہ میں مسلم مفکرین مغربی علوم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں اترے ہیں ۔ اب سے چالیس پچاس سال پہلے تک مسلم علماء مغربی تہذیب کا مقابلہ مدافعانہ بلکہ معذرت خواہانہ انداز میں کرتے تھے ۔ مغربی دنیا سے نکلی ہوئی ہر چمکدار چیز کے تعلق سے کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے اسلام میں بھی ہے ۔ ترقی نسواں ہو ، جمہوریت ہو ، معاشی مساوات ہو ۔ غرض یہ کہ جو چیز بھی یورپ سے آئی انھوں نے اسے اسلامی تعلیمات میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ نکالا اور جواب میں پیش کر دیا ۔ حالانکہ ان میں سے ہر چیز اسلام میں ضرور ہے مگر اپنے رنگ میں اور اپنے مزاج کے مطابق ہے ۔ میں نے خود اس زمانے میں جدید تعلیم یافتہ نسل کو اسلام سے شرماتا ہوا دیکھا ہے ۔ مگر اب خدا کے فضل سے یہی نسل زندہ اور اچھا جاننے والے اسلام کی علمبردار بن گئی ہے ۔ اب الحمدللہ اسلام فکری اعتبار سے اقدامی پوزیشن میں آ گیا ہے اور مغربی فکر مدافعت کر رہا ہے ۔ نئی تعمیر کے لیے ہر انقلابی پیش قدمی کے ساتھ یہی ہونا آیا ہے کہ جگہ چھوڑنے والی عمارت کے وارث اس کا استقبال پھانسی کے پھندوں سے کرتے ہیں ۔ مگر آخر میں وہ صلیب بردار ہاتھ زیر ہو جاتے ہیں ۔ جب بھی کوئی تشنہ کام آخر شب میں آتا ہے تو ساقی تعظیم کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے شیشے جھک جاتے ہیں اور ساغر گردش میں آ جاتے ہیں ۔ آج یہی سب کچھ اسلامی دنیا میں تقریباً ہر جگہ ہو رہا ہے اور اب غیر مسلم دنیا کے ٹھہرے اور رکھے ہوئے تالاب میں بھی بلبلے اٹھنے لگے ہیں ۔ حتیٰ کہ مشرقی یورپ جہاں کمیونزم کے سائے میں انسانی بازوں بنے ہوئے ہیں وہاں بھی یہ آواز اٹھنا شروع ہو گئی ہے اور یہ بات یہ نہیں ہے کہ یہ ایک جذباتی ابھار ہے جو یک دفعتہ کسی جگہ سے اٹھتا ہے جیسا کہ جذباتی لہر کا مزاج یہی ہوتا ہے بلکہ اس کے اندر گہرا اور ٹھنڈا اور مدلل فکر

کام کر رہا ہے جس نے مسلمان کے اندر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت پیدا کی ہے اور یہ یقین پیدا کیا ہے کہ صرف یہی حق ہے جسے غالب ہونا ہی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے وہ بال و پر روح الامیں پیدا

یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے۔

اس صدی کی ابتدا میں تقریباً ہر مسلم ملک میں انقلابی اسلام کے داعی پیدا ہوئے۔ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ بس غور طلب بات یہ ہے کہ پچیس تیس سال کے عرصہ ہی میں ایسا کیوں ہوا؟ کیا ان سب بزرگوں کی روحوں نے عالم بالا میں کوئی کانفرنس کر کے طے کیا تھا کہ میں فلاں ملک میں جاتا ہوں تم فلاں جگہ جاؤ۔ یا پھر یہ بات ہے کہ عالم اسباب کے اعتبار سے یہ سب کچھ مغربی تہذیب کے ہمہ گیر غلبہ کا ہمہ گیر ردِ عمل ہے اور اس بات پر یقین کیجیے کہ خدائے رحمٰن و رحیم کو بھی انسانیت پر یعنی اپنے بھٹکے ہوئے بندوں پر رحم آگیا ہے اور اس کی مشیت نے یہ سب اسباب پیدا کیے ہیں تاکہ اس کے ستم زدہ و فریب خوردہ بندے آنکھیں کھولیں اور اپنے رب کی رحمت کے سائے میں آجائیں۔ زمانے کی بہت سی فکری اور عملی تبدیلیاں اور علامتیں صاف بتا رہی ہیں کہ دنیا والے اپنے پیروں سے چل کر اسلام کے قریب آگئے ہیں۔ یہ دعوت توحید زندہ و بیدار ضمیر کی پکار کا جواب تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن اب تو وہ وقت کی ضرورت بھی بن گئی ہے اور عصری تقاضا بن کر ابھر رہی ہے۔ خدا کی رحمت اسلام کی شکل میں اب اس کے بندوں پر نازل ہونے والی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ بس سوال یہ ہے کہ اس رحمت کے نازل ہونے کا ذریعہ کون بنتا ہے؟ آیا امت مسلمہ ہی اس کا ذریعہ بنتی ہے جس کا حق مقدم ہے۔ یا خدانخواستہ اسے نظر انداز کر کے کسی اور کو یہ شرف بخشا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ بے نیاز ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور وہ فرما ہی چکا ہے:۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

میں بھی حاضر تھا وہاں

تاثرات اور حقائق

(۳)

(جناب حکیم خواجہ اقبال احمد ندوی)

ندوہ پہنچنے کے دوسرے ہی سال ایک دن "الاصلاح" میں اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کے دوران نظر پی رسالہ "ترجمان القرآن" کی ابتدائی سطور پر پڑیں اور چند سطریں پڑھنے کے بعد ہی طبیعت اس کی طرف کچھ ایسی مائل ہوگئی کہ بغیر پوری تحریر ختم کیے رسالہ چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ یہ مولانا مودودی کی کتاب "پردہ" کی ابتدائی قسط تھی جو کتابی شکل میں آنے سے پہلے رسالہ میں شائع ہوئی تھی اور رسالہ کے پورے اوراق پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس لیے اس وقت تو یہ قسط ختم نہ ہو پائی اور "الاصلاح" کے دروازے جب بند ہونے لگے تو با دل ناخواستہ رسالہ چھوڑنا پڑا۔ پھر رات میں جب تک جگا اور اگلے دن بار بار اس مضمون کا خیال آتا رہا۔ شام ہوئی اور "الاصلاح" کے دروازے کھلے تو میں نے اس مضمون کو ختم کیا۔ پھر چند دنوں کے اندر اندر میں نے مولانا مودودی کی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں اور ان سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور بے چینی سے "ترجمان القرآن" کا انتظار رہنے لگا اور پھر ترجمان القرآن میں جب مولانا مودودی کا مضمون "ایک اہم دینی تحریک کا تعارف" شائع ہوا تو اسے پڑھ کر ہم سب بہت زیادہ متاثر ہوئے اور مولانا علی میاں صاحب کو مولانا الیاس صاحب کے کام کو سمجھنے کا اشتیاق ہوا چنانچہ انھوں نے مراسلت کی اور جب مولانا الیاس صاحب کے سہارن پور تشریف لانے کا پروگرام معلوم ہوا اور وہ سہارن پور تشریف لے جانے لگے تو ہم لوگوں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس طرح ہم لوگوں کو بھی مولانا الیاس صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع مل گیا۔

سہارن پور مولانا موصوف میوات کی جماعت کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ میوات کی اصلاحات مولانا الیاس رحؒ کی دس بارہ سال کی مسلسل انتھک کوششوں کا ثمرہ تھیں اور اب مولانا موصوف کی اصلاحات کے چلتے پھرتے عملی نمونے ہم لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ اب جس طرح بھولے بھالے، معمولی پڑھے لکھے میواتیوں کے خلوص و محبت اور ایمان و ایقان کا منظر بڑا ایمان افروز تھا۔ اسی طرح میواتیوں کے اندر آئے ہوئے انقلاب کو دیکھ کر یہ بھی دیکھا جا سکتا تھا کہ ایک نحیف و نزار تن واحد کی پرخلوص کوششوں کو اللہ کس طرح بار آور کرتا ہے۔ میں میوات کی جماعت کے ساتھ بھی رہا اور فرداً فرداً بھی میری جماعت کے ہر شخص سے تفصیلی گفتگو رہی۔ میوات کی جماعت میں ایک نومسلم بزرگ عبدالرحمٰن صاحب تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ کہیں پیدل آتے جاتے۔ راستہ میں کوئی غیر مسلم ان کا ہم سفر ہو جاتا تو منزل مقصود پر پہنچتے پہنچتے وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جاتا۔ اس طرح ان کے ہاتھ پر بہت سے غیر مسلم ایمان لے آئے تھے۔ عبدالرحمٰن صاحب خاموش آدمی تھے۔ پھر بھی میری ان سے خوب خوب باتیں ہوتی رہیں اور ان کے خلوص و محبت سے اور خدا ترسی سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ مگر مولانا الیاس صاحب کی ذات کچھ ایسی صفات کی جامع تھی کہ مجھے وہاں کی ہر چیز سے زیادہ مولانا موصوف کی ذات ہی میں کشش محسوس ہوئی۔ اس لیے میرا بیشتر وقت ان کی خدمت ہی میں گذرتا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا الیاس صاحب رحؒ، مولانا علی میاں صاحب سے بڑی محبت فرماتے تھے۔ اور مولانا علی میاں صاحب کے خادم ہونے کی وجہ سے مولانا موصوف کی شفقت و محبت کی بڑی وافر مقدار ہم لوگوں کے حصہ میں بھی آ گئی تھی۔ اب بھی مولانا موصوف کی شفقت و محبت یاد آ جاتی ہے تو اس کی مٹھاس محسوس ہونے لگتی ہے۔ بہرحال مولانا موصوف کے دل میں پہنچکر سارے جہاں کا درد، دین کا درد بن گیا تھا۔ بات کرتے تو پوری بات کہہ نہ پاتے، درمیان ہی میں رقت طاری ہو جاتی، طبیعت قابو سے باہر ہو جاتی اور موٹے موٹے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی، مگر دل کے یہ آنسو وہ کام کر جاتے جو لمبی لمبی تقریریں نہیں کر سکتی تھیں۔ مولانا کی ذات ایک ایسی شمع فروزاں تھی جو خود تو پگھلتی ہی تھی مگر پاس بیٹھنے والوں کو بھی پگھلاتی تھی۔ مولانا کے قریب بیٹھنے سے موت یاد آتی اور آخرت کی بازپرس کا احساس بڑھتا۔ مولانا اپنے کام کی تشریح رموز و اشارات کے بجائے غیر مبہم الفاظ میں فرماتے اور صاف صاف کہتے کہ یہ تو اصل کام کی "اب ت" ہے اور یہ ابتدائی اور شروع کا کام ہے ان شاء اللہ اس کے آگے کام چلے بھی آئے گا۔ مولانا کے یہاں افراط و تفریط نہ تھی۔ جس چیز کا بھی دین میں جو

مقام ہے مولانا موصوف اس کو وہی مقام عطا کرتے تھے۔ اپنے کام کی اہمیت واضح کرنے اور اس کی طرف لوگوں کو راغب کرنے اور اس کی طرف لوگوں کو راغب کرنے کے سلسلے میں وہ کبھی دین کے کسی چھوٹے سے چھوٹے جز کا بھی استخفاف نہ کرتے۔ مولانا موصوف کے نزدیک وہ تمام لوگ معزز و محترم تھے جو دین کے کسی بھی شعبہ کی خدمت کر رہے ہوں۔ ان کی مجلس میں عیب جینی اور خورده گیری کا چلن نہ تھا۔ وہاں جس کا بھی ذکر ہوتا خیر ہی کے ساتھ ہوتا۔ مولانا موصوف کے یہاں تحزب اور گروہ بندی کے قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ چنانچہ ایک دن جب میں مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر تھا۔ صبح ہی سے مختلف لوگوں کے یکے بعد دیگرے آنے کا تانتا بندھ گیا اور مولانا موصوف نے ہر جماعت اور ہر گروہ سے اپنی بات اس طرح کہنی شروع کر دی کہ گویا اس جماعت اور گروہ سے یہ ان کی آخری ملاقات ہے اور اسی ملاقات میں انہیں اپنی پوری بات اس سے کہہ دینی ہے۔ پھر گفتگو کے ساتھ ہی مولانا موصوف پر ان ساری کیفیات کا غلبہ شروع ہو گیا جو ایسے مواقع کے لیے مخصوص تھیں۔ رقت بھی طاری ہونے لگی، طبیعت بھی قابو سے باہر ہونا شروع ہو گئی اور آنکھیں بھی خون کے آنسو بہانے لگیں۔ پھر ہر نئی جماعت سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا موصوف کا لہجہ جتنا پُرزور ہوتا جاتا ان کی کیفیات کی شدت میں بھی ویسا ہی اضافہ ہوتا جاتا۔ مولانا موصوف کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل میں بار بار یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ کاش لوگوں کے آنے کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے منقطع ہو جاتا تو مولانا موصوف کو کچھ آرام کا موقع مل جاتا۔ مگر آنے والوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ خدا خدا کر کے کافی دیر کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوا اور مولانا موصوف نشست گاہ سے ملحق کوٹھری میں جا کر ایک چارپائی پر لیٹ رہے اور میں نے یہ سوچ کر کہ مولانا موصوف آج بہت تھک گئے ہوں گے جا کر ان کا بدن دبانے لگا۔ مولانا موصوف نے پہلے تو یہ کہہ کر مجھے منع فرمایا کہ میں زحمت نہ کروں انہیں اس کی ضرورت نہیں۔ پھر میرے شدید اصرار پر راضی ہو گئے۔ اور میں اپنی سعادت کے اس خداداد موقع سے جو مجھے میسر آگیا تھا پورا پورا فائدہ اٹھانے لگا۔ مولانا موصوف کو راحت محسوس ہوئی تو وہ دعائیں دیتے رہے۔

پھر میری زیر مطالعہ کتابیں اور میرے حالات دریافت فرماتے اور محنت سے اپنے اسباق تیار کرنے کی ہدایت فرماتے رہے۔ مولانا موصوف کی توجہات اپنی طرف منعطف دیکھ کر میں نے ان سے مولانا مودودیؒ کی دعوت کے متعلق ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے وہ سوال کر ڈالا جو ندوہ سے چلنے کے بعد ہی سے میرے دل میں پیدا ہونے لگا تھا۔ میرا سوال سنکر مولانا موصوف اٹھ کر بیٹھ گئے اور ان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو

بہنے لگے۔ مولانا کی یہ کیفیت دیکھ کر میں سہم سا گیا۔ خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ میرے سوال کے الفاظ یا اس کے انداز میں کوئی ایسی بات رہی جس سے مولانا موصوف کو تکلیف پہنچ گئی لیکن اس وقت ان کی کیفیت ایسی نہیں تھی جس میں افسوس کرنے کے سوا کچھ عرض کرنے کی گنجائش ہو۔ اس لیے خاموش رہا۔ مولانا موصوف کی طبیعت سنبھلی تو خود ہی فرمانے لگے بھائی! اصل کام تو وہی ہے جس کی مولانا مودودی دعوت دے رہے ہیں یہ تو ابتدائی کام ہے۔ ان شاء اللہ اس کا بھی وقت آئے گا۔ پھر کئی دن تک مولانا کا بدن دباتے ہوئے ان کی زبان سے "اصل کام" کی جو تفصیل مجھے معلوم ہوتی رہی وہ اقامت دین ہی کے نصب العین کی ان کے اپنے الفاظ اور مخصوص طرز ادا میں تشریح و توضیح تھی۔ بعد میں مولانا علی میاں صاحب نے بعض تحسین آمیز کلمات کا اعادہ کرتے ہوئے مجھ سے کئی بار فرمایا کہ اقبال! مولانا تمہارے متعلق یہ فرماتے تھے۔! مگر اس تحسین کے مستحق تو مولانا علی میاں صاحب خود ہی تھے جنھوں نے ہم لوگوں کو اسی طرح انگلی پکڑ کر حق کی طرف بڑھنا سکھایا تھا جس طرح بچہ کو انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا جاتا ہے۔ فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء

اسی طرح برادرم مولانا عبد الغفار صاحب ندوی سکریٹری شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی ہند، اترپردیش نے جو اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ تھے۔ مجھ سے کئی بار اس بات کا اعادہ فرمایا کہ آپ کے ندوہ سے مولانا مودودیؒ کی خدمت میں چلے جانے کے بعد ایک مرتبہ جب ندوہ کی جماعت نظام الدین گئی ہوئی تھی اور صبح ہماری جماعت کو نظام الدین سے جامعہ نگر جانا تھا تب مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ از راہ کرم خود ہماری جماعت کو رخصت کرنے تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ آپ لوگ پیدل جا رہے ہیں اس لیے اپنے کو میمنہ، میسرہ، قدام اور خلف میں ترتیب دے کر جائیے۔ یہ تو نقل ہے۔ انشاء اللہ اصل کا بھی وقت آئے گا۔ مولانا موصوف کے اس ارشاد سے برادرم عبد الغفار صاحب بتاتے رہے کہ میں اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ جماعت اسلامی سے رکنیت کا تعلق قائم ہو جانے کے بعد بھی ۱۹۴۳ء تک تبلیغی جماعت کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا۔ یہ تھے مولانا الیاس صاحب! اللہ کی بے شمار رحمتیں ہوں اُن پر۔

مولانا موصوف کی ذات جس طرح غلو سے پاک تھی اسی طرح یہ حقیقت بھی ان سے مخفی نہ تھی جو غالی عقیدت مند غلو میں آ کر کر ڈالتے ہیں۔ اسی لیے وہ اپنی جماعت کے لوگوں کو اس انجام سے خبردار کرتے رہتے تھے جو "ان کے ابتدائی کام" کو "اصل کام" قرار دیے جانے کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو:

—— ۳۸ ——

فرمایا۔ لوگ میری تبلیغ کے برکات دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ کام ہو رہا ہے۔ حالانکہ کام اور چیز ہے۔ اور برکات اور چیز ہیں۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ہی سے برکات کا تو ظہور ہونے لگا تھا۔ مگر کام بہت بعد میں شروع ہوا۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ابھی تک اصل کام شروع نہیں ہوا۔ جس دن کام شروع ہو جائے گا تو مسلمان سات سو برس پہلے کی حالت کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اور اگر کام شروع نہ ہوا بلکہ اسی حالت پر رہا جس پر اب تک ہے اور لوگوں نے اس کو بھی منجملہ تحریکات کے ایک تحریک سمجھ لیا اور کام کرنے والے اس راہ میں ڈھیل پڑ گئے تو جو فتنے صدیوں میں آتے ہیں وہ مہینوں میں آجائیں گے۔ اس لیے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔[1]

اور میاں محمد عیسیٰ صاحب فیروزپوری اپنی کتاب میں اس ملفوظ کو نقل کرنے کے بعد اس پر یہ تبصرہ فرماتے ہیں:۔

> یہ ملفوظ بہت ہی غور طلب ہے۔ کیونکہ آپ کی زندگی کے آخری دنوں کا جس قدر کام ہو رہا تھا اس کے بارے میں آپ خود فرما رہے ہیں کہ یہ کام نہیں ہے بلکہ کام کی برکات ہیں۔ حالانکہ آپ کے زمانے میں ہندوستان کے آخری کناروں تک جماعتیں پہنچ چکی تھیں تقسیم سے پہلے ۱۹۴۴ء میں آپ کا انتقال ہوا ہے اور اس وقت تک جماعتیں پشاور کلکتہ، کراچی اور مدراس بمبئی تک بھی دہلی سے پیدل سفر کرتے ہوئے، گاؤں گاؤں کام کرتے ہوئے پہنچ چکی تھیں اور دوآبہ و میوات میں مسلسل جماعتیں پھرنے لگی تھیں۔[2]

مگر مولانا الیاس صاحب کی اس سخت تنبیہ کے باوجود اس "چلت پھرت" اور ابتدائی کام کو "اصل کام" اور "اصل دین" بنا ڈالا گیا۔ اور جس انجام سے انھوں نے خبردار کیا تھا وہ ہو کر رہا ——

چنانچہ جو تفصیلات میسر ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے مولانا موصوف کو "مامور من اللہ" قرار دیا گیا۔ ملاحظہ ہو مولانا علی میاں یوں رقمطراز ہیں:۔

مولانا فرماتے تھے کہ مدینہ طیبہ کے اس قیام کے دوران میں مجھے اس کام کے لیے امر ہوا

---

[1] ملفوظات ۱۹۵۰ء ایڈیشن، ص ۴۲

[2] تبلیغ کا مقامی کام۔ ص ۲۲

اور ارشاد ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے کچھ دن میرے اس بے چینی میں گذرے کہ میں ناتواں کیا کر سکوں گا؟ کسی عارف سے ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے، یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کرو گے، یہ کہا گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے، بس کام لینے والے کام لے لیں گے۔

اس سے بڑی تسکین ہوئی اور آپ نے مدینہ منورہ سے مراجعت فرمائی۔ پانچ مہینے حرمین میں قیام رہا۔ ۱۳ ربیع الثانی کو کاندھلہ واپسی ہوئی [۱]

اس اجمال کی تفصیل بتاتے ہوئے مولانا موصوف کے ایک دوسرے شارح آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اللہ رب العزت کو آپ کی یہ کیفیت پسند آگئی اور اللہ نے محض اپنے لطف و کرم سے اس گمراہی کے دور میں ہدایت پر آنے کے اصول آپ پر الہام فرمائے۔ ان کے ملنے کے بعد آپ کے چہرے پر انوارات کا بڑا نور محسوس کیا گیا اور آپ کی طبیعت میں سکون اور طمانینت محسوس ہونے لگی اور آپ پر تقاضا ہو گیا کہ جلد ہندوستان چلنا ہے۔ [۲]

ایک عارف سے "ماموریت" کی توثیق مولانا علی میاں صاحب اس طرح کراتے ہیں:۔

صاحبزادہ مولوی محمد یوسف صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر جو باب العمرہ کے برابر والے مکان میں تھی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت کچھ فرما رہے تھے اور اور ہم سب سن رہے تھے کہ ایک شخص دروازے کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے اور خطاب کر کے کہا کہ جو کام تم کر رہے ہو، اس میں مشغول رہو، اس کا اجر و انعام اتنا بڑا ہے کہ اگر تمہیں بتلا دیا جائے تو تم برداشت نہ کر سکو، شادی مرگ ہو جائے، یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے اور ہمیں کچھ نہ معلوم ہوا کہ وہ کون بزرگ تھے، مولانا بدستور اپنی گفتگو میں مشغول رہے اور ادھر التفات بھی نہ کیا [۳]

---

[۱] حضرت مولانا محمد الیاس ؒ اور ان کی دینی دعوت۔ ص ۷۷، ۷۸

[۲] تبلیغ کا مقامی کام ص ۳۷

[۳] حضرت مولانا محمد الیاس ؒ اور ان کی دینی دعوت ص ۴۹

اب بتایا جاتا ہے کہ ہدایت کے اصولوں کا متن تو اللہ نے مولانا الیاس صاحبؒ پر الہام کیا تھا اور اس کی تشریح ان کے صاحبزادے سے کرائی تھی۔ ملاحظہ ہو:۔

اصل بات یہ ہے کہ اصولوں کا متن حضرت مولانا الیاس صاحبؒ پر اللہ نے کھولا تھا اور ان کی تشریح حضرت مولانا محمد یوسفؒ سے کرائی تھی۔ اب بعد والوں کی ذمہ داری ہے کہ اُن کو معلوم کرتے رہیں اور ان پر جم کر کام کرتے رہیں۔ کیونکہ اصل اصول وہی ہیں جو یہ حضرات بتلا گئے ہیں[1]

اس نئی ہدایت اور اس کی شرح کا کتاب وسنت کے تابع نہ ہونا اور کتاب وسنت کے بالمقابل اور مستقل بالذات ہونا ہی شاید اس امر کا سبب بن گیا ہے کہ تبلیغی جماعت کے پلیٹ فارم سے دینی اقدار کا انہدام ہوتا رہتا ہے اور علمائے کرام نہایت اطمینان سے بالکل خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر اس الہام کے متعلق جس کی بنیاد پر ایک نیا نظام فکر وعمل تصنیف کر ڈالا گیا ہے ـــ مولانا منظور صاحب نعمانی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خواب تھا۔ ملاحظہ ہو:۔

..... پھر فرمایا۔ آج کل خواب میں مجھ پر علوم صحیحہ کا القا ہوتا ہے۔ اس لیے کوشش کرو کہ مجھے نیند زیادہ آئے (خشکی کی وجہ سے نیند کم ہونے لگی تھی تو میں نے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے سر میں تیل کی مالش کرائی جس سے نیند میں ترقی ہو گئی) آپ نے فرمایا کہ اس تبلیغ کا طریقہ بھی مجھ پر خواب میں منکشف ہوا[2]

[1] تبلیغ کا مقامی کام۔ ص ۴۲
[2] ملفوظات ص ۵۰

مسلمانوں کے زوال کے (۶) چھ اسباب

استاد سعید نورسی ترکی میں انقلاب کے بانی تھے۔ دمشق کی جامعہ اموی میں دس ہزار کے مجمع میں ایک لمبی تقریر کی جو خطبہ شامیہ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس میں انھوں نے زوال مسلمین کے چھ اسباب بتائے ہیں۔

(۱) مایوسی کا چھا جانا۔ (۲) حیات اجتماعی اور سیاست میں صداقت کا خاتمہ (۳) عداوت سے محبت (۴) اہل ایمان کے درمیان رابطہ کا نہ ہونا۔ (۵) استبداد جو طرح طرح کی خرابیوں کا باعث ہو۔ (۶) ذاتی مفاد پرستی

سیرت کا ایک انوکھا پہلو

(ڈاکٹر محمد ذکی شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

کسی بات کی تصدیق عام طور پر دو طرح کی جاتی ہے۔ ایک تو قول سے اور دوسرے عمل سے۔ مثلاً اگر یہ بات کہی جائے کہ حق گوئی ایک اعلیٰ صفت ہے اور جو شخص سچ بولتا اور سچائی پر قائم رہتا ہے، بالآخر کامیاب ہوتا ہے، یہ سنکر جب کوئی شخص اس کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تو وہ صرف زبان سے تصدیق کرتا ہے لیکن اگر خود بھی سچ بولے اور صداقت پر قائم بھی رہے، اس کی مخالفت ہو اور پھر بالآخر کامیاب ہو کر دکھا دے تو کہا جائے گا کہ اس نے اس قول کی عمل سے بھی تصدیق کر دی۔

اسی طرح اس بات کو کہ آگ سوکھی لکڑیوں کو جلا ڈالتی ہے۔ ہر شخص مانتا اور اس کا اقرار کرتا ہے لیکن یہ زبانی تصدیق ہے۔ اب اگر کوئی سوکھی لکڑیاں جمع کرے اور انہیں جلا کر دکھا دے تو اس بات کو عمل سے ثابت کر دے گا۔

لیکن کیا کسی تاریخی واقعہ کی بھی عملی تصدیق ممکن ہے؟ مثلاً یہ واقعہ بیان کیا جائے کہ آج ہزاروں سال پہلے سرزمین عراق میں لوگ بت پرستی میں مبتلا تھے کہ اچانک انہی میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس طریق عبادت کی مخالفت کرنے اور فرماں روائے کائنات کی بندگی کی دعوت دینے لگا اس پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور پوری قوم اس شخص کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ اب اس واقعہ کی تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ کوئی اقرار کرے کہ ہاں ایسا ہی ہوا تھا یا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت پیش کر دے۔ لیکن دونوں صورتوں میں یہ زبانی یا لفظی تصدیق ہو گی۔ البتہ اگر ایسے ہی ماحول میں کوئی شخص یہ کہے کہ میں اس کو عمل سے بھی ثابت کر سکتا ہوں اور پھر وہ بت پرستی

کی مذمت کرتے ہوئے پروردگار عالم کی عبادت کی دعوت دے اور پھر پوری قوم اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوجائے۔ ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ اس شخص نے اس تاریخی روایت کی عمل سے تصدیق کردی جس کا حسی طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

اس نوع کی تصدیق کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ واقعہ اسی طرح رونما ہوا ہوگا جس طرح مروی ہے اور تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر متعلقہ واقعہ کے بارے میں مختلف روایات اور اقوال موجود ہوں تو یہ فیصلہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان میں کون سی روایت یا قول صحیح ہے۔

اس کی ایک نہایت واضح مثال ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"یہودیوں اور عیسائیوں کی مشہور مذہبی کتاب بائبل میں یہ قصہ بیان ہوا تھا کہ (حضرت عیسےٰؑ سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے) جبکہ ملک مصر میں فرعون کی فرماں روائی تھی اور اس نے سرزمین مصر کو ظلم و فساد سے معمور کر رکھا تھا بنی اسرائیل میں سے ایک فرد حضرت موسےٰ نے خود کو (پروردگار عالم کا) رسول بتاتے ہوئے فرعون کو کچھ ہدایات دی تھیں لیکن فرعون اور اس کی قوم نے ان کی رسالت کا نہ صرف یہ کہ انکار کردیا بلکہ حضرت موسےٰ کے ماننے والوں پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کردیا۔ آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی بنیاد پر بائبل کے اس بیان کی تصدیق فرمائی کہ ہاں یہ سچ ہے ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اپنی سیرت سے ان واقعات کی عملی تصدیق کا نمونہ بھی پیش فرما دیا۔ کیونکہ آپ نے بھی حضرت موسےٰؑ کی طرح رسالت کا اعلان فرما دیا اور آپ کی قوم بھی آپ کی مخالفت پر اسی طرح کمربستہ ہوگئی جس طرح فرعون اور اس کے ہم نوا ہوئے تھے، اور جس طرح فرعون اور اس کے ساتھی اس زمانہ میں اہل ایمان کو ستا رہے تھے اسی طرح سرداران قریش مکہ میں اہل ایمان کو اذیتیں پہنچا رہے تھے۔

ا۔ ان حالات میں حضرت موسےٰؑ نے کیا طریق کار اپنایا؟ قرآن حکیم نے یہ انکشاف کیا کہ حضرت موسےٰؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"خدا سے مدد مانگو اور (اس راہ میں) جمے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت مرضئ) خدا ہی کے لیے ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور انجام کار انہی کے لیے ہے جو متقی ہوں گے۔"

انھوں نے کہا "تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔"

موسٰیؑ نے کہا۔ "قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں ملک میں اس کا جانشین بنائے۔ پھر دیکھے (اس جانشینی کے بعد) تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں!

(الاعراف ۷/۱۲۸، ۱۲۹)

اور موسٰیؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر ایمان لائے اور اس کی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو، تو چاہیے کہ صرف اسی پر بھروسہ کرو (اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو۔

انھوں نے کہا "ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ (ہم دعا کرتے ہیں کہ) پروردگار! ہمیں اس ظالم گروہ کے لیے آزمائشوں کا موجب نہ بنائیو (کہ اس کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں کمزوری دکھائیں) اور اپنی رحمت سے ایسا کیجیو کہ اس کافر گروہ کے پنجہ سے نجات پا جائیں۔

اور ہم نے موسٰی اور اس کے بھائی (ہارون) پر وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں مکان بنائیں اور اپنے مکانوں کو قبلہ رخ تعمیر کرو۔ (نیز ان میں نماز قائم کرو اور جو ایمان لائے ہیں، انہیں (کامیابی) کی بشارت دو۔"

(یونس ۱۰/۸۴-۸۵)

یعنی حضرت موسٰیؑ نے اہل ایمان کو نصیحت کی کہ ان حالات میں اللہ ہی سے مدد مانگو، صبر کرو۔ اسی پر بھروسہ رکھو اور نماز قائم کرو۔

انھوں نے سمجھایا کہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس پر حکمران بنا دیتا ہے لیکن بالآخر متقی لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

پھر جب ان کی قوم نے نصیحت پر عمل کرتے ہوئے صبر سے کام لیا۔ اللہ ہی پر بھروسہ کیا اور اسی سے مدد مانگی تو انہیں بشارت دی گئی کہ عنقریب ظالم قوم ہلاک ہو جائے گی اور اہل ایمان کو اقتدار عطا ہوگا۔ البتہ اس وقت اہل ایمان کی آزمائش دوسری طرح ہوگی کہ طاقت و حکومت مل جانے کے بعد وہ کیا کرتے ہیں، ظالموں کی پیروی یا اللہ کی فرماں برداری۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینے کے لائق ہے کہ ان میں سے بیشتر باتوں کا تورات میں کوئی ذکر نہیں۔[1]

---

[1] بجز اس کے کہ بنی اسرائیل کے خداوند نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو اس سرزمین کا (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا انکشاف قرآن ہی نے کیا، اور منکرین کے نزدیک یہ باتیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے کہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ منکرین رسالت ذرا توقف کریں اور سوچ کر جواب دیں (اگر دے سکتے ہیں تو)

(۱) جو صورت حال مصر میں تھی بالکل وہی مکہ میں بھی تھی، تو کیا یہ حالات خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کر دیے؟ کیا کوئی انسان ایسا کرنے پر قادر ہے؟

(۲) ایسے حالات میں جبکہ اہل ایمان کھل کر پروردگار عالم کی عبادت نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی ان پر ظالم لوگ مسلط تھے جو ان پر طرح طرح کے مظالم کر رہے تھے۔ قرآن حکیم نے بتایا (اور بقول منکرین خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے) کہ حضرت موسےٰؑ نے اپنی قوم کو یہ طریق کار سکھایا کہ صرف اللہ سے مدد مانگیں صبر واستقلال سے کام لیں، اللہ ہی پر بھروسہ کریں، اور اسی راہ پر چل کر انہیں منزل مقصود ملے گی اور اسی طرح کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔

اب منکرین رسالت بتائیں کہ اس طریقہ کے سوا وہ کون سا طریقہ تھا جو حضرت موسےٰؑ نے اختیار کیا تھا؟ تورات جو کچھ بتاتی ہے وہ یا خود تحقیق کے بعد اور کوئی طریق کار تجویز کرتے ہیں جو کامیابی کا ضامن ہو؟ لیکن محض "علمی تحقیق" یا "قیاس آرائی" کافی نہیں ہو سکتی۔ انہیں واقعات کی دنیا میں یہ ثابت کرنا ہوگا۔ یہ دکھانا ہوگا کہ ایسے حالات میں ان کا بتایا ہوا طریقہ کامیابی سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ اس کے لیے کوئی معتبر تاریخی شہادت پیش کر سکتے ہو تو کریں۔

(۳) اور اب اس طرف بھی توجہ دیں۔ قرآن کے بتائے ہوئے راستہ پر ہی چل کر موسیٰ علیہ السلام

(بقیہ حاشیہ) وارث بنا دے گا جہاں شہد اور دودھ کی فراوانی ہو گی یعنی فلسطین اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ جس کے لیے خداوند نے ابراہیم علیہ السلام سے عہد کیا تھا۔

پورا عہد نامہ عتیق پڑھنے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ خدا نے یہ کائنات ہی اس لیے بنائی ہے کہ بنی اسرائیل کو اس سرزمین کا وارث بنائے لیکن کس طرح اس قوم نے اس ملک پر قبضہ کیا اور اس کے بعد کیا کیا اسے پڑھ کر ہر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ کیا یہی وہ چہیتی قوم ہے؟ پوری بائبل پڑھ ڈالیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خود بنی اسرائیل کے مذہبی رہنما اس قوم کے کرتوت پر سوائے رنج و غم کے اظہار کے اور کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔

کامیاب ہو سکتے تھے اور رہے۔ اس کا عملی ثبوت خود آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ میں موجود ہے۔ بالفاظ دیگر آپ نے اسی راستہ کو اختیار کرکے، اس کا عملی نمونہ پیش کرکے، یہ دکھا دیا کہ ایسے حالات میں اسی طریق کار کو اپنا کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مظلوم مسلمانوں کو بھی نصیحت کی گئی کہ اللہ ہی سے مدد مانگیں صبر سے کام لیں اسی پر بھروسہ رکھیں اور نماز قائم کریں۔

انہیں دعا سکھائی گئی تھی کہ اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کریں۔

"ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" (فاتحہ)

فرمایا :-

"پس صبر کرو، انجام کار متقیوں ہی کے حق میں ہے" (ہود ۱۱/۴۹)

"ان سے کہو، وہ بڑا رحیم ہے۔ اسی پر ہم ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے"
(الملک ۶۷/۲۹)

"یہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی۔ ہدایت اور بشارت اُن ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں" (النمل ۲۷/۱-۳)

"عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔ (القمر ۵۴/۴۵)

"زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے" [1] (الانبیاء ۲۱/۱۰۵)

(۲) اہل ایمان کی اس طرح تربیت کی جا رہی تھی۔ انہیں تسلیاں دی جا رہی تھیں اور کامیابی کی بشارتیں سنائی جا رہی تھیں لیکن دشمنوں کے خوف اور خود اپنی قوم کے لیڈروں کی ملامت کے ڈر سے لوگ کھل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے کترا رہے تھے۔ البتہ بنی اسرائیل میں سے کچھ نوجوان آگے بڑھے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا اور ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ارشاد ہے :-

---

[1] متعلقہ مضمون کے سلسلے میں بہت سے مکی اور مدنی آیات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ ہم نے بطور نمونہ چند آیات نقل کر دی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔
آل عمران ۳/۱۲۰، الاعراف ۷/۱۲۹، الضحیٰ ۹۳/۴-۵، الممتحنہ ۶۰/۵-۷، النور ۲۴/۵۵

(پھر دیکھو کہ) موسیٰ کو اس کی قوم سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کرے گا۔

(یونس ۱۰/۸۳)

یہ بھی قرآن حکیم کا ایک نہایت اہم انکشاف ہے جس کا تورات میں کوئی ذکر نہیں کہ ایسے صبر آزما حالات اور فتنے کے دور میں اسلامی انقلابی دعوت کو قبول کرنے اور سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں میں بڑے بوڑھے، جہاں دیدہ، مصلحت اندیش اور دور بین لوگ نہیں تھے، بلکہ نوجوان ہی آگے بڑھے تھے۔ اور ہر دور میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ قرآن کے اس انکشاف کے بارے میں اگر کسی کو شک ہے تو وہ مستند تاریخی شہادت پیش کر کے دکھا دے کہ بنی اسرائیل کے نوجوان نہیں بلکہ تجربہ کار اور بوڑھے لوگ آگے بڑھے تھے اور نوجوان ہچکچاتے رہے۔

اور دوسری طرف اس تاریخی حقیقت کا جہاں قرآن نے انکشاف کیا وہاں عمل سے اس کی تصدیق بھی کر دی اور واقعات کی دنیا میں بھی دکھا دیا کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس وقت ہر شخص دیکھ سکتا تھا (اور آج بھی دیکھ سکتا ہے) کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لپکنے بڑھنے بوڑھے نہیں۔ نوجوان ہی ابتدا میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرنے کے لیے تیار تھے اور وہی قربانیاں بھی دے رہے تھے۔ مثلاً حضرات علی بن ابی طالبؓ، جعفر طیارؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، مصعب بن عمیرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ قبول اسلام کے وقت بیس سال سے کم عمر کے تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ، بلالؓ، اور صہیبؓ کی عمریں بیس اور تیس کے درمیان تھیں۔ ابو عبیدہ بن الجراحؓ، زید بن حارثہؓ، عثمان بن عفانؓ اور عمر فاروقؓ تیس اور پینتیس کے درمیان تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ۳۸ سے زیادہ نہ تھے۔ عمار بن یاسرؓ چالیس کے قریب تھے اور صرف ایک صحابی عبیدہ بن حارث مطلبی عمر میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تھے[۱]

یہ وہ نوجوان تھے جو بے خطر "آتش نمرود" میں کود رہے تھے اور وقت کے فرعون اور ابوجہل اپنے اقتدار کے نشہ میں یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی کوئی گرفت نہیں ہوگی لیکن جب گرفت ہونے لگی، بارش سے پہلے بادلوں کی طرح عذاب شدید کے بادل منڈلانے لگے تو بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ غور یار

۱؎ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن۔ سورۂ یونس ۱۰ حاشیہ ۷۸

۴۔ ہم نے فرعون کی قوم کو خشک سالی کے برسوں اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تا کہ وہ متنبہ ہوں۔ تو جب کبھی ایسا ہوتا کہ خوش حالی آتی تو کہتے۔ یہ ہمارے حصہ کی بات ہے۔ (یعنی ہمارا حق ہے) اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آجاتی، تو کہتے یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست (اور کسی کے پاس نہ تھی)) اللہ کے یہاں تھی (جس نے انسان کی اچھی بری حالتوں کے لیے ایک قانون ٹھہرا دیا ہے اور اسی کے مطابق نتائج پیش آتے ہیں) لیکن بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں۔

اور فرعون کی قوم نے کہا (اے موسیٰ!) تو ہم پر اپنا جادو چلانے کے لیے کتنی ہی نشانیاں لائے۔ مگر ہم ماننے والے نہیں۔"

پس ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیوں کے دل اور جوئیں اور مینڈک اور لہو، کہ یہ سب الگ الگ نشانیاں تھیں۔ اس پر بھی انھوں نے سرکشی کی اور ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا۔

اور جب ان پر عذاب کی سختی واقع ہوتی تو کہنے لگے "اے موسیٰ! تیرے پروردگار نے تجھ سے (نبوت کا) جو عہد کیا ہے، تو اس کی بنا پر ہمارے لیے دعا کر۔ اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں۔

لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ (اپنی سرکشیوں اور بدعملیوں سے) انہیں اس تک پہنچنا تھا۔ عذاب ٹال دیا۔ تو دیکھو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ (الاعراف ۱۳۰ - ۱۳۵)

کیا ہر زمانہ میں منکرین کی یہی روش ہوتی ہے اور کیا واقعی فرعون اور اس کی قوم عذاب الٰہی کی ایسی ہی تاویل کر چکی تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی روش سے مل سکتا ہے جن کا حال بالکل ایسا ہی تھا۔

(بقیہ صفحہ ۵۳) کے لیے نیا وضو کرنا پڑے گا۔

(۴) عذر ختم ہو جانے کی صورت یہ ہے کہ کسی فرض نماز کے پورے وقت میں وہ عذر پیش نہ آئے تو وہ معذور نہیں رہے گا مثلاً انفلاتِ ریح (خروجِ ریاح) کی وجہ سے کوئی شخص معذور تھا اور ظہر یا عصر یا کسی فرض نماز کے پورے وقت میں ایک بار بھی ریاح خارج نہیں ہوئے تو اب وہ معذور نہیں رہا اس کے وضو اور نماز کا وہی حکم ہوگا جو کسی تندرست آدمی کے لیے ہے۔

رسائل و مسائل

ایک تجارتی اسکیم

خط

آپ سے ایک تجارتی اسکیم کے سلسلے میں شرعی نقطہ نظر دریافت طلب ہے۔

Home Man نامی ایک کمپنی قسطوں پر مختلف گھریلو اشیاء ــ کپڑے، فرنیچر، بجلی کے گھریلو استعمال کے سامان وغیرہ فروخت کرتی رہی ہے۔ اب اس نے ایک نئی اسکیم پیش کی ہے۔ مختصراً اس اسکیم کے اہم اجزاء مندرجہ ذیل ہیں۔

• بنیادی طور پر یہ رقم بچت اسکیم ہے۔

• جو کوئی بھی ایک مخصوص رقم ایک خاص مدت کے لیے اس کمپنی میں بچت کروائے گا، اس کو اس رقم کے کم و بیش قیمت کے مطابق کوئی چیز جو پسند کرے، فوراً ہی دی جائے گی۔ کمپنی کہتی ہے کہ یہ مفت ہے بطور انعام ــ اور اس خاص مدت کے اختتام پر بچت کرنے والے کو اس کی رقم بعینہ لوٹا دی جائے گی۔ بچت کی مدت اور مبلغ رقم دی جانے والی چیزوں کے مطابق مختلف ہوتی ہیں۔ اور یہ کمپنی نے متعین کر رکھا ہے۔

• بطور مثال دس ہزار روپے ۵ سال کی مدت کے لیے بچت کروانے پر تقریباً نو دس ہزار روپیوں کی مالیت کا فرج فوری ڈپازٹ کے وقت ہی مل جاتا ہے۔ اور پانچ سال بعد دس ہزار روپیہ بھی۔

اس کمپنی کی شاخیں ــ بنگلور، مدراس، مدورا اور ترونلدرم میں قائم ہیں۔ اس کی موجودہ اسکیم مسلم عوام و خواص میں خاصی مقبول ہو رہی ہے۔

گذارش ہے کہ براہ کرم اس اسکیم پر شرعی نقطہ نظر سے روشنی ڈالیں تاکہ اس اسکیم کے تحت لین دین کی اباحت یا قباحت ظاہر ہو جائے۔

جواب

یہ آپ کے علم میں ہے کہ سود کی حرمت بہت شدید ہے۔ اسی لیے شریعت اسلامیہ میں ربا اور ریبۃ یعنی سود اور شبہ سود دونوں سے روک دیا گیا ہے۔

آپ نے جو اسکیم لکھی ہے اس میں قابل غور سوال یہ ہے کہ کمپنی کسی شخص کو دس ہزار کے بیس ہزار کہاں سے دیتی ہے؟ مثال کے طور پر دس ہزار روپے پانچ سال کی مدت کے لیے جمع کرنے پر وہ گویا دس ہزار کا ریفریجریٹر فوراً دے دیتی ہے اور پانچ سال کے بعد دس ہزار روپے بھی واپس کر دیتی ہے تو وہ دس ہزار کے بیس ہزار دیتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ تم مجھے تین سال کی مدت کے لیے ایک ہزار روپیہ دو اور میں انعام کے طور پر ایک سو روپیہ فوراً تم کو دوں گا اور تین سال کے بعد ایک ہزار روپیہ بھی واپس کر دوں گا آپ تو د غور کریں کہ ایک سو روپیہ پیشگی سود کے سوا اور کیا ہوں گے۔ سود کا نام انعام رکھ دینے سے حقیقت تو نہیں بدلے گی یہی معاملہ اس تجارتی اسکیم کا ہے جس کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کمپنی پیشگی سود سامان کی شکل میں ادا کرتی ہے۔ اس میں کمپنی کا فائدہ یہ بھی ہے کہ دس ہزار کا جو سامان وہ دیتی ہے وہ فی الواقع دس ہزار سے کم کا ہوتا ہے۔ کمپنی نے حساب لگا لیا ہے کہ دس ہزار سے پانچ سال میں وہ کتنا نفع کمائے گی۔ اسی نفع میں سے وہ انعام کے نام سے سود دیتی ہے۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے۔ یہ تجارتی اسکیم شرعاً ناجائز ہے۔

معذور کے لیے وضو اور نماز کا حکم

خط: ۔ ایک صاحب کئی سال سے پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہیں اور آجکل ان کے ریاح اس کثرت سے خارج ہوتے ہیں کہ ان کے لیے نماز پڑھنا دشوار ہو گیا ہے۔ وضو کرتے کرتے پریشان ہو گئے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں شریعت نے کوئی رعایت دی ہے۔ اگر دی ہو تو وہ کس طرح عمل کریں؟

جواب

دین اسلام خدائے رحمٰن و رحیم کا اتارا ہوا دین ہے۔ اس میں کوئی ایسی سختی نہیں رکھی گئی ہے جو انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو۔ جس شریعت نے ایسے مریض کو جو بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ لیٹ کر اشاروں سے نماز ادا کرنے کی سہولت دی ہے۔ اس میں معذور کے لیے رعایت کیوں نہ ہوگی۔ پہلے آپ "معذور" کی فقہی اصطلاح

کو سمجھ لیں۔

(۱) فقہ حنفی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جس شخص کو کوئی ایسی بیماری ہوگئی ہو جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہو مثلاً انفلات ریح یعنی ریاح خارج ہونا۔ اگر یہ بیماری اس درجہ پر پہنچ گئی ہو کہ کسی فرض کے پورے وقت میں کوئی شخص خروج ریاح کے بغیر اس وقت کی نماز ادا نہ کر سکتا ہو تو ایسے شخص کو معذور کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو ظہر کا وقت آنے سے پہلے یہ بیماری پیدا ہوئی اور ظہر کے پورے وقت میں اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ وہ وضو کر کے خروج ریاح کے بغیر فرض نماز ادا کر لیتا تو اب وہ شخص معذور سمجھا جائے گا۔ اسی طرح کسی کو سلس البول یعنی پیشاب کے قطرے آنے کی بیماری ہو اور کسی فرض نماز کے پورے وقت میں اس کے بغیر وہ فرض نماز ادا نہ کر سکتا ہو تو وہ معذور ہے۔

(۲) پورے وقت کی قید ابتداءً معذور سمجھے جانے کے لیے ہے لیکن اس کے بعد جبکہ وہ معذور قرار پا چکا کسی دوسری نماز کے وقت ایک بار بھی خروج ریاح ہو جائے یا پیشاب کے قطرے آجائیں تو وہ معذور باقی رہے گا اس کا عذر ختم نہیں سمجھا جائے گا۔

اب معذور کے وضو اور نماز کا حکم سمجھ لیجیے۔ معذور کا حکم یہ ہے کہ وہ وضو کر کے کسی وقت کی تمام نمازیں۔ فرض، واجب، سنت، نفل سب پڑھ سکتا ہے خواہ نمازیں ریاح خارج ہوتے رہیں یا پیشاب کے قطرے آتے رہیں لیکن دوسرے وقت کی کوئی نماز نیا وضو کیے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ ہر وقت کے لیے اس کو نیا وضو کرنا ضروری ہے۔

(۳) یہ بھی سمجھ لیجیے کہ کسی معذور کا وضو کسی فرض نماز کا وقت گزر جانے سے ٹوٹتا ہے۔ کسی فرض نماز کا وقت داخل ہونے سے نہیں ٹوٹتا۔ مثلاً کسی معذور نے ظہر کا وقت آنے سے پہلے وضو کیا تو اس وضو سے وہ ظہر کی تمام نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ اس کو نیا وضو ظہر کا وقت گزر جانے کے بعد عصر کی نماز کے لیے کرنا ہوگا۔ البتہ جس عذر کی وجہ سے وہ معذور قرار پایا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا ناقض وضو پیش آجائے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا اور نیا وضو کیے بغیر کوئی نماز نہیں پڑھ سکے گا۔ مثلاً کوئی شخص انفلات ریح (خروج ریاح) کی وجہ سے معذور تھا اس نے ظہر کی نماز سے پہلے وضو کیا لیکن ظہر کا وقت آنے سے پہلے نکسیر پھوٹ گئی یا اس کو پیشاب کرنا پڑا تو اب اس کا وضو ٹوٹ گیا اور نماز ظہر ادا کرنے کے لیے نیا وضو کرنا پڑے گا۔ یا اسی معذور نے وضو کر کے ظہر کی فرض نماز ادا کی اس کے بعد نکسیر پھوٹ گئی یا پیشاب کرنا پڑا تو سنت اور نفل وغیرہ (باقی ص۔۔ پر)

تنقید و تبصرہ

قرآن اور دُعا محمد ثناء اللہ عمری ایم اے۔ صفحات ۲۲۶۔ قیمت بارہ روپے۔
ملنے کا پتہ: جامعہ دارالسلام عمر آباد ۸۰۸ ۶۳۵ تامل ناڈو۔

جناب ثناء اللہ عمری ایم اے۔ ایک ابھرتے ہوئے مقالہ نگار اور مصنف ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب غالباً ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ قرآن اور دعا کے موضوع پر انھوں نے ایک جامع کتاب مرتب کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مصنف کے دیباچہ کے بعد ان کے استاد محترم مولانا حافظ سید عبدالکبیر صاحب کا مختصر مقدمہ ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے:۔

خوشی کی بات ہے کہ میرے شاگرد مولوی محمد ثناء اللہ عمری ایم اے نے میرے سوچے ہوئے ایک موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ میں نے اس کتاب کا مسودہ دیکھا اور وقتاً فوقتاً مؤلف کو ہدایات دیتا رہا۔ یہ کتاب قرآنی دعاؤں کا نرا انتخاب یا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ قرآن پاک کی روشنی میں دعا اور اس کے متعلقات کا ایک مطالعہ ہے جو خاصی محنت اور لگن سے کیا گیا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں دعائیں آئی ہیں ان کے ساتھ ان کی قبولیت کے مناظر بھی قرآن ہی کی روشنی میں اجاگر کیے گئے ہیں اور عزیز موصوف نے اس سلسلے میں یہ اصول تفسیر پیش نظر رکھا ہے۔ "القرآن یفسر بعضہ بعضاً"۔

اس کتاب پر یہ ایک اچھا تبصرہ ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے اتمام حجت کے بعد اپنی اپنی مجرم قوموں کے لیے جو بد دعائیں کی ہیں مؤلف کتاب نے ان کو بھی جمع کر دیا ہے۔ اسی طرح دوزخی جو دعائیں مانگیں گے ان کو بھی اکٹھا کر دیا ہے۔ فہرست بھی ہے جس سے کتاب کا استفادہ آسان ہو گیا ہے۔ قرآن کریم میں کن کن چیزوں کے لیے دعائیں ہیں یہ فہرست ہی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب سے استفادہ کیا جائے گا۔

سازِ ازل محمد حسین فطرت بھٹکلی صفحات ۱۶۰ کتابت طباعت کاغذ بہتر۔ قیمت مجلد پندرہ روپیے۔
ناشر مکتبہ علم و دانش ملکے ہاؤس، شوکت علی روڈ بھٹکل (نوکے) پن کوڈ ۵۸۱۳۲۰

جناب محمد حسین فطرت بھٹکلی صاحب کا یہ تیسرا مجموعہ کلام ہے اس سے پہلے دو مجموعے "ساغرِ عرفان" اور "گلبانگ فطرت" شائع ہوئے تھے۔ زیرِ تبصرہ مجموعہ میں مصنف کا مختصر تعارف اور عرضِ مصنف کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی کے تاثرات ہیں۔ پھر جناب رشید کوثر فاروقی کے چند توصیفی کلمات ہیں۔ اس کے بعد زار زرّانی صاحب کا مکتوب ہے۔ سالار بنگلور کے مدیرِ ادبی گلشن جناب انشاء کے تاثرات اور اس کے بعد عبدالرحمٰن باطن بھٹکلی کا تبصرہ ہے۔ ان مرحلوں سے گزر کر جناب فطرت کا کلام شروع ہوتا ہے۔ مجموعہ کا بہت بڑا حصہ غزلیات کے لیے ہے اور آخیر میں کچھ نظمیں ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی منقبت میں دو مختصر قصیدے ہیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کے عنوان سے ایک نظم اور "نوحہ عامرؒ" کے عنوان سے مولانا عامر عثمانی مرحوم و مغفور کی وفات پر تاثرات کا اظہار ہے۔ غزلوں نظموں اور قصیدوں کی زبان یکساں ہے۔ غزلوں کے بعد جب نظمیں پڑھی جاتی ہیں تو ان دونوں میں زبان کے لحاظ سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بھٹکل میں جو اردو زبان کے مراکز سے بہت دور ہے، جناب فطرت اردو شاعری کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ تبصرہ نگار کے نزدیک جو نہ ادیب ہے اور نہ شاعر۔ ان کی شاعری اس لیے بھی قابلِ قدر ہے کہ وہ ادب برائے ادب کے نہیں، بلکہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اچھے خیالات کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ ان کا کوئی شعر اخلاق اور شائستگی سے گرا ہوا نہیں ہے۔ "فکر و فن" کی بحث میں وہ فن کے منکر نہیں ہیں لیکن ان کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکر کو فن پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کسی اچھے خیال کو فن پر قربان نہیں کرتے۔ اس کو موزوں کر لیتے ہیں خواہ اس میں شعریت پائی جائے یا نہیں۔ اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان کے اشعار میں شعریت نہیں پائی جاتی۔ بہت سے اشعار فکر و فن کے اچھے نمونے ہیں۔ اپنے تبصروں میں کئی بار میں اس کا ذکر کر چکا ہوں کہ انتخاب اشعار کا معاملہ انتخاب کرنے والے کے ذوق پر منحصر ہے۔ تبصرہ نگار کے ذوق کے مطابق بھی اس مجموعے میں بہت سے اشعار ہیں۔ ان سب کو یہاں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ چند شعر بطور نمونہ پیش کیے جا رہے ہیں

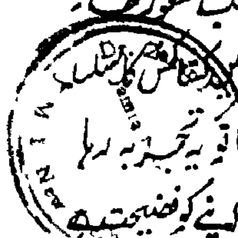
بغیر اس کے ترا علم سود مند نہیں — نگاہ محرمِ ام الکتاب پیدا کر
یہ اختلاف شب و روز یہ بہار و خزاں — تغیرات کے پردے میں ہے کوئی موجود

زبان شوق پہ توحید کا اقرار ہو پیہم / تو باطل کے مقابل جرأت انکار لیکر آ

درماندگی سے معرکے سر ہوں محال ہے / میدان زندگی میں عزیمت کی بات کر

تم اپنی ذات کا غم کرچکے بہت فطرت / اب اپنے دل میں غم کائنات لے کے اٹھو

اسرار زندگی کا مجھے کب شعور تھا / عقدہ کھلا ہے زیست کا معراج بلا کے بعد



جاں کاہ ہے خیبر و [illegible] / سو معرکے ہیں معرکۂ کربلا کے بعد

فطرت ہمیشہ اپنا تو یہ تجربہ رہا / راحت ملی ہے قلب کو ذکر و دعا کے بعد

اوروں کو نصیحت ہے اپنے کو فضیحت ہے / باہر تو اجالا ہے اور گھر میں اندھیرا ہے

آخر میں کچھ مشورے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پہلا مشورہ یہ ہے کہ اس مجموعے میں تعلّی کے جو اشعار ہیں وہ نہ ہوتے تو بہتر تھا۔ جو لوگ ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کے قائل ہوں ان کو تعلّی زیب نہیں دیتی۔ مثلاً

فطرت تمہاری ذات پہ کھٹکل کو نا ہے / فنکار باکمال ہو شاعر عجیب ہو

اس طرح کے متعدد اشعار اس مجموعہ میں ہیں۔ ایک جگہ ایک لفظ صحیح موزوں نہیں ہو سکا ہے

"رفتہ رفتہ بڑھ گئی ضبط فغاں کی اہمیت" (ص ۷۰)

صحیح لفظ اہمّیت ہے۔ میم کی تشدید کے ساتھ — ایک اور لفظ برمحل استعمال نہیں ہوا ہے

بے مایگی عشق مسلماں کی ہے سوغات / بے مایگی عشق سے عالم کی فتوحات (ص ۹)

بے مایگی کے معنی مفلسی کے ہیں۔ عشق بے مایہ بے دولت اور مفلس نہیں ہوتا۔ بلکہ خود بڑی دولت ہوتا ہے۔

جناب فطرت نے غلط قسم کے تصوف پر تنقید بھی کی ہے لیکن ایک جگہ خود اس میں مبتلا ہو گئے ہیں

آئینۂ خلوص ہو گرد ریا سے پاک / پھر عشق بے نیاز ثواب و عذاب ہے

پہلا مصرع تو ٹھیک ہے۔ دوسرا مصرع غلط تصوف کی نمایندگی ہے۔ مومن کسی طرح بے نیاز ثواب و عذاب نہیں ہوتا۔ اللہ کا عشق اور پھر ثواب و عذاب سے بے نیازی خالص غیر اسلامی تصور ہے۔

بحیثیت مجموعی "ساز دل" پڑھنے کے لائق ہے۔

MONTHLY
ZINDAGI

R.N.I./2188/57
MRD. 66
FEB. 1984

مرت ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا